شمارہ

۷۵ ـــــ ۷۶

خاص نمبر

اپریل / جولائی ۱۹۸۲

قیمت: پچیس روپے

شائع کردہ:- پاکستان کلچرل سوسائٹی۔ کراچی

ترتیب

افسانے

مضامین

کہہ مکرنیاں

دوہے

انشائیہ

اُردو گیت ـ ایک مطالعہ ۱۵۹

نظمیں

نظمیں

جدید جرمن نظمیں : ۱۹۱۱ تا ۱۹۷۴ء ترجمہ مقبول الٰہی ۲۳۳

جدید جرمن نظمیں ترجمہ مقبول الٰہی

غزلیں

غزلیں

غزلیں

تبصرے

اِدَاریہ

ایک گستاخانہ سوال

آج سے کم و بیش چالیس برس قبل جب ادبی ملفوظات اور غیر ادبی مُتعلّقات میں فاصلہ کم ہونا شروع ہوا تو مرحوم و مغفور "ساقی" دہلی میں ایک قطعہ شائع ہوا :

ادیبوں کی بہو بیٹی نہیں کیا　　چھپر کھٹ پر کبھی لیٹی نہیں کیا

ادیب اور بے ادب استغفراللہ　　ہماری قسمتیں ہیٹی نہیں کیا

اس زمانے میں یہ قطعہ اکثر قارئین کی نظر سے گزرا ہوگا اور اکثر سے مراد ایک دو نہیں بلکہ کئی ہزار ہے کہ "ساقی" کے خریداروں کی تعداد سے قطع نظر اس کے پڑھنے والوں کی تعداد بلا مبالغہ کئی ہزار تھی۔ پھر بھی اس قطعہ یا اس میں جس خدشہ کی نشاندہی کی گئی تھی اس کی بازگشت اُس زمانہ میں یا اس کے بعد کی گزشتہ تین چار دہائیوں میں سننے میں نہیں آئی۔ ہاں کبھی کبھی کسی مولوی یا خود ساختہ محتسب کے احتجاج یا اخباری بیان کے حوالے سے ادب میں بڑھتی ہوئی عریانی کی خبر مل جاتی تھی۔ اسی اثنا میں ادیب کی بہو بیٹیوں کا جو حال ہوا وہ سب کے سامنے ہے اور معاشرے کی قسمت جس طرح پلٹی یا بگڑی وہ بھی کسی سے ڈھکی چھپی نہیں۔ "ساقی" کو ختم ہوئے اتنا عرصہ گزر چکا ہے کہ ان ادیبوں یا قارئین سے، جو قیام پاکستان کے بعد کی پیداوار ہیں اور اب ماشاء اللہ پینتیس چالیس کے پیٹے میں ہیں اور خود بال بچہ دار ہیں، یہ توقع کہ وہ "ساقی" سے واقف یعنی صحیح طور پہ آشنا ہوں گے، عبث ہے۔ یوں بھی "نشئے بندی" کے بعد سے اس طرح کی توقعات بے معنی سی ہیں۔ پھر بھی آج کے ادب، ادیب اور معاشرے کی جو اُٹھان ہے اس کے پیش نظر ایک بہت اہم سوال بار بار ذہن پر اُبھرتا ہے اور باوجود کوشش کے اس کا تشفی بخش جواب نہیں مل پاتا، وہ یہ ہے :

کیا ہمارے معاشرے کے اپنے قطعی اور فعال معیار ہیں؟ اگر ہیں تو کیا ہیں ؟

یہ سوال خصوصاً اس وجہ سے اہم ہے کہ پینتیس سال کی قومی منصوبہ بندی، اپنے قومی تشخص اور مملکت کی نظریاتی بنیادوں اور سرحدوں کے بارے میں بے تکان لفّاظی کے بعد کم از کم اتنا تو ضرور ہونا چاہیئے تھا کہ زندہ رہنے اور کارکردگی اور ہنرمندی کو پرکھنے کے ہمارے اپنے معیار اب تک

وضع ہو جانا چاہئیں تھے۔ کچھ پیمانوں کا تعین ہو جانا چاہئے تھا تاکہ یہ ممکن ہو جاتا کہ ہم زشت و خوب کی صحیح تمیز آپس میں دست و گریباں ہوئے بغیر اور ایک دوسرے پر لعن طعن کئے بغیر کر سکتے۔

مثلاً زبان کے مسئلے کو ہی لیجئے۔ یہ مسئلہ قیام پاکستان سے قبل محض ہندی اور اردو والوں کے درمیان متنازعہ تھا۔ قیام پاکستان کے بعد یہ مسئلہ پاکستان کے صوبوں اور علاقوں کے درمیان متنازعہ ہوا اور اس کے جو کچھ نتائج شکست و ریخت کی شکل میں ظہور پذیر ہوئے وہ ہمارے سامنے ہیں۔ اس مسئلے کی کیا حیثیت تھی؟ کیا ہونی چاہیئے تھی؟ اور کیا ہونی چاہیئے؟ اس کا تعین اس لئے ممکن نہ ہو سکا اور آئندہ بھی ممکن نہ ہو سکے گا کہ اس تعین کے لئے معلّموں، سیاست دانوں، سرکاری افسروں، مُفکّروں اور دانشوروں کو فکر اور اس کے اظہار کے جس معیار کی ضرورت ہے، اس کا فقدان ہے۔ فقدان ہی نہیں بلکہ اس "معیار" کا کوئی تصور ہی سرے سے موجود نہیں ہے۔

پاکستان کے مخصوص معاشرتی حالات میں اس بات سے کس طرح انکار کیا جا سکتا ہے کہ یہاں ہر سو آدمیوں میں کم از کم چوراسی آدمی لکھ پڑھ نہیں سکتے۔ ان کو معاشرے کی طرف "اقراء" کا حکم کب ملے گا اور اس حکم کی بجا آوری کے لیے جو انتظامات درکار ہیں کب کئے جائیں گے، یہ ایک الگ بات ہے۔ فی الحال ہمارا تعلق اس حقیقت سے ہے کہ زبان کا مسئلہ کاروباری، سرکاری، فکری اور عملی سطح پر ملک کی صرف سولہ فی صدی آبادی یا اس سے بھی کم کے لئے کوئی معنی رکھتا ہے۔ باقی آبادی بے زبان ہے اور حرف و عطف سے ناآشنا ہے۔ زباندانی اور بے زبانی کے اس معاشرتی تناسب میں ظاہر ہے کہ زبان کے مسئلے پر کسی زجر و توبیخ، طعن و تشنیع، کھچاؤ اور تصادم، دنگا فساد کا اِس معاشرتی تناسب میں کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہونا چاہیئے اور وہ اس لئے کہ اس مسئلے سے جو طبقہ متعلق ہے وہ ملک کا خود آگاہ، نسبتاً آسودہ حال اور مقابلتاً زیادہ متین طبقہ کہا جا سکتا ہے۔ ایسا طبقہ جو شور و شر سے احتراز کرتا ہے اور مسائل کا حل ٹھنڈے دل سے، پُرامن ماحول اور معقول انداز میں غور و فکر کے ذریعے تلاش کیا کرتا ہے۔ اب اگر اس اصول کو کلیّہ قرار دے دیا جائے تو پھر یہی کلیّہ ہمارے معاشرے میں اس اصول کے لئے معیار قرار دیا جا سکتا ہے کہ پاکستان میں تعلیم یافتہ طبقہ امن پسند اور سنجیدہ ہے اور مسائل کو مثبت انداز میں پرکھنے اور برتنے کا شعور رکھتا ہے اور کیونکہ "جاہل" اور تہذیبی طور پر پسماندہ طبقہ "ساری دنیا میں ہی انتشار کا شکار رہتا ہے اور جھگڑے فساد میں بہت آسانی سے مبتلا ہو جاتا ہے

اس لئے پاکستان میں بھی ان معاملات پر جن کا تعلق "پس ماندہ" طبقے سے ہے جھگڑے فسادات برپا ہوتے رہتے ہیں۔ البتہ ان باتوں پر جن کا تعلق اس طبقے سے نہیں ہے کسی قسم کی بدمزگی، بدامنی اور نامعقولیت کا سوال پیدا نہیں ہوتا۔

مگر حیران کن بات یہ ہے کہ حقیقت اس کے برعکس ہے۔ پچھلے پینتیس[۳۵] سال میں وہ تمام مسائل جن کا تعلق پس ماندہ اور جاہل سواد اعظم سے ہے مثلاً بھوک۔ افلاس۔ بے روزگاری۔ مہنگائی۔ ناانصافی۔ ظلم۔ زیادتی۔ جبر وغیرہ سب نہایت متحمل مزاجی کے ساتھ پاکستان میں برداشت کئے جاتے رہے ہیں اور یہاں تشدد کی بدترین مثالیں وہ رہی ہیں جن کا تعلق زبان سے یا ملازمتوں میں صوبائی اور علاقائی تناسب سے تھا۔ اس صورتِ حال کے پیش نظر یہ نتیجہ اخذ کرنا غلط نہ ہوگا کہ پاکستانی معاشرے میں "پس ماندگی" کے اخلاقی اور سماجی معیار "ترقی" کے اخلاقی اور سماجی معیار سے نسبتاً بہتر اور ارفع ہیں۔ اس حقیقت کا مظاہرہ وسیع پیمانے پر برپا ہونے والے انتشار کی صورت میں ہی نہیں ہوتا بلکہ ذہن بگڑنے کی ہیجانی اور جوشیلی کیفیت میں بھی روزمرہ کی زندگی میں یہی بات دیکھنے میں آتی ہے۔ وہ لوگ جو تعلیم یافتہ بھی ہیں، اعلیٰ سماجی اور معاشی حیثیت بھی جنہیں حاصل ہے اور جو ارباب اختیار بھی کہلاتے ہیں اس بات میں قطعی عار محسوس نہیں کرتے کہ ان کی گفتگو بالعموم کتنی ناشائستہ ہوتی ہے! نہ صرف بلحاظ اغلاط، لہجے کی کرختگی، تلفظ کے بھونڈے پن اور زبان و بیان کی بے ترتیبی اور ناہمواری کے بلکہ اس لئے بھی کہ اس میں گالی گلوچ اور ابتذال کی آمیزش بکثرت ہوتی ہے اور یہ بات کسی بھی سطح پر مذموم نہیں سمجھی جاتی۔ ہم یہاں انگریز معاشرے کی وکٹورین اقدار کی روشنی میں اس کیفیت کا جائزہ نہیں لے رہے ہیں۔ انگریز معاشرے میں تو بیٹلز (BEATLES) اور (ROLLING STONES) رولنگ اسٹونز سے آگے بڑھ کر اب پوری قوم (PUNKS) طائفہ کی غلاظت میں مبتلا ہو چکی ہے اور مگن ہے۔ ہم تو اس وقت خود اپنی ان اقدار اور رہن سہن کے طریقوں کی روشنی میں بات کر رہے ہیں جن کا اظہار نعروں، تقریروں اور تحریروں میں ہمارے یہاں ہمہ وقت جاری رہتا ہے اور جن کے مطابق رکھ رکھاؤ، احتیاط، لحاظ، حیا اور شائستگی کے کچھ مخصوص اور شناسا تقاضے ہیں۔ ان تقاضوں کے برعکس جب نجی محفلوں میں اور عوامی جلسوں میں ہمارے معاشرے کے سربرآوردہ شخصیات تک اپنی گفتگو اور تقریر میں رکیک اور انتہائی ننگی گالیاں تک شامل کرنے میں جھجک محسوس نہیں کرتے تو پھر اس پر غور کرنا

ضروری ہوجاتا ہے کہ ارفع اور ادنیٰ گفتگو، مجلسی اور بازاری زبان اور شستہ اور مبتذل بیان کے رائج الوقت معیار ہمارے یہاں کیا ہیں ؟؟

یہ سوال جب ہمارے ذہن پر ابھر رہا ہے تو ہمیں اس کے اظہار میں کسی قدر جھجک محسوس ہورہی ہے کیونکہ ہمیں اس کا پورا احساس ہے کہ اس قسم کے خدشات میں مبتلا ہونے یا اس طرح کے سوالات اٹھاتے ہی ہم پر رجعت پسندی کا الزام لگ سکتا ہے۔ کہا جاسکتا ہے کہ ہم عوامی اقدار کی مخالفت اور بورژوائی اقدار کی حمایت کر رہے ہیں۔ ہم سامراجی تحریکوں کی کاسہ لیسی چاہتے ہیں۔ ہم فرسودہ اور گرتی ہوئی طبقاتی عمارت کو قائم رکھنے کی مذموم حرکت کے مرتکب ہو رہے ہیں۔ ہم عوامی طرزِ معاشرت اور خواص کے طریقۂ زندگی میں بُعد قائم رکھنا چاہتے ہیں۔ ممکن یہ الزمات صحیح ہوں کیونکہ ہمیں معاشرے میں اپنے مراعات یافتہ ہونے کا اعتراف ہے تاہم اس حقیقت سے بھی انکار ممکن نہیں کہ اگر "عوام" کی طرزِ معاشرت اور رکھ رکھاؤ کا جائزہ لیا جائے تو "خواص" کے موجودہ عادات و اطوار کا ان سے دور کا بھی واسطہ نہیں اور اگر ہم ان عادات و اطوار کو عوام سے قربت کی تحریک اور ایک خوش آئند صورتِ حال قرار دیں تو خواص کو تو غالباً کوئی نقصان نہیں ہوگا، عوام پر البتہ ایک اور تہمت بھی لگ جائے گی کہ وہ جاہل، پس ماندہ اور بے حس ہونے کے ساتھ ساتھ زشت کلام، انتشار پسند اور بیہودہ گو بھی ہیں۔

مگر بات یہیں ختم نہیں ہوجاتی۔ عوام اور خواص کا طبقاتی فاصلہ پچھلے پچاس سال میں کم ہونے کی بجائے بڑھتا گیا ہے۔ ذہنی طور پر عوام اور خواص کا آپس کا تعلق جتنا اس وقت کم ہے اب سے چالیس پچاس سال پہلے اتنا کم نہ تھا۔ اس کا کچھ نہ کچھ تعلق ہمارے خیال میں ادیبوں کی ان نگارشات طرزِ فکر، اطوار اور اخلاق سے بھی ہے جو اس پورے دور میں شعبۂ ادب نے اس برصغیر میں پیش کیا ہے اور جسے نئے رجحانات۔ نئی فکر، نئے تجربات اور نئی اقدار کا نام دیا جاتا رہا ہے۔ خود اس رسالے کا نام "نیا دور" پچھلے پچاس برس کی ادبی تحریکوں اور امنگوں کی عکاسی کرتا رہا ہے۔ یہ دور نیا تو ضرور تھا اور اس میں جو تجربات اور تخلیقات پیش کی گئیں، وہ بھی اپنی نوع سے نئی تھیں لیکن پچاس برس کے اس طویل عرصے میں تعلیم یافتہ معاشرے کی آراستگی اور ذہنی و فکری نشوونما اس دور کی تحریکوں اور تجربوں نے جو کردار ادا کیا اس کے نتائج کو پرکھنے اور ان پر غور کرنے کا غالباً اب وقت آچکا ہے۔

کیونکہ اگر اس دور کی کاوشوں کو حقائق کی کسوٹی پر پرکھنے کے بعد انہیں معتبر اور مثمت قرار دیا جائے تو کیونکر اور رد کیا جائے تو کس طرح کہ اس فیصلے کے لئے ہمیں کسی نہ کسی رائج الوقت یا خاطر خواہ اور متعینہ معیار کو سامنے رکھنا ضروری ہوگا۔ اس قسم کے قطعی اور واضح معیار کی تلاش اور تعین ہی ہمارے خیال میں' آج ادب کا سب سے بڑا مسئلہ ہے اور یہ مسئلہ نظریاتی نعرہ بازی اور غرب زدگی کے ذریعے حل کرنا ممکن نہیں ہے کہ پچھلے پچاس برس میں یہی کچھ تو ہو رہا ہے۔ یہی مسئلہ' بصورت سوال' "آج تاریخ" کے صدر دروازے پر جلی حرفوں میں لکھا ہوا ہے۔

وہ جو چلے گئے

گذشتہ چند ماہ میں ہمارے کئی ایسے بڑے ادیب و شاعر ہم سے جدا ہو گئے جنھوں نے علم و ادب کی سطح پر انسانی معاشرے کی لطافتوں اور احساس جمال کو نکھارنے میں ایسی گراں قدر خدمات انجام دی تھیں کہ احسان فراموش معاشرہ بھی انھیں آسانی سے نہ بھلا سکے گا۔

فضل احمد کریم فضلی (پیدائش ۱۹۰۶ء) حرکتِ قلب بند ہو جانے سے ۱۷ دسمبر ۱۹۸۱ء کو بعمرہ ۷۵ سال کراچی میں انتقال کر گئے۔ مرحوم ایک بلند پایہ شاعر، منفرد ناول نگار اور ایک وضع دار' شریف النفس انسان تھے۔ شاعری کے دو مجموعے "نغمۂ زندگی" اور "چشمِ غزال" اور ایک ناول "خون جگر ہونے تک" مرحوم کی زندگی میں شائع ہو چکے تھے۔ ان کے کلام کا ایک حصہ اور ان کا دوسرا ناول "سحر ہونے تک" ابھی غیر مطبوعہ ہیں۔ ہمیں امید ہے کہ ان کے لائق بیٹے اور دوسرے افرادِ خاندان مرحوم کے کلام اور ناول کی اشاعت کی طرف فوراً توجہ دیں گے۔ ادارہ نیا دور دعا کرتا ہے کہ اللہ تعالیٰ مرحوم کی مغفرت فرمائے اور فردوسِ بریں میں درجاتِ بلند عطا فرمائے۔ آمین۔

ابھی یہ زخم تازہ تھا کہ خبر آئی محمد ہادی حسین ۸ جنوری ۱۹۸۲ء کو ۷۵ سال کی عمر میں حرکتِ قلب بند ہو جانے سے کراچی میں وفات پا گئے۔ فضلی صاحب کی طرح ہادی حسین صاحب بھی انڈین سول سروس کے رکن تھے اور ریٹائرمنٹ کے بعد ہمہ تن علم و ادب کی خدمت میں مصروف تھے۔ گذشتہ پندرہ سال کے عرصے میں ہادی حسین صاحب کی اُردو اور انگریزی میں کئی کتابیں شائع ہوئیں۔ مرحوم کو انگریزی اور اردو پر یکساں قدرت حاصل تھی اور فارسی' فرانسیسی و جرمن زبانوں سے بھی خوب واقف تھے۔ مرحوم ایک اعلیٰ درجے کے مترجم بھی تھے۔ انہوں نے اقبال کی بہت سی نظموں کے جہاں انگریزی میں

(بقیہ صفحہ ۳۰۹ پر ملاحظہ فرمائیے)

فضل احمد کریم فضلی مرحوم اور ڈاکٹر جمیل جالبی
کراچی ۱۹۶۶ء

دائیں سے بائیں:- ڈاکٹر عبادت بریلوی، ڈاکٹر معز الدین، جناب امتیاز علی خاں عرشی مرحوم، ڈاکٹر جمیل جالبی - دہلی نومبر ۱۹۷۷ء
(بشکریہ ڈاکٹر وحید قریشی)

شادی آباد مانڈو کی وہ جھیل جہاں نربدا دیوی کی بشارت کے مطابق روپ متی کی باز بہادر سے ملاقات ہوئی تھی۔ (تصویر بہ شکریہ سراج احمد علوی)

دیکھئے مضمون اور گیت صفحہ ۱۹۲ تا ۱۹۶
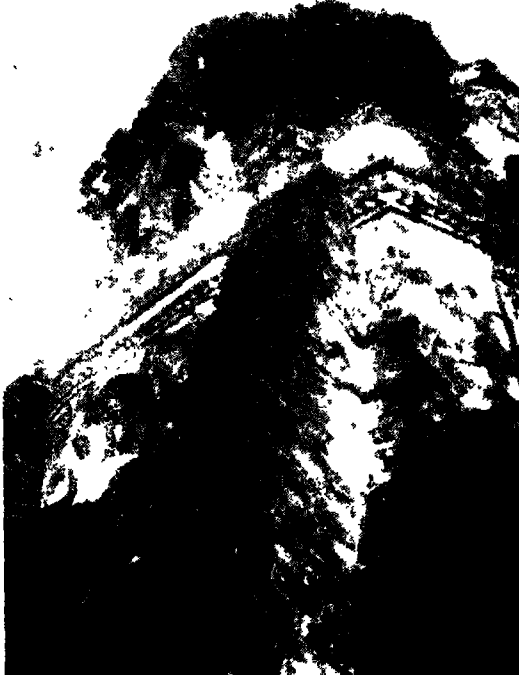
باز بہادر کے محل کا شکستہ بُرج اور فصیل (تصویر بہ شکریہ سراج احمد علوی)

دیکھئے روپ متی اور باز بہادر ص ۱۹۲

عزیز حامد مدنی

۶ نظمیں

○ درِ ممکنات

سوغات

But an autobiography can only survive in ashes, persistence in extinction ——MONTALE

(۱) تعارف

(۲) قُرب کی ایک شام

(۳) بدگمانی

(۴) حُسن اور شبِ ہجراں

(۵) حدِ عصیاں

عزیز حامد مدنی

درِ ممکنات

غروب ہو گئی دل میں وفا کی رات تو کیا
ملیں گے اور زمانے طلوع ہوتے ہوئے
ہزار عصمت و عصیاں کی چشمکیں لے کر
کسی نظر سے فسانے شروع ہوتے ہوئے

شبِ جنوں میں کئی چاک دل ملے ہوں گے
لباسِ تازہ غمِ عشق کو ملے ہوں گے
لہو میں پھول سے خوابوں کے کچھ کھلے ہوں گے

ابھی تو دار و رسن کی ہوائے جبر میں بھی
حریفِ تازہ نفس بے سپر چلے ہوں گے
ہزار بار ابھی جرمِ آگہی کے لئے
صلیب و زہر کے بے نام سلسلے ہوں گے

رُخِ حیات پہ دُنیا لہو مَلے گی ابھی
دبی ہوئی جو نہیں آگ ہے جلے گی ابھی
کسی کے خنجرِ سفّاک سے چلے گی ابھی
ستم کے قافلۂ بے درا کی رات آخر

ابھی کھلے گا۔ درِ ممکنات۔ وقت کا ہاتھ
نقاب اٹھائے گا۔ اشیا کی نیم خوابی سے
دھوئیں میں تھا جو غنودہ وہ سِرّ ارض و سما
کسی اشارے سے پائے گا نو طرازِ قبا
فقط نمود کی لذت ہے اضطرابِ بقا
ہزار شیوہ ہے عالم۔ اس آئینہ کو ابھی
ملے گا عکس نیا۔ چہرۂ کتابی سے

سکوتِ حجلۂ رمزِ جہاں۔ یہ کہتا ہے
ہزار سال ابھی ساعتِ وصال میں ہیں
عروسِ نو ہے فقط آشنائے بوسۂ لب
مثالِ طائرِ پر بستہ خود سے ذوقِ طلب
رقیبِ بے سببی ہے کوئی ثباتِ سبب
ابھی وصال میں۔ انکار کی ہے عشوہ گری
ابھی جواب کے گوشے کئی خیال میں ہیں

ابھی تو جادۂ دریافت کی ہواؤں میں
تپش بڑھے گی۔ غمِ جستجو کی کوئی لکیر
مثالِ زخم ٹپکتی رہے گی خوابوں میں

نگاہِ تیز سے اُلجھے ہوئے حجابوں میں
ڈھلے گا اِک غمِ فردائے حسابوں میں
ابھی یہ شک ہے کہ اِنساں کو راس آئے گی
یہ خاکداں کی اسیری۔ ازل سے یہ تقدیر

طلسمِ خانۂ عالم میں فرد فرد اشیاء
جنوں نوازِ خط و خال کی تلاش میں ہیں
گراں ہوئی ہے۔ غمِ آگہی کی تنہائی
سرشتِ نوحہ کنانِ زمیں ہے سودائی
ہنوز۔ دیدۂ بینا۔ ہے اک تماشائی
نظر لئے ہے کسی جادۂ قیاس کا موڑ
ہزار کوس کی منزل ہے ایک یاس کا موڑ

شعاعِ مہر کی رفتار سے کے موجِ خیال
کسی لباسِ تغیّر میں جلوہ گر ہوگی
ابھی سے کیا قدِ بالائے آدمی کا شمار
ہزار صدیوں میں آئی ہے ساعتِ بیدار
کسی نگاہ کی طالب مثالِ روئے نگار

خوشا کہ دیدۂ آیندگاں کو اے غمِ دل
طلوعِ جلوۂ تازہ رُخانِ برسرِ بام
لبوں کی نیم رسی لرزشوں میں ڈھلتی ہوئی
ہزار منزلِ بوس و کنار تک آئے
شبِ وفا جو غمِ انتظار میں گزری
اک اور مرحلۂ قربِ یار تک آئے

عزیزہ حامدی

تعارف

دامنِ شہر میں تھی چاند کی قندیل کہن
دور میداں میں قناتیں تھیں کہ اک ناگ پھنی
رقصِ بسمل سا ہوا کرتا تھا بیتابی میں
آئینہ گاہِ محبت میں تھا پرتو جس کا
موجِ خوں دل سے اٹھی صورتِ آئینۂ جاں

رات کے نم سے حریری تھا ہوا کا دامن
سائے خیموں پہ لرزتے تھے اٹھائے ہوئے پھن
نیم شب تھی کہ رکا آکے کوئی برقع فگن
اس کی تقدیر تھی بجھتی ہوئی شمعوں کا لگن
مانگنے عرض چلا جوہرِ خوبی سے پھبن

اس کا چہرہ تھا کہ نیزے پہ تھی ہیرے کی انی
زلف میں ابرِ سیہ پشت میں اک برق کی رو
کیمیا گر کے طلسموں کی جلائی ہوئی آگ
نسلِ خوباں قدِ بالا میں سناں کھینچے ہوئے
کاٹ کرتی ہوئی آپس میں سنہری قوسیں
مُہرِ زنگی تھی کہ سینہ کے خزانوں پہ کوئی
ناف کی رو میں گرہ خوردہ تھی موجِ دریا
خوں بہا مستیِ پنہاں کی تھی خوشبو اس کی

اک خطِ دید پہ ٹھہری تھی ابد ساز کرن
قد و گیسو میں زمانے کے لئے دار و رسن
جسم کے شعلۂ عریاں میں نکھرتا کندن
روم و یونان کے لشکر ہوں محافظ وہ بدن
مرمریں شانوں پہ الٹے ہوئے پیالوں کا بانکپن
مارِ دم بستہ کبوتر کی لئے تھا گردن
شکمِ صاف تھا طوفانِ بلا کا دامن
دشت میں دام گزیدہ تھا اک آہوئے ختن

میں نے پوچھا کہ ترا رم جو ہے زنجیر بپا
کیوں اندھیرے کی اس آسیب زدہ قید میں ہے
سن کے اس نے یہ کہا رہروِ خواب آلودہ
کون ہوں میں یہ مرے حسن کا پرتو کیا ہے

گردشِ وقت کی شورش ہے کہ خوفِ رہزن
جرم کیا تجھ سے ہوا مشعلۂ طاقِ زمن
اس گذرگاہ میں ملتا ہے کسے اذنِ سخن
کارِ تخلیق میں اک بے خبری کا ہے گہن

کوزہ گر چاک کی گردش سے یہی کہتا ہے
ٹوٹ جائے جو کوئی ظرف تو آتی ہے صدا
زندگانی کے درِ بازِ بیاباں میں کوئی
جادۂ پیمائے بیابانِ وفا۔ میں بھی ہوں

نقشِ نو کی تری گردش ہے فقط پیراہن
گلِ کوزہ کی خرابی تھی کہ رکھتی تھی شکن
نہ کوئی چشمۂ حیواں نہ کوئی نہرِ لبن
زندگی میرے لئے خود ہے سوالات کا بَن

قرب کی ایک شام

دامنِ جاں سے لپٹتا ہے غبارِ سرِ شام
استخوانوں سے لپٹتی ہوئی اک درد کی رَو
ساعتیں ہیں کہ کسی آتشِ سوزاں کا ہے نشتر
نفسِ تازہ کہ ہے کوئے وفا میں گرداں
مدتیں ہوگئیں ویرانیِ طاقِ جاں کو

ترک کر آئینۂ خود نگری۔ قالبِ خام
ڈھونڈتی ہے کسی ناسور کی نادیدہ نیام
اس سے بڑھ کر ہے کہاں جرمِ محبت کا انعام
کیا ہوا حسن سے کہتا ہے ترا اذنِ خرام
کیوں ہوئی تیری ضیا پوش قبا دودِ تمام

سن کے اس نے یہ کہا۔ وقت کی تقدیر ہے یہ
میں نے جب گھر سے نکالا تھا قدم پہلے پہل
گوئے نوخیز تھی چوگانِ بقا میں مصروف
عہدِ گل پوشی و دستورِ حنابندی سے
محرمانہ بھی نگاہوں کے کئی دائرے تھے
ساربان مجرمِ گم کردگیِ ناقہ ہوئے
بیج پلتا ہوا اگر خوف کی تاریکی میں

یہ سیہ پوشی فقط حسن کا کب ہے انجام
رات کے خواب تھے نوعمر تھا میں نیلام
موجِ انفاس کا تھا اوجِ ثریا پہ مقام
موجِ خوں کا تھا بپا گوشِ وفا میں کہرام
ورنہ بے مہریِ دوراں کو کیا کس نے رام
شہر سے سارق و قزّاق کا اٹھتا تھا قوام
ریزہ ریزہ ہے سرِ شاخ ہی مغزِ بادام

میں نے اس ماہ رُخِ صُلح چشیدہ سے کہا
دل زدہ ہو کے مرے شوق کی بیتابی سے

کیا تجھے یاد نہیں مرگ محبت کی وہ شام
جرم کی فرد پہ جب تو نے لکھا تھا مرا نام

بجھ رہی تھی شفقِ شام کہ تو نے مجھ کو — رمز در رمز غمِ جاں کے سنائے تھے پیام
یوں سرِ راہ گذر میں نے پکارا تھا تجھے — ٹھہر لے آہوئے وحشی میں بگولا ہوں نہ دام
ہمرہی میری فقط پردۂ غم کی ہے گواہ — شرفِ ذات کی طالب ہے تری بوئے مشام
ہم اکیلے بھی نہ تھے شاہدِ عینی تھا کوئی — شک نے اس بات کو بھی جبر سمجھا اقدام

نیند سی غم کی جو آئی تو جواب اس نے دیا — روحِ عصمت ہے وہی مجھ میں جو تھی آئینہ فام
اب ہنسی آتی ہے آئینۂ دل پر مجھ کو — اس کے چٹخے ہوئے شیشہ پہ رہی گرد مدام
ایک تجدیدِ ملاقات کا منکر ہو کر — میں نے کی نانِ حلال، عشق کی ہمت پہ حرام
وقت کے دشنۂ پنہاں نے جگر چاک کیا — زخم میں سوختہ ریشم نے کیا ہے ابرام

شک کا خنجر بھی ترا سوزِ یقیں بھی تیرا — تیری تخلیق کے رخ دیکھ لئے ربِّ انام
شرفِ ذات میں غلطیدہ ہے روحِ عصیاں — روحِ عصمت کو ملا روزِ ازل ہجرِ دوام
دستِ نادیدہ میں رومال تھی جو موجِ ہوا — دے گئی دور سے کچھ دل کے سفینہ کو پیام
میرے دروازۂ دل پر ہے کھڑی شمع بکف — نیم رخ ہو کے پشیمانِ جفا۔ قرب کی شام

بدگمانی

آگہی جسم کی رکھتی ہے اک ایسی نسبت — تھا اسے حسن کا احساس۔ سزائے فطرت
کب سے تھا اک ہدفِ آب و ہوا پیکرِ ناز — کشتہ شمعوں کا دھواں طوقِ گلو کی صورت
گرد آشفتہ خیالوں کی تھی بوجھل دل پر — نیند پر سایہ فگن کب سے تھا ابرِ وحشت
ایک آتش زدہ مفلوج پرندے کی طرح — بدگمانی سے تھی کچھ اس کی زباں میں لکنت
دل کے گوشہ میں تھی خود ناگ پھنی کے مانند — کسی بے نام سی تحقیر سے اگتی نفرت
پھینک دے گوہرِ یک دانہ کو وحشی کوئی — سخت دلدل میں یہ تھی ننگِ وفا کی قسمت
زندگانی تھی کہ گرتی ہوئی دیوار۔ کوئی — روشنی سکۂ مقلوب۔ تھی حاصلِ ظلمت

میں نے پوچھا کہ ترے عکس کے آئینوں میں — پا چکی ذوقِ جنوں کتنے دِلوں کی حدّت
تیری آنکھوں میں لرزتے ہیں کچھ ایسے سائے — جو زباں پا کے بنیں۔ رمزِ چراغِ خلوت
کچھ بتا مُہر بہ لب کیوں ہے تو اے پیکرِ حسن — کچھ تو ہے شیشۂ ناموس کی آخر قیمت

سُن کے یہ اس نے کہا مہر و وفا کے قصّے — تابِ گویائی جو ہوتی تو میں کرتی جرأت
عہدِ یک مسندِ "عشرت گہِ خسرو" ہونا — رات کی رت ہے اک حدِ سرابِ الفت
یوں تو کھونا بھی ہے اک خرمنِ حاصل لیکن — اپنے حاصل سے سکوں کی نہیں مجھ میں قدرت
دور کی بات نہیں میرے رُخِ تازہ نے — آپ ہی پائی تھی اک کشتِ ابد کی مدّت
آبِ اندامِ جوانی تھی کہ زیرِ چادر — خود مجھ سے طلب کرنا تھا فردِ حرمت
جیسے آہوئے رمیدہ کو ہو صیاد کا خوف — جسمِ خود بیں میں تھی یوں ایک تماشا عصمت

ناگہاں راہ میں رُخ۔ آ کے ہوا نے بدلا — زندگی ہو گئی ایک خوابِ جنوں کی صورت
شمعِ خلوت بھی ہوئی میرے لئے۔ آخر کار — مشعلِ قافلۂ دردِ یہ دورِ ہجرت
میں ہوں تشکیک کے سایوں میں گرفتار ابتک — ہجر میں غم، نہ رہی وصل میں کوئی نُدرت
کس سے کہیئے کہ ہوئی خاک بسر میرے لئے — بانکپن میں جو حریفانہ تھی میری سطوت
ہر تغیّر کی بساط رکھتی ہے اپنا افسوں — دل اگر دے بھی کسی چال کی مجھ کو مہلت
میں کہ محور بھی ہوں اور گردشِ پرکار بھی ہوں — ایسے حلقوں سے نکلنے کی کہاں ہے ہمّت
خود مرے حُسن کی اس آتشِ پندار میں کاش — مجھ کو مل جائے کوئی حُسنِ عمل کی ساعت

حُسن اور شبِ ہجراں

شمعِ رُخِ حُسن سے کرتی تھی شبِ ہجر سوال — کیوں مرے نام کی تقدیر ہے یہ قرعۂ فال
کس لئے میری رقیبانہ ہوا کی زد میں — اک جگر چاک کی ہے عشّاقِ جہاں کا احوال
جا چکے ہیں ترے فتراک کے نخچیروں میں — تیر سب میری کمانوں سے یہ کیسا ہے کمال

کس مروّت سے ٹپکتا ہے تری آنکھ کا زہر   جس کی اک بوند سے جل اُٹھتے ہیں سر سبز نہال
تیریِ بے مہری کا دامن ہے سمومِ صحرا   تیریِ سفّاکی سے ہے روحِ زماں بے اشکال
فرق ہے تیشۂ فرہاد و لباسِ مجنوں   شہر ویراں کئے تو نے تو گلستاں پامال
آبِ خنجر بھی ترے مکر سے اک سلکِ گہر   زہر بھی شہد ہے حیلہ ہے ترا وہ سیّال
آرزو تیری قبا۔ تیرا گلوبند فریب   معصیت ہے تیرے آئینہ کو زنگار مثال
کیوں تری آگ کی لو نرم ہوئی ماند پڑی   جب کبھی لعل و جواہر نے کیا استقبال

سُن کے یہ حُسن نے اک آہ سی کی اور کہا   کیا تجھے ہے شبِ ہجراں میرے ہونے پہ ملال
یہ نمِ گل میرا زیور مری سوغات ہوا   تحفۂ مادرِ گیتی ہیں یہ میرے خد و خال
اس نمِ گل سے مرا بطن ہے اک جائے پناہ   خانہ زادوں کی بنا۔ رسمِ جہاں کا احوال
دستِ قدرت نے ضدیں مجھ میں بہم کیں کیا کیا   خیر مانندِ دعا، فطرتِ شر مکر کا جال
لغزشِ پا سے فقط ربط کی زنجیر مجھے   روک لیتی ہے یہ اک عجز میرا کہ زوال
صفتِ آب بھی رکھتا ہے مرا جسم حسیں   پیچ و تاب اس کا مقدر ہے نشاط ہو کہ ملال
یہ لگن ہے کہ اسی آب سے پیالہ بھر جائے   زندگی کو بھی کوئی شکل کروں میں ارسال
ایک چشمہ سا اُبلتا ہے مرے سینہ میں   "آبِ گم" اس کو سمجھ لو کہ رسائی ہے محال
اس کی طاقت سے مرے ذہن کے بجلی گھر میں   کچھ طلسمات کی سی روشنیاں ہیں تمثال
ابدی آگ سی فطرت میں مری روشن ہے   ماہ و انجم کی حریف آج بھی ہے میری سفال
قربِ عشّاق سے بڑھ کر مجھے اس کی ہے لگن   اس کے سینہ میں رہوں آتشِ سوزاں کی مثال
اُستخوانوں میں چلے مغز دھواں دل سے اُٹھے   روحِ عصمت کا وہ پردہ ہو کہ عصیاں کا جلال

حدِ عصیاں

اے بہ رُخ شعلۂ مینا و بہ قد سرو سہی   آئینہ تیرا سنبھالے ہے مری بے نگہی
دشتِ دل میں بھی ذرا آہوئے آسودہ خرام   ایک دو دن کے لئے فرصتِ آماجگہی

سن کے اس نے یہ کہا مجھ کو بھی ہے ربط کا شوق
میں اترتی ہوں کسی دل میں تو مانندِ وحی

لعبتِ خاک سہی روحِ محبت میں ہوں
اور سینہ ہے ترا صدرِ کشادہ سے تہی

خاک چمکے گی سکونت سے مری شبِ تیرہ
ہاں مگر ربط کے خنجر کا کوئی زخم سہی

جزر و مد میرے بدن کا ہے بہنگامِ وصال
سلک تنظیم میں ہے بیتابیِ ماہی و مہی

اک مہم عصمت و عصیاں کی ہے آئینِ وجود
گفتگو آئی مگر کوششِ محبت میں رہی

ماند پڑنے لگی جب شمع کی لو، میں نے کہا
کیا سرِ شام ہی اس شمع کی تقدیر گئی

آپ ہی آپ کئی سے شکر کے پہلو نکلے
نہ دیے رخ کے جو بدلے تو ہوا تیر بہی

کچھ مروت کی جو سوجھی تو مثال ایسی تھی
یا برہنہ ہو۔ گذرگاہِ غلاماں میں شہی

ہاتھ سینہ پہ رکھا دل کی جو دھڑکن دیکھی
ایک آفت زدۂ مسئلۂ امر و نہی

ہنس کے فرمایا کہ تو محرمِ اسرار نہیں
ورنہ عصیاں کی حدوں میں ہے تری بے گنہی

خلیق ابراہیم خلیق

ایک نظم

میں اک زندِ آزاد و وارفتہ سر
حوادث کے قدموں کا روندا ہوا
شکارِ نگارانِ فرخندہ رو
سخن ہائے بے تہ سے اوبا ہوا
خود اپنے سے بھی ایسی برگشتگی
زمان و مکاں کے اُلٹ پھیر میں
اُلٹتے پلٹتے رہے دم بہ دم
زماں کا مکاں سے ہے کیا رابطہ
یہ نزدیک و دور اور یہ دور و دیر
تغیّر یہ ہر لمحہ ہر چیز کا
یہ نقطہ، لکیر اور یہ دائرہ
حیات اضطراری ہے اک کیفیت
زقندیں یہ بھرتی ہوئی ارتقا
یہ چکّر ہے محدود و لا انتہا
مہیب اور بے تھاہ یہ کائنات
یہ ذات و صفات اور یہ خیر و شر
ہے ہر بات اضافی تو مطلق ہے کیا
شعور اور وجدان و دانش ہے کیا
وہ کیا بات ہے ماورائے سخن

جوانانِ خود کام کا راہبر
زمانے کی چکّی میں پیسا ہوا
نباہے ہوئے وضعداری کی خو
خود اپنے خیالوں میں ڈوبا ہوا
ہو جیسے فریبِ نظر زندگی
وجود و عدم کے گھن گھیر میں
مری طبعِ درّاک کے پیچ و خم
ازل اور ابد میں ہے کیا سلسلہ
نمود و وجود اور یہ ہیر پھیر
یہ کون و مکاں کا عجب ماجرا
ہے کیا ان کی تفہیم کا زاویہ
کہ ہے اس کی کچھ اور ہی نوعیت
کہیں اس کی ہے کیا کوئی انتہا
کہ سیدھا ہے تخلیق کا راستا
ہے کیا اس میں انسان کی واردات
یہ سب کیا ہیں، کیا ہے خبر اور نظر
یہ ناحق ہے کیا اور برحق ہے کیا
خیالات کی یہ تراوش ہے کیا
ورائے حواس اور کیا ہے ظن

یہ نفسِ جہاں ساز کی گتھیاں
یہ پیچیدہ بے تھاہ گہرائیاں

یہ کیا ہے کہ بے بال و پر آدمی
فرشتہ بھی ہے اور شیطان بھی

براہیم بھی اور نمرود بھی
وہ شبیر بھی، شمرِ مردود بھی

شہیدِ صداقت، وفاجو بھی وہ
علمدارِ باطل، جفاجو بھی وہ

ستمکش کوئی اُس سے بڑھ کر نہیں
کوئی اُس سے بڑھ کر ستمگر نہیں

وہ ہٹلر بھی ہے اور چنگیز بھی
وہ رومی بھی ہے شمس تبریز بھی

ہلاکت کی تیغ و سپر آدمی
مسیحا نفس بھی مگر آدمی

وہ معصوم بھی ہے طرحدار بھی
فریبی بھی ہے اور سیہ کار بھی

وہ پرویز بھی اور فرہاد بھی
وہ مروان بھی اور مقداد بھی

وہ دارا بھی ہے اور مزدک بھی ہے
تظلّم سے نمٹے وہ ناوک بھی ہے

غلامی کا خامادہ خوگر بھی ہے
مگر حریت کا پیمبر بھی ہے

وہ غاصب بھی ہے اور عادل بھی ہے
بغاوت کے کس بل کا حامل بھی ہے

سخن سنج و عاقل بھی ہے آدمی
غبی اور جاہل بھی ہے آدمی

وہ غافل بھی ہے اور ہشیار بھی
تعصب سے اندھا، روادار بھی

مروّت کا ہو اُس میں کچھ شائبہ
تو پھر دیدنی اُس کا ہے حوصلہ

تلوّن میں پارے سے بڑھ کر بھی ہے
مگر استقامت کا پیکر بھی ہے

وہ زہرِ ہلاہل بھی، اکسیر بھی
صوابِ مکمل بھی، تقصیر بھی

ظلوماً جہولا کی تفسیر بھی
وہی علم و عرفاں کی تنویر بھی

وہ سقراط بھی اور حلاج بھی
وہ وجدان و دانش کی معراج بھی

جراثیم کے آگے بے بس بھی ہے
مگر فیلِ ہستی کا انکس بھی ہے

جسے ایک پتھر سے پہنچے گزند
ستاروں پہ وہ ڈالتا ہے کمند

وہ سفاک فطرت سے مجبور بھی
ہے تسخیرِ فطرت پہ مامور بھی

ہے آج آدمی اُس جگہ پر جہاں
بلندی کی پڑتی ہیں پرچھائیاں

نوامیسِ فطرت کی تھامیں عناں — زہے علم و حکمت کی باریکیاں
یہ سب آدمی کے لئے نردباں — عطارد ہو، زہرہ ہو یا کہکشاں
بصیرت سے گر کام لے اس کی عقل — زمیں کے بھی ہنگامے ہو جائیں سہل
وسائل کی بہتات ہے اس قدر — کہ تقسیمِ دولت مناسب ہو گر
تو ہر شخص کو اس کا حصّہ ملے — جو اُس کی ضرورت ہو اُتنا ملے
کسی کو کسی شے کی بھی احتیاج — نہ ہو، گر ہوس کر رہی ہو نہ راج
مگر جو ترقّی کی رفتار ہے — ہوس اُتنی ہی برسرِ کار ہے
بصارت صحتمند ہے جس قدر — بصیرت اُسی درجہ بیمار تر
خبر خاصی مضبوط اور دور بیں — نظر ہے نقاہت سے گوشہ نشیں
ترقّی کا قرنوں کی یہ ماحصل — کہ اب سانس لینا بھی ہے جانگسل

جہاں دیکھو ہے آدمیت زبوں — جدھر جاؤ حیوانیت ہے فزوں
ہیں اِنسانیت کے بھی چرچے بہت — اگر کوئی اُس کو بھی ڈھونڈے بہت
ملے گی کہیں تو سسکتی ہوئی — تڑپتی ہوئی اور بلکتی ہوئی
نہیں ختم ہوتیں الم خیزیاں — یہ نفسِ دنی کی شرانگیزیاں
ہوس پیشگی کی سیہ کاریاں — زر اندوز لوگوں کی خونخواریاں
ہوس نے بنایا ہے زر کو خدا — پرستش کی جس کی نہیں انتہا
یہ تھوڑے سے لوگوں کی عیاشیاں — عظیم اکثریت کی محرومیاں

امیروں کی مکاریوں کا اسیر — یہ ننگوں کا، بھوکوں کا جمّ غفیر
جہالت کی گودوں کا پالا ہوا — توہّم پرستی میں ڈھالا ہوا
بڑھاتا ہے دُنیا کی دولت کو یہ — ترستا ہے ایک ایک راحت کو یہ
گوارا ہے سرمایہ داروں کو کب — کہ بدلیں کبھی اس کے بھی روز و شب

ہو آزاد اس کا بھی ذہن اور جسم
مقدر کا اس کے بھی ٹوٹے طلسم
صحتمند ہوں اس کے بھی جسم و جاں
فراغت کی حاصل ہو اس کو اماں
ہمیشہ سے ہے زرکشوں کی یہ چال
کہ محنت کشوں کو رکھیں پائمال
نشیبوں سے اُبھرے جو یہ بے دیار
تو اُترے گا گدی سے ہر نابکار
ہر اک شے پہ ہوگا انہیں اختیار
بڑھائیں گے یہ آدمی کا وقار
زر اندوزیوں کا تقاضہ ہے یہ
ہوس کاریوں کی تمنا ہے یہ
کہ سوئے ہوئے شیر سوتے رہیں
شکار اپنی غفلت سے ہوتے رہیں
کرے آدمی ، آدمی کا شکار
کبھی ختم بھی ہوگا یہ کاروبار

یہ رنگ اور نسل اور قوم و وطن
یہ بت جن کی پوجا کا اب ہے چلن
ہوس پیشگی کے بنائے ہوئے
سیہ کاریوں سے سجائے ہوئے
کہاں تک چڑھے ان کی بھینٹ آدمی
کبھی ختم ہوگی یہ غارت گری

یہ جنگ و جدل کی فراوانیاں
جرائم کی ہر سمت ارزانیاں
یہ ذہنوں پہ پہرے، یہ جسموں کا سوگ
بنی نوعِ آدم کا یہ راج روگ
جو آزاد پیدا ہوا وہ بشر
غلامی میں جکڑا ہے اب سربسر
کیا چاہیئے قدغنوں کا حساب
کبھی محتسب کا بھی ہو احتساب

اذیت رسانی کے آلات سے
ہلاکت فشاں اسلحہ جات سے
ملے گا کبھی آدمی کو مفر
مہذب کبھی ہوگی نوعِ بشر
یہ آلات، یہ اسلحے، دمدمے
عجائب گھروں میں یہ کب جائیں گے
ہے نیکی کا جاری ز دِل تا بہ قاف
جہادِ مسلسل بدی کے خلاف
مگر ہے بدی کامراں، شادماں
ہوس آدمیت پہ ہے حکمراں

مگر ہے بدی کامراں، شادماں — ہوس آدمیت پہ ہے حکمراں
بدی آدمی کا مقدر ہے کیا — بدی اُس کی فطرت کا جوہر ہے کیا
نہیں ٹوٹتا ظلم و شر کا فسوں — سنبھلتی نہیں شورشِ اندروں
جو ہر این و آں پہ ہے چھایا ہوا — ہے خود نفس کا اپنے مارا ہوا
نہ جانے ملے بھی اُسے وہ مقام — جو ہو خیرِ محض اور حسنِ دوام

نہیں نا اُمیدی بھی اتنی روا — کہ یہ بھی تو اُلٹا ہے دیکھا گیا
بہائم صفت، کنبہ ور آدمی — نہیں جس سے بڑھ کر درندہ کوئی
اگر نیکیوں پر اُتر آئے وہ — فرشتوں سے آگے نکل جائے وہ

غرض آدمی ہے کہ اک چیستان — عجب اُس کی ذلت، غضب اُس کی شان
جو غاروں میں رہتا تھا وہ آدمی — خلاؤں پہ کرتا ہے اب داوری
حدوں میں ہے گرچہ محصور وہ — مگر دیکھتا ہے بہت دُور وہ
ہے بے مائگی میں بھی، وہ مایہ دار — خزاں اُس کی ہے حاملِ برگ و بار
تماشا گرِ بزمِ ہستی بھی وہ — ہے صورت گرِ جذب و مستی بھی وہ
یہ سب کچھ ہے، لیکن یہ کیا پھیر ہے — یہ کیا پھیر ہے، کیسا اندھیر ہے
تضادوں سے اپنے نمٹتا نہیں — مکمل وہ انسان بنتا نہیں
بہ حدِ عقل و دانش خسارے میں ہے — رواں کیوں ہلاکت کے دھارے میں ہے

مہیب اور بے تھاہ یہ کائنات — بقا و فنا اور حیات و ممات
یہ ارض ایک موہوم نقطے سے کم — شعورِ آدمی کا مگر یم بہ یم
طلسمات سی ہے طلسمات یہ — حقیقت ہے یا ہے خرافات یہ
کبھی ٹوٹتا ہے جو کوئی طلسم — نیا اک اُبھرتا ہے بھاری طلسم

مہیب اور بے تھاہ یہ کائنات
اور انساں اِس میں بہ فیضِ حیات

فنا کے تھپیڑوں سے لڑتا ہُوا
قدم اُس کا ہر آن اُکھڑتا ہُوا

کِدھر جا رہا ہے، کہاں جائے گا
پتہ خُود کبھی اپنا بھی پائے گا

بَقا اُس کی قسمت میں ہے یا نہیں
وہ مبتا وہے، مید ہے یا کہیں

اُلجھتا رہا اِن سوالات میں
ہُوا غرق بحرِ خیالات میں

اُترتا گیا جتنا گہرائی میں
اُبھرتا رہا دَشتِ تنہائی میں

وہ تنہائی جس کی نہیں کوئی حد
جہاں خوف و حیرت کی ہے شدّ و مد

حقیقت سے غم کی ہُوا آشنا
کُھلا پھر بھی عُقدہ نہ کچھ زیست کا

غموں کی ہر اک سمت بوچھار سے
حواسوں کے بے طرح چھکّے چھٹے

خُود اپنے بھی غم، غم کے ماروں کے غم
یہی اک جہاں کیا، جہانوں کے غم

رہے سایہ افگن مری طبع پر
غموں کے تراشے ہُوئے بام و دَر

یہ سایے تھے کچھ ایسے دہشت نُما
یہ سایے تھے کچھ ایسے ہیبت فزا

یہ میرے لئے تھا بس اک راستا
رَواں جس پہ ہوتا ہے ہر سَر پھرا

کسی کوہ سے جا کے ٹکرا آئیں
اندھیروں کی دلدل میں دَھنس جائیں

مگر وہ مری زندگی کی اُمیں
وہ حمرا کہ ہے مژدۂ فرَودیں

بڑھی اور بڑھ کر سہارا دیا
کیا رَوشن اپنائیت کا دِیا

غموں کو مرے اپنا غم جان کر
محبت کے بخشے مجھے بال و پر

محبت کہ جوہر صداقت کا ہے
صداقت کہ منبع مسرّت کا ہے

محبت نہیں نہ یہ مُنفعِل
کسی کو یہ کرتی نہیں مُضمَحِل

جہاں ولولے اِس سے شاداب ہیں
وَہیں حوصلے اِس سے سیراب ہیں

محبت ہے گل رنگ اور نرم خو — کبھی شعلہ ساماں ہے اور گرم خو
صداقت پہ باطل کی یورش ہو جب — محبت کی پھر دیکھئے تاب و تب
کمر بستہ ہوتی ہے پیکار پہ — بپھرتی ہے باطل کے ہر وار پہ
جہاں دندناتے پھریں ظلم و جبر — کہا جائے مظلوم سے صبر، صبر
جہاں عدل و انصاف ہوں داد خواہ — غریبوں کے دل سے نکلتی ہو آہ
محبت بغاوت کو مہمیز ہے — اسی سے جہادِ بقا تیز ہے
محبت سے ہے انقلابوں پہ آب — کہ یہ آگ سے ڈھالتی ہے گلاب
بلندی پہ اڑنا سکھاتی ہے یہ — ممولے کو گدھ سے لڑاتی ہے یہ
بناتی ہے چڑیوں کو شاہیں صفت — بڑھاتی ہے پرواز کی منزلت
تضادوں سے ترکیب پائی ہوئی — محبت ہے اک مایۂ آشتی
محبت ہو گر ناظمِ این و آں — سلجھنے لگیں نفس کی گتھیاں
محبت کا منشا ہے انسانیت — نہیں اس کو برداشت حیوانیت

محبت کہ ہے شوقِ بیحد کا نام — جو بس دردمندی سے ہے شاد کام
محبت غمِ زندگی کی مٹھاس — محبت چمن بندیوں کی اساس
محبت سے افزائشِ جاں بھی ہے — جہاں اس کے دم سے فروزاں بھی ہے
محبت کے ہیں سلسلے بیکراں — زجاں تا جہاں، از جہاں تا زماں
محبت مسیح و خلیل و کلیم — محبت ہے سرِ الف لام میم
محبت سے تخلیق ہے بہرہ مند — محبت ہے ہستی کی شیرازہ بند

محبت ہے جس نے سجھائی یہ بات — کہ روشن ہے انساں کی تاریک رات
تخیل کی اس محفل آرائی سے — منظم ہو جو دل کی سچائی سے
تخیل کے ہیں فائدے بے حساب — یہ جاگے ہوؤں کو دکھاتا ہے خواب

نہ دیکھے کوئی گر اُجالوں کے خواب
تو مشکل سے آئے نظر آفتاب

تخیل تفکر کی ہے مشقِ ناز
ہے دانش سے وجدان کی سازباز

محبت ہے علم و عمل کی اساس
بڑھاتی ہے جو آرزوؤں کی پیاس

دکھاتی ہے راہِ حقیقت نشاں
محبت مفکر کی ہے ترجماں

محبت ہی ہے جس نے کھولا یہ راز
کہ دانش پہ وجدان ہے سرفراز

"محبت نے ظلمت سے کاڑھا ہے نور"
محبت سے ہے زندگی کا شعور

انتظار حسین

خیمے سے دُور

"یہاں کب تک بند بیٹھے رہیں۔ اب نکلنا چاہیئے۔" اکتا کر پہلے نے کہا۔

"نکل کر کہاں جائیں؟" دوسرے نے تھوڑا چڑ کر کہا۔ اصل میں پہلے نے اتنی بار نکل چلنے کا سوال اٹھایا تھا کہ دوسرے نے سوچا کہ کسی طور اس کا منھ بند کرنا چاہیئے۔ اور واقعی تھوڑی دیر کے لئے تو اس کا منھ بند ہو ہی گیا۔ وہ سوچ میں پڑ گیا۔ یہ تو ابھی تک اس نے سوچا ہی نہیں تھا کہ یہاں سے نکل کر جائیں گے کہاں۔ سوچتا رہا سوچتا رہا۔ جب بہت الجھ گیا تو بولا "نکل کر کہیں بھی جائیں باہر تو نکلیں۔"

"مگر باہر کے متعلق کچھ پتا تو چلے۔ یوں بے سوچے سمجھے نکل کھڑے ہونا عاقبت اندیشی تو نہیں ہے۔" اس نے سمجھانے کے لہجہ میں کہا۔ وہ جو تھوڑا چڑچڑا پن اس میں پیدا ہو گیا تھا اس پر اب اس نے قابو پا لیا تھا۔ اس کا تحمل اور تامل واپس آ گیا تھا۔

"باہر کے متعلق ہمیں پتہ کیسے چلے گا۔ اور اسی طرح بند بیٹھے رہے تو بے شک دنیا بدل جائے ہمیں کیا خبر ہوگی۔"

دوسرے نے پھر اسی تحمل کے ساتھ جواب دیا جیسے اسے سمجھا بہلا رہا ہو "جو گئے ہیں واپس آ جائیں ان سے کچھ پتہ چلے گا۔ پھر نکلنے کے متعلق سوچیں گے۔"

پہلا اس جواب سے مطمئن نہیں ہوا۔ بولا "کب کے گئے ہیں۔ پلٹے ہی نہیں آخر کب تک ان کا انتظار کیا جائے۔" رکا۔ پھر بولا "اگر وہ نہ آئے تو۔؟"

اس اچانک سوال پر دوسرا تھوڑا بوکھلا گیا۔ اگر وہ نہ آئے تو؟ ...... اگر وہ نہ آئے تو؟ ..... کتنی دیر تک یہ سوال اس کے اندر گونجتا رہا۔ اس امکان پر تو اس نے غور

ہی نہیں کیا تھا۔ ایک تشویش کی لہر اس کے اندر دوڑ گئی۔ اسے خیال آیا کہ واقعی اب تک تو انہیں آجانا چاہئے تھا۔ پھر کیوں نہیں آئے۔ کوئی ایک تو آجاتا کیوں۔؟ اور پھر وہی تشویش کہ اگر وہ نہ آئے تو۔ مگر اس نے اپنی اس تشویش کو بالکل ظاہر نہیں ہونے دیا۔ بظاہر اعتماد کے لہجہ میں بولا "نہیں وہ آئیں گے۔"

"ہاں انہیں آنا تو چاہئے۔ لیکن اگر نہ آئے تو؟" پھر وہی سوال۔ پھر وہ اکھڑنے لگا تھا۔ مگر پھر اس نے اپنے آپ کو تھاما "نہیں وہ آئیں گے۔" اور پھر قطعی لہجہ میں کہا "ہمیں ان کا انتظار کرنا ہوگا۔"

"مگر کب تک۔؟"

اس سوال نے اسے پھر پریشان کر دیا۔ انتظار کی مدت کا متعین کرنا اسے کتنا مشکل نظر آرہا تھا۔ کیا خبر ہے کب آئیں۔ اور کیا خبر ہے کہ نہ آئیں؟ پھر وسوسے کی لہر اٹھنے لگی تھی۔ مگر اس نے فوراً ہی اسے رفع دفع کر دیا۔ "بہر حال ہمیں ان کا انتظار کرنا ہے۔"

اس قطعی جواب کے بعد کوئی کیا کہتا۔ پہلا منہ ہی منہ میں کچھ بڑبڑایا اور چپ ہو گیا۔

دوسرے نے پہلے کو دیکھا کہ وہ چپ تو ہو گیا ہے مگر کتنا بے اطمینان ہے۔ سمجھانے کے لہجہ میں بولا "میرے یار، تجھے باہر کے حالات کا اندازہ نہیں مجھے ہے۔ میں یوں بے سوچے سمجھے نکل کھڑے ہونے کا خطرہ مول نہیں لے سکتا۔"

پہلا بولا "میرے دوست، تجھے باہر کے حالات کا تو اندازہ ہے، اندر کے حالات کا اندازہ نہیں ہے۔ اب تو مجھے دو ٹانگوں پہ کھڑا ہونا دوبھر لگتا ہے۔ چلنے کی خواہش ہی ختم ہو گئی۔ تھوڑے دن اور یہاں بند رہے تو ٹانگوں پہ چلنا بھول ہی جائیں گے۔ رینگنا شروع کر دیں گے۔" یہ کہتے ہوئے اسے اچانک خیال آیا کہ پچھلی رات جب اسے اس بند جگہ سے بہت خفقان ہوا تھا تو اس کا جی چاہا تھا کہ وہ سمٹ جائے اتنا کہ کنواڑ اور چوکھٹ کے بیچ جو دراڑ ہے اس میں سے رینگ کر نکل جائے۔

تیسرے نے جو کتنی دیر سے آنکھیں موندے اوندھے منہ ان دونوں سے بے تعلق بے سدھ پڑا تھا جیسے وہ ان کے بیچ ہے ہی نہیں، آنکھیں کھول کر غور سے پہلے کو دیکھا۔ عجیب نظروں سے کہ پہلا پسینہ پسینہ ہو گیا۔ مگر اس نے دم بھر دیکھ کر پھر آنکھیں موند لیں۔ اس کے آنکھیں موند لینے کے بعد پہلے نے اسے غور سے دیکھا پھر جیسے کسی شک میں پڑ گیا ہو۔ دوسرے کو سوالیہ نظروں سے دیکھا مگر دوسرا اسے کچھ کہتے کہتے اچانک دم بخود ہو گیا جیسے اسے کچھ سنائی دیا ہے۔ پہلا چونکا اور وہ بھی دم بخود ہو گیا۔

تیسرے نے آنکھیں کھولیں اور خلا میں تکنے لگا تو واقعی کچھ آہٹ ہوئی تھی۔ کان اس آہٹ پر لگے ہوئے تھے۔ ایک ساتھ وہ کتنے چونکے، کتنے خوفزدہ ہو گئے تھے۔

"کوئی ہے؟" پہلے نے کسی قدر شک کے ساتھ کہا۔

"لگتا تو ہے۔ کوئی ہے۔"

"پتہ نہیں کون ہے؟" پہلے نے وسوسے کے ساتھ کہا۔

وسوسہ دوسرے کو بھی تھا۔ مگر اس نے وسوسہ پر قابو پاتے ہوئے متانت کے ساتھ کہا۔
"وہی ہوں گے"

"ہاں ہونا تو انہیں ہی چاہئے۔ لیکن اگر وہ نہ ہوتے تو پھر کون ہو سکتا ہے۔"

پھر کون ہو سکتا ہے۔ یہ کہتے ہوئے وہ خود بھی خوفزدہ ہو گیا اور دوسروں کو بھی خوفزدہ کر دیا۔
دل کس بری طرح دھڑکنے لگے اور دھیان کس کس طرف گیا۔

دروازے پر بہت ہلکی سی دستک ہوئی۔ وہ دم بخود رہے۔ پھر دستک ہوئی، اتنی ہی ہلکی۔ آخر دوسرے نے ہمت کی۔ آہستہ سے اٹھا دبے پاؤں دروازے تک گیا۔ دراز میں سے جھانکا کسی نے سرگوشی میں کہا "کھولو"۔
دوسرے نے شاید آواز پہچان لی تھی۔ آہستہ سے دروازہ کھولا۔ جو داخل ہوا وہ ان کا چوتھا تھا۔ اسے دیکھ کر سب کی جان میں جان آئی۔

"تم اکیلے ہو" دوسرے نے تعجب سے کہا۔

"اچھا وہ ابھی تک نہیں پہنچا ہے" چوتھے نے سوال کے جواب میں سوال کیا

"نہیں ابھی تک تو آیا نہیں ہے"

"پھر آتا ہوگا" چوتھے نے اطمینان کے لہجہ میں کہا

"باہر کیا حال ہے۔"

"بہت ہجوم تھا۔ مشکل سے نکل کر آیا ہوں۔"

"ہجوم ہے" پہلے اور دوسرے نے اسے تعجب سے دیکھا۔

"ہاں بہت ہجوم تھا۔ لوگ ہی لوگ۔"

"عجیب بات ہے۔" پہلا بولا "اس وقت تو کوئی دکھائی بھی نہیں دے رہا تھا۔ نہ کوئی آواز ہی سنائی دیتی تھی۔ جیسے یہاں لوگ ہیں ہی نہیں۔"

" مگر اس وقت بہت لوگ ہیں اور بہت شور ہے"

" کہاں سے آگئے اتنے لوگ -؟" پہلا بدستور حیران تھا۔

" میں خود حیران تھا کہ یا اللہ یہ لوگ پہلے کہاں تھے اور اب کیسے اور کہاں سے نکل آئے۔ پتا نہیں کن کن کونوں، کھدڑوں سے نکل آئے ہیں۔ بہت لوگ ہیں، اور چوک میں تو سروں کا سیلاب امڈا ہوا ہے۔"

" پھر ہمیں بھی نکلنا چاہئے۔ ہم یہاں کیوں بند بیٹھے ہیں" پہلے نے بیکل ہو کر کہا۔

اس پر چوتھا چپ ہو گیا۔ تامل کے بعد بولا" ہاں نکلنا تو چاہئے۔ سوچ لیں"

" سوچنے کی اس میں کیا بات ہے۔ میرے خیال میں اب یہاں سے نکلنا ہی چاہئے۔ بند بیٹھے بیٹھے مجھے تو پھپھوندی لگ گئی۔ کتنے دن سے آسمان نہیں دیکھا بس اب نکلنا چاہئے"

چوتھا چپ رہا۔ پھر بولا" پہچانے نہ جائیں۔"

" اتنے ہجوم میں کون کسی کو پہچانتا ہے۔"

" یہ بھی ٹھیک ہے" چوتھے نے جواب دیا۔" ہجوم تو بہت ہے مگر پہچاننے والے سب جگہ ہوتے ہیں"

" ٹھیک کہتے ہو" دوسرے نے چوتھے کی تائید کی "ہجوم تو بہت ہے لوگوں میں ہر قسم کے لوگ ہوتے ہیں کسی نے پہچان لیا تو؟"

" اس کا بہت خطرہ ہے" چوتھا اب زیادہ اعتماد سے بولا۔

" اس کا مطلب یہ ہے کہ ہم اسی طرح بند بیٹھے رہیں۔ لوگ باہر نکلے ہوئے ہیں۔ ہم اندر گھسے بیٹھے رہیں؟" پہلے نے غصے سے کہا۔

" نہیں۔ اب زیادہ دیر تو اندر بند ہو کر نہیں بیٹھ سکتے" دوسرے نے تحمل سے جواب دیا۔ "عجلت نہیں برتنی چاہئے۔ ذراسی عجلت ہمیں کسی بڑی مشکل میں پھنسا سکتی ہے۔ تو بہتر یہ ہے کہ تھوڑا انتظار کر لیں اور جو قدم اٹھائیں احتیاط سے اٹھائیں۔"

"۔۔۔ احتیاط" دوسرا ہونٹ چباتے ہوئے بڑبڑایا

تیسرے نے آنکھیں کھولیں۔ چوتھے کو گھور کر دیکھا۔ "تجھے کسی نے پہچانا۔؟"

چوتھے نے اب تک اس کی طرف دھیان ہی نہیں دیا تھا۔ جیسے وہ تھا ہی نہیں۔ اب جو اس نے مڑ کر دیکھا اور سیدھا سوال کیا تو اس نے اسے دیکھا۔ اس کے لئے وہ اجنبی تھا۔ مگر اس کے پاس یہ سوچنے

کی کہ یہ کون ہے۔ زیادہ مہلت نہیں تھی۔ ایک سیدھے سوال نے اسے پکڑ لیا تھا۔ اور اب اسے خیال آیا
اور کسی قدر تعجب کے ساتھ کہ وہ اتنے بڑے ہجوم سے گزر کر آ رہا ہے جہاں ہر قسم کے آدمی سے اس کی مڈبھیڑ
ہوئی اور کسی نے اسے نہ پہچانا۔ "مجھے؟ ہاں مجھے تو کسی نے نہیں پہچانا بس نظروں میں نہیں آیا، بچ ہی گیا۔
اتفاق کی بات ہے حالانکہ سگریٹ کے لیے بیچ چوک میں رکنا پڑا۔ ایبرٹ سینما کے سامنے پان سگریٹ کی جو
دکان ہے وہاں کتنے پہچاننے والے کھڑے رہتے ہیں۔ اتفاق کی بات کہ اس وقت کوئی ایسا تھا ہی نہیں جو مجھے
پہچانتا۔"

"میرے ساتھ دمشق میں یہی ہوا تھا۔" تیسرا بولا۔

"دمشق میں؟" سب نے تعجب سے اسے دیکھا۔

"ہاں۔ دمشق میں بازار اس روز کتنے سجائے گئے تھے۔ تماشائیوں کا ہجوم تھا جلوس کا انتظار تھا۔"

"تو دمشق کب گیا تھا۔؟" پہلے نے طنز بھرے لہجہ میں پوچھا۔

"بس اسی روز پہنچا تھا جس روز سر اس شہر میں پہنچے ہیں۔"

"سر؟ کیسے سر"؟

"نیزوں پہ بلند باوقار سر۔" یہ کہتے کہتے تیسرا کسی تصور میں کھو گیا جیسے ان کے بیچ سے نکل کر
کہیں دور چلا گیا ہو پھر بڑبڑایا۔ "اونچے نیزے پہ بلند باوقار معنبر سر، منور چہرہ، گرد میں اٹا ہوا، لب ہلتے
ہوئے، قرآن کی تلاوت کرتے ہوئے۔"

چوتھے نے غور سے کسی قدر شک سے اسے دیکھا، سر سے پیر تک اس کا جائزہ لیا۔ پھر سوالیہ نظروں
سے پہلے اور دوسرے کو دیکھا جیسے پوچھ رہا ہو کہ یہ کون ہے۔

دوسرا کچھ کہنے لگا تھا کہ اچانک دم بخود ہو گیا۔ پھر سرگوشی میں پہلے اور چوتھے سے مخاطب ہوا۔

"تم نے سنا۔؟"

"کیا۔؟"

"قدموں کی آہٹ۔"

"اچھا۔؟"

"ہاں۔" کہتے کہتے چپ ہوا اور کان لگا کر کچھ سننے کی کوشش کرنے لگا۔ "سنو۔"

"ہاں، کوئی ہے۔" پہلے نے اس کے شک کی توثیق کی۔
"اسے آنا تھا۔ وہی ہوگا۔" چوتھا بولا۔
"ہاں ہونا تو اسے ہی چاہیے۔" پہلا بولا "مگر کیا خبر ہے؟" دوسرا چوتھے سے مخاطب ہوا۔
"تمہیں یہاں آتے ہوئے کسی نے دیکھا تو نہیں تھا؟"
"نہیں اصل میں مجھے کسی نے پہچانا ہی نہیں۔ کسی کو کیا پڑی تھی کہ دیکھتا کہ میں کدھر جا رہا ہوں۔"
"پھر تو اسے ہی ہونا چاہیے۔" دوسرے نے کسی قدر بے یقینی کے ساتھ کہا۔ تامل کیا اور اُٹھ کھڑا ہوا۔ دبے پاؤں چل کر دروازے تک گیا۔ کنواڑ کی دراڑ میں سے جھانکا۔ پھر دستک ہوئی اور دبی سی آواز "کھولو۔" اس نے فوراً ہی دروازہ کھول دیا۔ وہ اندر آ گیا۔ وہ وہی تھا، ان میں کا پانچواں "یار تم نے آنے میں بہت دیر لگائی۔ مجھے تو فکر ہو گئی تھی۔" چوتھے نے کہا۔
پانچواں ابھی اپنے حواس درست کر رہا تھا۔ اس نے اس سوال کا فوراً جواب دینا ضروری نہیں سمجھا۔ دوسرا بیچ میں بول پڑا "اتنے بڑے ہجوم کے بیچ سے نکل کر آنے میں بھی تو وقت لگتا ہے۔ دیر تو ہونی ہی تھی۔"
"ہجوم؟" پانچویں نے تعجب سے دوسرے کو دیکھا۔ "کیسا ہجوم؟ شہر شہرِ خموشاں بنا ہوا ہے۔ تم ہجوم کی بات کر رہے ہو؟"
"کیا؟" اب دوسرے نے پانچویں کو تعجب سے دیکھا۔ اور پھر فوراً چوتھے کو سوالیہ نظروں سے دیکھنے لگا۔
"یار کیا بات کر رہے ہو۔ ابھی تھوڑی دیر ہوئی میں آیا ہوں۔ بہت بڑا ہجوم تھا۔ شہر خلقت سے ابلا پڑ رہا تھا۔" چوتھا بولا۔
پانچویں نے حیرت سے یہ بات سنی۔ پھر بولا "یار، تم نے خواب تو نہیں دیکھا تھا۔"
"میں واقعہ بیان کر رہا ہوں۔"
"اچھا؟" رکا پھر بولا۔ "میں نے تو ہو کا عالم دیکھا۔ عجیب سناٹا چھایا ہوا تھا۔ میں تھا اور میرے قدموں کی آواز۔ باقی سب سنسان۔"
چوتھا سوچ میں پڑ گیا۔ پھر بولا۔ "تم چوک کی طرف گئے تھے؟"
"ادھر ہی سے ہوتا ہوا آیا ہوں۔ چوک میں اُلّو بول رہا ہے اور ایبرٹ سینما جہاں اتنی چہل پہل رہتی

بھی بند پڑا ہے۔"

"البرٹ سینما بند پڑا ہے۔" چوتھا اب بالکل چکرا گیا تھا۔ "ابھی تھوڑی دیر پہلے تو وہاں ٹکٹوں کے لئے قطاریں لگی ہوئی تھیں۔"

"پتہ نہیں تم کیا کہہ رہے ہو۔ وہاں تو سناٹا ہے۔"

"دم کے دم میں سناٹا!" چوتھا بڑبڑایا۔ "کہاں گئے لوگ۔"

"یہی میں سوچ رہا تھا کہ لوگ کہاں گئے۔"

"پہلا ہنسا اور بولا "اس شہر کے لوگ تو جن بھوت ہو گئے۔ دم میں حاضر دم میں غائب۔" پھر ایک دم سے سنجیدہ ہو گیا۔

"شاید ہم لوگ بھی۔۔۔۔ کم از کم میں سایا بن چکا ہوں۔"

"بنے تو نہیں ہیں۔" دوسرا بولا۔ "بن جائیں گے۔"

تیسرے نے اسی طرح اوندھے پڑے پڑے آنکھیں کھولیں۔ ایک ایک کو گھور کر دیکھا۔ "اچھا تم لوگ بھی۔؟"

چوتھے کو ایک دم سے پھر خیال آیا کہ یہ کون شخص ہے۔ وہ سوالیہ نظروں سے دوسرے کو دیکھنے لگا تھا جیسے کچھ پوچھنے والا ہو۔ اتنے میں پہلا بول پڑا "ویسے اچھا ہی ہے۔"

"کیا اچھا ہے۔؟"

"یہی کہ اس وقت کوئی نہیں ہے۔ نکل چلیں۔ موقع اچھا ہے۔"

" دوسرے پس و پیش میں پڑ گئے۔ مگر پانچویں نے اس کی بات کاٹ دی۔ "کیا باتیں کرتے ہو۔ اس وقت نکلو گے؟"

اس سے بہتر وقت اور کون سا آئے گا۔ کوئی دیکھنے والا ہے ہی نہیں۔" پہلے نے اپنے موقف کے حق میں دلیل پیش کی۔

"بات یہ ہے۔" پانچواں بولا۔ "لوگ چل پھر رہے ہوں تو نکلنے میں آسانی رہتی ہے۔ کوئی نوٹس نہیں لیتا کہ کون جا رہا ہے۔ لیکن سڑکیں خالی ہوں اور شہر میں سناٹا ہو اور پھر کوئی گزرتا نظر آئے تو خوامخواہ شک ہوتا ہے۔"

دوسرے نے تائید میں سر ہلایا "ٹھیک کہتے ہو۔"

پہلا بولا "جب کوئی ہے ہی نہیں تو کون دیکھے گا۔ اور کون شک کرے گا۔"

پانچواں طنزیہ ہنسی ہنسا۔ "تم بہت سادے ہو۔ ایسے ہی وقت میں جب کوئی نظر نہیں آتا۔ آدمی کو زیادہ دیکھا جاتا ہے اور زیادہ شک کیا جاتا ہے۔"

تیسرے نے ایک مرتبہ پھر آنکھیں کھولیں۔ پانچویں کو گھور کر دیکھا۔ "تجھ پر کسی کو شک ہوا۔؟"

اس آن پانچویں کو خیال آیا اور اس خیال پر وہ ششدر رہ گیا کہ وہ سائیں سائیں کرتے رستوں سے گزر کر آیا ہے۔ مگر کسی کو اس پر شک نہیں ہوا۔ بولا "میرے ساتھ تو کمال ہوا۔ سڑکیں خالی۔ بس میں اکیلا چل رہا تھا۔ ادھر کا دم ادھر، نیچے کا دم نیچے کہ کسی نے تاڑ لیا تو۔ مگر بچ گیا۔"

"میرے ساتھ بھی یہی ہوا تھا۔" تیسرا سوچتے ہوئے بولا۔ جیسے کچھ یاد آ گیا ہو۔ "وہ رات بہت ویران تھی چاروں طرف سناٹا۔ بس صحرا کے سانس کی آواز تھی۔ مجھے دھڑکا لگا ہوا تھا کہ قریب ہی فرات پہ لشکر پڑا ہے۔ کسی نے دیکھ لیا تو۔؟ ۔۔۔۔ مگر بچ گیا۔"

"فرات۔؟"

"ہاں فرات۔" رکا، پھر سوچتے ہوئے بولا "میں سمجھا کہ کوئی مجھے نکلتے ہوئے نہیں دیکھے گا کہ بیسع لو اس جناب نے گُل کر دیا تھا۔ مگر جب میں نکلنے لگا تو میں نے دیکھا کہ خیمہ تو منور ہے اور سب نے مجھے دیکھ لیا ہے۔ بس جیسے میں سب کے سامنے برہنہ ہو گیا ہوں۔ منہ چھپا کر تیزی سے نکل آیا۔"

رکا، خیالوں میں کھو گیا۔ پھر بڑبڑایا "فرات کے کنارے لشکر پڑا تھا۔ قدم قدم پہ پہرہ۔ دھڑکا کہ اب پکڑا گیا۔ مگر کسی نے دیکھا ہی نہیں۔"

وہ بول رہا تھا اور چاروں کی نظریں اس پر جمی ہوئی تھیں۔ پھر جیسے سب کچھ سمجھ میں آ گیا ہو۔

"اچھا تو تھا وہ آدمی۔"

ہاں اس نے بمشکل کہا اور اس کا سر جھک گیا۔ دوسرے نے تامل کیا پھر کہا "اگر تو وہی ہے ۔۔۔۔؟" اس نے فوراً بات کاٹی "نہیں، میں وہی نہیں ہوں۔"

"تو وہی نہیں ہے؟" دوسرا چکرایا۔ "مگر ابھی جو تو نے بیان کیا اور اقرار کیا۔"

"عزیزو! میں نے صحیح بیان کیا اور صحیح اقرار کیا۔ ہوا یوں کہ جب میں دمشق پہنچا تو میں نے

دیکھا کہ اہلِ تقویٰ مشکل میں ہیں۔ ان پر شک کیا جا رہا ہے۔ انہیں پکڑا جا رہا ہے۔ میں ڈرا کہ کہیں میں پہچانا نہ جاؤں۔ مگر عجب ہوا کہ کسی نے مجھے نہ پہچانا۔ کسی کو مجھ پر شک نہیں گزرا۔ تب مجھے دھیان آیا کہ جب میں خیمے سے نکلا تھا تو نکلتے نکلتے جیسے کہیں میں اپنے بیچ سے نکل گیا۔ تو جب میں خیمے سے باہر آیا تو میں وہ نہیں تھا، کوئی اور تھا۔ . . . . . . ہاں بالکل، پھر میں کوئی اور تھا۔"

وہ چاروں اسے تکنے لگے۔ پریشان کہ کیا کہہ رہا ہے۔ پھر وہ انہیں تکنے لگا۔ ایک ایک کی صورت کو غور سے دیکھا۔ حیران ہوا۔ "تم وہی ہو؟"

"ہم؟" وہ ایسے چونکے جیسے ان پر اچانک حملہ ہو گیا ہو۔ سٹپٹائے۔ ایک دوسرے کو دیکھا۔ جلدی سے دفاعی انداز میں بولے "ہم وہی ہیں۔ . . . جو تھے۔"

"اچھا؟" وہ اور حیران ہوا۔ ایک دفعہ پھر باری باری چاروں صورتوں کو غور سے دیکھا۔ "تو گویا جب تم خیمے سے نکلے تھے تو . . . . ؟"

"خیمے سے؟ کس خیمے سے؟" انہوں نے بیک زبان عجلت سے اس کی بات کاٹی۔

وہ کچھ نہیں بولا۔ حیران انہیں تکتا رہا۔ وہ خود ہی چکر میں پڑ گئے۔ آپس میں ایک دوسرے کو سوالیہ نظروں سے دیکھا۔ سرگوشی میں ایک دوسرے سے پوچھا۔ "یار، ہم کس خیمے سے نکلے تھے۔؟"

اس بار اس سوال نے انہیں مزید چکرایا۔ کچھ حیران، کچھ پریشان ایک دوسرے کو دیکھتے رہے۔ اس عالم میں دوسرے نے خود اعتمادی دکھائی۔ بڑے تیقن سے کہا "عزیز، ہم کسی خیمے سے نہیں نکلے۔"

دوسرے نے فوراً تائید میں سر ہلایا "ٹھیک بات ہے۔ ہم کسی خیمے سے نہیں نکلے ہیں۔"

پھر وہ چپ ہو گئے۔ آگے سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا کہا جائے۔ یہ بھی چپ رہا۔ بس انہیں تکتا رہا۔ بڑبڑایا "عجیب بات ہے۔" چپ ہو گیا۔ پھر بڑبڑایا "مجھے کم از کم یاد تو ہے۔"

صادق حسین

بابو رفیق

بابو رفیق، دروازے میں پڑا ٹاٹ ایک طرف کو ہٹا، باہر نکلا تو جیرا پہلوان، تہمد، در بنیان پہنے، ننگے پاؤں، اپنے گھر کے سامنے کھڑا، ریڑھی پر سُنہری آم سجا رہا تھا۔ جیرا پہلوان نے اپنی موٹی تازی گردن موڑ کر مخصوص لاہوری لہجے میں کھنکتا ہوا سلام کیا۔ بابو رفیق نے موٹے موٹے شیشوں والی عینک، ناک کی پھننگی تک لاکر، جیرے کا سُرخ و سفید چہرہ دیکھتے ہوئے سلام کا جواب دیا اور پھر وہ تیز تیز قدموں سے چلتا، گلی سے نکل، بس اسٹاپ کی طرف بڑھ گیا۔ جیرا پہلوان نے اپنے گھر کے آنگن میں جھانک کر کہا "بشیرے کی ماں! سات بج گئے ہیں۔ چولہے کی بیٹھی ذرا ادھر کھسکا دو۔"

گلی کے سب لوگ جانتے تھے کہ بابو رفیق، صبح کے ٹھیک سات بجے دفتر جاتا ہے۔ کوئی دو برس پہلے جب وہ اس گلی میں کرائے کے مکان میں، آیا تو سب سے پہلے جیرا پہلوان نے اُس کی طرف دوستی کا ہاتھ بڑھایا تھا۔ اُس دن سورج کی شعاعیں منڈیروں سے ڈھل کر بیچ گلی میں آپہنچیں مگر بابو رفیق گھر سے باہر نکلا۔ جیرا پہلوان نے دل میں سوچا۔ خدا خیر کرے بابو جی ابھی تک دفتر نہیں گئے۔ اُس نے ایک راہگیر سے وقت معلوم کیا تو بوہنی کا خیال بھی ذہن سے نکل گیا۔ دوسرے لمحہ وہ دروازے کی کنڈی کھٹکھٹا رہا تھا۔

"کون ہے؟" اندر سے ایک نسوانی آواز آئی۔

"باجی! میں ہوں جیرا پہلوان۔ بابو جی دفتر نہیں گئے!"

"انہیں بخار آگیا ہے"

"میں بابو جی کو دیکھنا چاہتا ہوں"

بابو رفیق کی بیوی نے دروازہ کھول کر پردہ کر لیا۔

جیرا پہلوان اور بابو رفیق کچھ دیر چارپائی پر بیٹھے باتیں کرتے رہے اور پھر جیرا پہلوان نے اٹھ کر ڈب سے

دس دس کے دو نوٹ نکال، بابو رفیق کے تکیے کے نیچے رکھ دیئے۔

"پہلی تاریخ کو حساب چکا دوں گا" بابو رفیق نے آہستہ سے کہا

"باؤ جی! اِس کی فکر نہ کریں۔ آپ بس جلدی سے ٹھیک ہو جائیں"

اُس گلی میں رہنے والے مختلف پیشوں سے تعلق رکھتے تھے

مہاجا قصاب اپنی دُکان میں گدّی پر بیٹھتے ہی یکسر بدل جاتا۔ پُٹھ کی تازہ بوٹیوں میں سینے کے دو چار باسی ٹکڑے اِس صفائی سے ملا دیتا کہ کسی کو پتا نہ چلتا۔ گاہک کی بات سُنی اَن سُنی کر کے جی ہی جی میں خوش ہوتا کہ اُس کے پاس بھی ایک ایسی طاقت ہے جیسے تربت کردہ لکھے پڑھے آدمی کے سر کو نیچا دکھا سکتا ہے۔ بابو رفیق کی بات اور تھی۔ وہ تو پاؤ بھر گوشت خریدنے کے لئے ہفتے عشرے میں مہاجے کی دُکان کا رُخ کرتا۔ مہاجا پاٹ دار آواز میں کہتا "آؤ باؤ جی! اُٹھ چھوکرے لپک کر جا اور باؤ جی کے لئے ہاف سیٹ کڑک چائے لے آ"۔ بابو رفیق کی بھگت ہوتے دیکھ، آدھا آدھا بکرا خریدنے والی موٹی اسامیاں ہکا بکا رہ جاتیں۔ مہاجا قصاب اُسے سوچتا۔ بابو رفیق گوشت کم کھاتا ہے۔ اِسی لئے تو اُس کی پسلیاں نکل آئی ہیں۔ بچارے کی نپی تلی تنخواہ کا ایک حصہ تو کپڑوں کی دُھلائی پر اُٹھ جاتا ہو گا۔

برکت دھوبی، بابو رفیق کی سُوتی قمیصوں کو کلف دے کر احتیاط سے اِستری کرتا۔ پتلون کہیں سے مسک جاتی تو نظیراں دھوبن چپکے سے رفو کر دیتی۔ مُسٹنڈی نظیراں تھی تو بڑی جھگڑالو عورت مگر بابو رفیق کی عزت کرتی۔ شاید اِس لئے کہ وہ بابو رفیق سے خط لکھوا کر اپنے بیٹے کو بھیجتی تھی۔ اُس کا بیٹا دبئی میں محنت مزدوری کر کے دھڑا دھڑ روپیہ بھیج رہا تھا۔ پہلے تو نظیراں، دُھلائی کے لئے آئے ہوئے رنگ برنگے کپڑے پہنتی مگر اب وہ قیمتی کپڑے کی لمبی قمیص اور تنگ پائینچوں والی شلوار پہن، ٹھمک ٹھمک گلی میں پھیرے لگاتی۔ اُس کی چھم چھم کرتی چاندی کی پازیبیں فضا میں ہل چل مچا دیتیں۔ اب تو وہ بُھنا ہوا گوشت اور پراٹھے کھاتی۔ سردیوں میں پنجیری بناتی۔ دودھ میں پھینیاں ڈال، سڑپ سڑپ کھاتی۔ گرمیوں میں حلوہ پوری کا ناشتہ کر کے ریڈیو پر گانا سُنتے سُنتے کپڑوں کے گٹھڑ پر فقیرا افیونی کی طرح گھوڑے بیچ کر سو جاتی۔

فقیرا نے افیون دیکھی بھی نہیں تھی مگر گلی والے اُسے افیونی کہہ کر پکارتے۔ اِس لئے کہ وہ بکّر پیر کے تکیے پر آلتی پالتی مارے، آنکھیں بند کئے سوچتا رہتا تھا۔ رحیما مالشی اور دِتا کنجڑا، رائے عامہ کی نمائندگی

کرتے ہوئے، فقیرا افیونی کو اپنا مُرشد مانتے تھے۔ رحیما مالشی نے ایک دن بابو رفیق سے کہا تھا "باؤجی! فقیرا افیونی کو اپنا پیر بنالو۔ پھر نوٹ سنبھالے نہ جائیں گے۔ مجھے دیکھو۔ میں الف بے نہیں جانتا لیکن مُرشد کی دُعا سے روز تکے کباب کھاتا ہوں۔" دتا کُنجڑا بولا "میرے بادشاہ! کام وہ کرو کہ شام کو اُٹھو تو کڑک نوٹ گِن کر شلوار کے نیفے میں اُڑس لو۔ پھر خوب کھاؤ، بیٹیاں رجھان بناؤ۔"

بابو رفیق جانتا تھا کہ رحیما مالشی سزا یافتہ ہے۔ وہ سر کی مالش کرتے ہوئے، جیب کی مالش بھی کر دیتا ہے۔ شام کے وقت جب وہ دھندا کرنے نکلتا تو اُس کے ٹھاٹ باٹ دیکھ کر بابو رفیق حیران رہ جاتا۔ گلے میں طلائی زنجیر، چھنگلیا میں سونے کی انگوٹھی۔ کلائی میں گھڑی۔ ٹیڑھی مانگ نکالے۔ کان میں سگریٹ اٹکائے پیشہ ورانہ صندوقچی ہاتھ میں پکڑے۔

دتا کُنجڑا تو پیاز کا بادشاہ تھا۔ اُس کی نگاہ دُور بیں، طلب و رسد کا جائزہ لیتی رہتی۔ وہ ٹھیک وقت پر پیاز کا ذخیرہ باہر لے آتا۔ وارے نیارے ہو جاتے۔ عورتیں اپنے سینے پر دوہتڑ مار کے سبزی منڈی کے آڑھتیوں کو بُرا بھلا کہتیں۔

بابو رفیق تو صرف ایک کام جانتا تھا۔ وقت پر دفتر جاؤ۔ قلم گھسیٹتے رہو۔ ہر ماہ کی پہلی تاریخ تنخواہ وصول کر کے قرض ادا کرو۔ لیکن اِس مہنگائی کے زمانے میں، محدود آمدنی سے میاں بیوی کی بُنیادی ضرورتیں بھی پوری نہیں ہوتی تھیں۔ حالات کی یہ صورت بھانپ کر، جیرا پہلوان نے بابو رفیق کو مشورہ دیا۔ "باؤجی! چھوڑو یہ نوکری۔ ریڑھی لگالو۔ مزے میں رہو گے۔"

جیرا پہلوان نے بابو رفیق کو ریڑھی پر پھل سجانے، ڈنڈی مارنے اور گاہک سے آنکھ بچا کے سڑے میوے لفافے میں ڈال دینے کے گُر بتائے تو بابو رفیق کو جیرا پہلوان کی باتوں سے بدبُو آنے لگی۔ اُس نے جیرا پہلوان کے ننگے پاؤں کی طرف دیکھا، جن پر میل جما ہوا تھا۔ جیرا پہلوان، سردیوں میں لنڈا بازار کا گرم کوٹ پہن کر، سینہ تانے یوں چلتا، جیسے کہہ رہا ہو "ہٹ جاؤ راستے سے۔ دیکھتے نہیں، جیرا پہلوان آ رہا ہے۔" اُس کی طرح، اُستاد کرچھی، صبح سویرے، حلوائی کی دُکان سے لوٹ کر، بازو ہلاتا، گلی میں یوں داخل ہوتا جیسے آواز دے رہا ہو "اُستاد کرچھی ایک سیر دہی اور آدھ درجن پیڑوں کی لسّی پی کر آ رہا ہے۔"

اُستاد کرچھی کا اصلی نام صرف شاہ عالم مارکیٹ کے بزرگ جانتے تھے۔ ایک زمانے میں وہ کرچھیاں بنا کر تھوک کے بھاؤ فروخت کیا کرتا تھا۔ رفتہ رفتہ اُس کا نام اُستاد کرچھی پڑ گیا۔ اب وہ جیرا کی طرح ریڑھی

لگاتا تھا۔ مزاج اور پیشے کے اعتبار سے کاروبار کے طریقے مختلف تھے۔ جیرا پہلوان کی ریڑھی سارے علاقہ کا چکر لگاتی۔ وہ چوراہے کے پاس، ریڑھی روک کر بآوازِ بلند کہتا "مصری ورگے" سب لے لو۔ سیانیاں دے سودے سچے"۔ اُس کی آواز سُن کر بابو رفیق سوچتا "کون کہتا ہے کہ ہمیں دل کی بات کہنے کی آزادی نہیں"۔

جیرا پہلوان گرمیوں میں درختوں کی چھاؤں میں دھندا کرتا۔ سردیوں میں دھوپ کی تلاش میں رہتا۔ ایک دن دھوپ چھاؤں کی بات چل نکلی تو گلی کے ایک بزرگ نے کہا "جیرا پہلوان! باہر کی دھوپ چھاؤں تو کچھ بھی نہیں۔ اندر کی رُت کا فکر کر"۔ جیرا پہلوان بزرگ کی بات سمجھ نہ سکا۔ اُس نے جھٹ ریڑھی سے ایک آم اُٹھا، چوسنا شروع کر دیا۔ گلی کی ایک تاریک کوٹھری میں رہنے والے بھکاری نے بزرگ کی بات سُن کر سوچا "پلّے ہو تو سب موسم ٹھیک ہیں"۔ وہ خود اچھے موسم کی تلاش میں، مسکین صورت بنائے، ہاتھ پھیلائے دن بھر صدا دیتا رہتا "دے اللہ کے نام پر"۔ "سخی کا مرتبہ بلند ہو" "جو دے اس کا بھی بھلا، جو نہ دے اس کا بھلا"۔ جمعہ کا ٹپّا ہونے سے پہلے وہ اتنی رقم اکٹھی کر لیتا، جس سے وہ لکشمی چوک میں جا کر گردے کپورے اور نان کھاتا، گرم گرم چائے پیتا، سگریٹ کے کش لگاتا، سینما دیکھتا اور دوسرے دن پنواڑی کو ریزگاری دے کر اُس سے نوٹ لیتا۔ اب اس کے پاس اتنی پونجی ہو گئی تھی کہ زمین کا ایک ٹکڑا خریدنے کے لئے وہ دلال سے بات چیت کر رہا تھا۔ وہ اکثر سوچتا کہ گداگری سے اچھا کوئی پیشہ نہیں۔ ہلدی لگے نہ پھٹکری رنگ بھی چوکھا آئے۔ اب تو اُس نے بھیک مانگنے کے اوقات بڑھانے کی ٹھان لی تھی۔ اِس لئے کہ وہ اُستاد کرمچی کی طرح امیر بننے کے خواب دیکھنے لگا تھا۔ وہ اُستاد کرمچی، جس کی ریڑھی گذشتہ دو برس سے بڑ کے پیڑ کے نیچے کھڑی تھی۔ جیرا پہلوان ریڑھی دھکیلتا خود لوگوں کے پاس جاتا مگر اُستاد کرمچی کے پاس لوگ چل کر آتے۔

اُستاد کرمچی کی بیوی، بیوہ بہن اور جوان بھانجی، پانی میں بھگوئی، ماش کی دال سِل بٹے سے پیسنے میں جُتی رہتیں۔ کڑھائی میں ڈکوڑیاں تل کر پانی میں ڈال دیتیں۔ گلی کی گندی نالی سے مکھیاں اُڑ اُڑ کر چٹخارے کے سامان پر بھنبھناتی رہتیں۔ عصر کی اذان سے پہلے، دہی سے بھری مٹکی، بڑے، اُبلے ہوئے آلو، سبز مرچ اور ٹماٹر، مسالے، اِملی کی چٹنی اور پیاز کے لچھے، اُستاد کرمچی کے اڈے پر پہنچ جاتے۔ برقی قمقموں کی روشنی میں اگربتیوں کی بھینی بھینی خوشبو آس پاس پھیل جاتی۔ ٹرانزسٹر ریڈیو سے گیتوں کا سلسلہ شروع ہو جاتا۔ گاہک ٹوٹ پڑتے۔ موٹر کاروں، سائیکلوں، سکوٹروں کی بھیڑ لگ جاتی۔ اُستاد کرمچی اور اُس کے ملازموں کو سر کھجانے کی فرصت نہ ملتی۔ اُستاد کرمچی، رات کو اڈے سے اُٹھتا تو نوٹوں کی کٹھڑی

باندھ کر گھر لے جاتا۔

بابو رفیق، استاد کرمچی سے کتنی کاٹتا تھا۔ غالباً اس لئے کہ بات کرتے میں استاد کرمچی کے منہ سے جھاگ اُڑتے تھے۔ اُس کی گفتگو ہر پھر کے وہی بڑے پر آجاتی۔ بابو رفیق کے ذہن میں وہ ناخوشگوار واقعہ بھی تو نقش ہو کر رہ گیا تھا۔ اُس دن استاد کرمچی نے کرائے کے غنڈے بلوا کر مومی کو بُری طرح پٹوایا تھا۔ مومی سویوں میں چھابڑی لگا، ریوڑیاں اور مونگ پھلی بیچتا، گرمیوں میں قلفیاں اور فالودہ۔ اُس کا جُرم یہ تھا کہ ایک دن اُس نے اُستاد کرمچی کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھا تھا۔

"آبے موٹنڈے، نیچی کر آنکھیں" اُستاد کرمچی نے گرج کر کہا

مومی کی آنکھیں نیچی نہ ہوئیں۔

اُستاد کرمچی نے خون کے گھونٹ پی کر، اپنے گھر کے دروازے میں پڑی چق اٹھا، اندر جانے لگا تو دیکھا کہ جوان بھانجی دیوار سے لگی کھڑی ہے۔ اُس کی آنکھوں میں آنسو تھے۔

"تو یہاں کھڑی ہے؟" اُستاد کرمچی نے رُعب سے پوچھا

"ماموں جی!"

"بولو، کیا کہنا چاہتی ہو.."

"ماموں جی! مومی کو کچھ نہ کہنا"

"بے شرم کہیں کی۔ آئندہ تجھے دروازے کے پاس دیکھا تو تیرا گلا گھونٹ دوں گا۔"

چھٹی کے دن بابو رفیق اور اُستاد کرمچی کی ملاقات ناگزیر ہو جاتی۔ بابو رفیق فجر کی نماز پڑھ کر مسجد سے واپس آتا تو اُستاد کرمچی اُسے اپنے بیٹھک میں لے جا کر چائے پلاتا۔ گلی کے دوسرے افراد بھی آجاتے۔ بابو رفیق اخبار پڑھ کر سُناتا۔ اُستاد کرمچی "ضرورت رشتہ" کے اشتہارات میں گہری دلچسپی لیتا۔ وہ مزے لے لے کر رشتوں کے کوائف سُنتا اور پھر ایک ٹھنڈی سانس لے کر چُپ ہو جاتا۔

ایک دن اُستاد کرمچی نے بابو رفیق سے کہا "بابو جی! آپ نوکری چھوڑ کر میرے اڈے پر آجائیں۔ جو تنخواہ آپ کو سرکار دیتی ہے اُس سے تین گُنا زیادہ میں دوں گا۔ میرا کام اتنا پھیل گیا ہے کہ حساب کتاب رکھنا مشکل ہو گیا ہے۔ مجھے آپ جیسے آدمی کی ضرورت ہے"

بابو رفیق ٹس سے مس نہ ہوا۔

اُس دن چھٹی تھی۔

بابو رفیق نے مسجد میں فجر کی نماز پڑھی۔ اُس کا جسم ٹوٹ رہا تھا۔ پپوٹے بوجھل ہو رہے تھے۔ وہ رات بھر خیالات کی کال کوٹھری میں تڑپتا رہا تھا۔ اگر وہ پان سگریٹ کی دُکان کر لیتا تو پیٹ بھر کر کھانا تو کھا لیتا۔ تازہ اور خشک میوے تو اُس کی دسترس سے باہر تھے۔ وہ اچھی طرح جانتا تھا کہ لحمیات اور حیاتین کی کمی کی وجہ سے انسانی جسم کھوکھلا ہو جاتا ہے۔ اگر اُسے ان باتوں کا علم نہ ہوتا تو شاید اُسے اتنا دُکھ نہ ہوتا۔ اب اُس کی بیوی اُمید سے تھی۔ ایک بیمار زندگی سے نئی زندگی طلوع ہو کر اس گھر میں کیا کرے گی۔ اُسے یوں محسوس ہوا جیسے وہ کولہو کے بیل کی طرح چکر کاٹ رہا ہو۔ جیسے وہ جنم سے لے کر آج تک کسی قید خانے میں بند ہو۔ خیالات کی بیڑیوں اور ہتھکڑیوں کی جھنکار اُس کے کانوں کے پردے پھاڑنے لگی۔

اُس دن چھٹی تھی۔

بابو رفیق مسجد سے نکل کر گلی میں داخل ہوا تو اُستاد کرچی اُسے بازو سے پکڑ، اپنی بیٹھک میں لے گیا۔ گلی کے کچھ افراد بھی آ کر نصف دائرے کی صورت میں قالین پر بیٹھ گئے۔ بابو رفیق کھلی کھڑکی کے پاس بیٹھا تھا۔ اس کے سامنے اخبار پڑا تھا۔

اُستاد کرچی، صاف ستھرے کپڑے پہنے، گاؤ تکیہ سے ٹیک لگائے، قالین پر بیٹھا، مونچھوں کو تاؤ دے رہا تھا۔ گلی کا بزرگ آنکھیں بند کیے تسبیح پھیر رہا تھا۔ چائے آ گئی۔ چیزا پہلوان سڑکا مار کر بولا "اُستاد کرچی تیری خیر ہووے"

مہاجا قصاب چائے کا گھونٹ پی کر بولا "یخنی کا مزا آ گیا"

برکت دھوبی، رحیما اور دتا کنجڑا، سب کے سب تازہ خبریں سننے کے لئے بیتاب ہو رہے تھے۔

دفعتاً کہیں دُور سے توپیں گرجنے لگیں۔

"بابو رفیق! یہ آوازیں کیسی ہیں؟" اُستاد کرچی نے پوچھا

بابو رفیق نے کھڑکی میں سے آسمان کی طرف دیکھتے ہوئے کہا

"آج کے دن ہم آزاد ہوئے تھے۔ ہماری قوم یوم آزادی منا رہی ہے۔"

حیات اللہ انصاری

نیا بھیس

اس بات کا تو مجھے بھی احساس تھا کہ مسکراہٹ میرے اندر سے پھوٹی پڑ رہی ہے۔ جس کی وجہ سے ہونٹ قابو سے باہر ہو گئے ہیں۔ لیکن یہ احساس نہیں تھا کہ میں ریل کی کھڑکی کے شیشے میں اپنی صورت کا عکس دیکھے چلا جا رہا ہوں۔ اور نئی نویلی دلہن کی طرح خود میں ہو رہا ہوں۔ اچانک ہنسی کی دو تین ملی جلی آوازوں اور اس فقرے نے مجھے چونکا دیا۔

"شیام وائیکر کے بارے میں سنا ہے کہ وہ ہر وقت آئینہ دیکھا کرتا ہے"۔ چونک کر میں نے ہنسنے والوں کی طرف دیکھا اور ٹٹولنے لگا کہ وہ کس طرف اشارہ کر رہے ہیں کہیں یہ میں ہی تو نہیں ہوں۔

سات اسٹوڈنٹ تھے جو پہلے کے دو تین اسٹیشنوں میں سے کسی سے سوار ہوتے تھے اور کالج سے گھر جا رہے تھے۔ ان میں دو لڑکیاں بھی تھیں۔ ان لوگوں کی آنکھوں کی گردش اور تبسم سے میں سمجھ گیا کہ ان کے تقریر کا نشانہ میں ہی ہوں۔ میں سنبھل گیا اور ہونٹوں کے تبسم کو سکوڑ لیا۔ اس سے شاید میرے انداز میں ایسی تبدیلی آگئی کہ ایک اسٹوڈنٹ بول اٹھا کہ

"ایکٹنگ اسے کہتے ہیں کہ دوست، جب چاہو ہنسوڑ بنو اور جب چاہو پروفیسر بن جاؤ۔"

پروفیسر! کیا یہ لوگ مجھے پہچان گئے۔ مگر تھوڑے ہی مشاہدے کے بعد میں سمجھ گیا کہ ایسی بات نہیں ہے۔ اور پھر میں ان لوگوں کی باتوں کی تہ تک پہنچ گیا۔ وہ یہ کہ پلاسٹک کا آپریشن ذرا ضرورت سے زیادہ ہی کامیاب ہو گیا ہے۔ یہی میں سننا چاہتا تھا۔ تھا چالیس سال کا مگر بن گیا تھا بالکل جوان۔ چہرے کی جھریاں ہی غائب نہیں ہو گئی تھیں بلکہ گالوں میں تناؤ اور چکناہٹ بھی آگئی تھی۔ دوسری طرف میں اکہرے بدن کا تو تھا ہی اس پر پہنے ہوئے تھا بہت عمدہ دُھلا ہوا چکن کا کرتا اور اس پر چوڑی دار پاجامہ۔ یہ لباس اس علاقہ میں لکھنؤ کی طرح عام نہیں تھا۔ صرف شوقین چھیلا بننے کے لئے پہنتے تھے۔

نوجوانوں کے طور طریق اور لہجے سے یہ بات صاف تھی کہ مجھے کیا سمجھ رہے ہیں۔ پھر میں نے یہ بھی دیکھ لیا کہ شیشے پر روشنی کچھ ایسے زاویہ سے پڑ رہی ہے کہ وہ لوگ بھی دیکھ سکتے ہیں کہ میں خود بنی کر رہا ہوں۔

لیکن لوگوں کے دھوکا کھانے سے مجھے یقین آگیا کہ میں لگ بھگ ۲۰ سال کا لگ رہا ہوں۔ میں نے سوچا کہ جب ایسی بات ہے تو کیوں نہ ذرا نوجوانوں کی صحبت کے مزے بھی لے لوں۔ اب میں نے لڑکیوں کو ان نظروں سے دیکھا جن سے تیس سال پہلے دیکھا کرتا تھا۔ اور پھر نوجوان لڑکوں کا بے تکلفانہ لہجہ اختیار کر کے ایک اسٹوڈنٹ سے پوچھا۔

"کہاں اترنا ہے آپ لوگوں کو"

"ہم لوگ تو بالی دوڈ جا رہے ہیں"

وہاں ہم لوگوں کی شوٹنگ ہے۔ کیوں نہ دوست" ؟

دوست چلا کر بولے "ہاں ہاں "

ایک بولا تم چاہے نہ جاؤ میں تو ضرور ہی جاؤں گا۔ (اپنے چہرے پر ہاتھ پھیر کر) دیکھو پیارا لگتا ہوں۔ کیوں شیلا۔

"ہاں ہاں اپنی ماں کے پیارے ہو۔ باپ کے دُلارے ہو"

اس جواب پر ایسا قہقہہ لگا کہ پیارا خاموش ہو گیا مگر ایک اور لڑکا بولا "اگر شیامو کو ساتھ لے لیا جائے تو کیسا رہے"

سب نے میری طرف دیکھا۔

"نہیں بھائی۔ پھر تو ہم سب کے سامنے ماند پڑ جائیں گے"

اس پر سب نے چھوٹی سی کھِل کھِل کی۔ لیکن شیلا پوری طرح کھل کھلا کھل کھلا کر ہنس دی۔ وہ تنگ جین پہنے تھی۔ اور ایک پاؤں سے کھڑی ہو دوسرا بنچ پر رکھے مونگ پھلی کھا رہی تھی۔ اس کی ہنسی تھی تو میرے ہی اوپر لیکن اس میں اس بات کا غیر شعوری احساس بھی تھا کہ مجھے ان لوگوں نے اپنی عمر اور اپنے مذاق کا تسلیم کر لیا ہے۔

اس سے مجھے عجیب خوشی ہوئی۔ کیونکہ بیس سال سے تو میں یہ دیکھتا آ رہا تھا کہ میرے اسٹوڈنٹ لڑکے یا لڑکیاں کلاس یا ریسورانٹ میں بیٹھے ہنس رہے ہیں قہقہے لگا رہے ہیں اور ادھر ان لوگوں نے

مجھے دیکھا اور ادھر ایسا سناٹا چھا گیا گویا بم گر پڑا۔
ان لوگوں کا سناٹا مجھے ایسا بے جگر بنا دیتا تھا کہ میں جلد سے جلد ان لوگوں سے بھاگ کھڑا ہوتا تھا۔ میں سوچا کرتا تھا کہ یہ نوجوان لڑکے اور لڑکیاں آپس میں کیا باتیں کرتے ہیں۔ آج میں نے اپنے پلاسٹک آپریشن کے بدولت دیکھ بھی لیا اور سن بھی لیا کہ یہ باتیں کیسی ہوتی ہیں۔
شیلا میرے اوپر ہنسی۔ ہنس کر اس نے مونگ پھلی کی پڑیا سب کی طرف بڑھائی۔ سب کے بعد میری طرف بھی بڑھائی۔ میں اس نوجوان صحبت میں ابھی پوری طرح کھپ نہیں پایا تھا۔ اس عنایت سے گھبرا گیا۔ کیونکہ ایسا لگا کہ گویا شیلا میری ہمت افزائی کر رہی ہے۔ میں گھبرائے ہوئے لہجے میں کہنے لگا۔
"نہیں نہیں شکریہ شکریہ"
اس کے آگے میری زبان نہیں چلی۔ گھبراہٹ بہت واضح تھی۔ ایک لڑکے نے ذرا شوخی اور رقابت کے لہجے میں کہا
"ہاں ہاں شیلا ذرا اصرار بھی کرو"
اس پر سب لڑکے ہنس دئے اور شیلا چڑ گئی اور تیکھے لہجے میں کہنے لگی
"اب ایسا بھی نہیں کہ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔"
"صفائی کی ضرورت نہیں"
میں نے محسوس کیا کہ ان فقروں میں بھی میں ہوں۔ کیونکہ سب لڑکوں نے مجھے نظر بھر کر دیکھا! اور شیلا نے میری طرف سے ذرا سا رخ بدل لیا۔ اس کی جین بہت کسی ہوئی تھی اس کے رخ بدلنے سے ران کی ساخت بہت نمایاں ہو کر میرے سامنے آ گئی۔ لڑکے بھوکی نظروں سے اسے دیکھنے لگے۔
ایک بولا
"یہ جین بہت بڑھیا ہے"
"خوشامد ہو رہی ہے"
"ہاتھ پھیر کر دیکھ لو"
شیلا کے چہرے پر یہ سن کر ذرا بھی ناپسندیدگی کے آثار نہیں آئے۔ کوئی اسٹیشن قریب آ رہا تھا اور گاڑی دھیمی ہو کر پٹریاں بدل رہی تھیں اس وجہ سے اس میں جھٹکے لگ رہے تھے۔ اور

شیلا ڈگمگا رہی تھی جس لڑکے نے جین کی تعریف کی تھی اس نے شیلا کے کولہے پر اس طرح ہاتھ لگایا گویا ان کو ڈگمگاتے دیکھ کر اسے سہارا دے رہا ہے اور پھر کہا کہ بیٹھ جاؤ نہیں تو میرے اوپر گر پڑو گی۔

شیلا کو لڑکے کا ہاتھ برا نہیں لگا۔ بلکہ کچھ اچھا ہی لگا کیونکہ اس نے ذرا زیادہ رضامندی والی "ہوں" کی اور پھر بیٹھنے لگی۔

تو اس طرح یا تو واقعی ڈگمگا کر یا جھٹکے کا بہانہ کر کے اس لڑکے کی گود میں آتے آتے رہ گئی۔ لڑکے نے اس کی کمر کو سہارا دے کر بٹھا لیا۔

"پیارا" والا لڑکا کہنے لگا

"شیلا گرتی ہے تو بے جگہ نہیں گرتی"

شیلا نے گرم نظروں سے اس کی طرف دیکھا "تم سے مطلب"

"مطلب یہ کہ ادھر بھی تو گر سکتی تھیں تم" لیکن ایسا نہیں ہوا"

اس نے میری طرف اشارہ کیا تھا۔ شیلا نے پھر ہمت افزائی کی نظروں سے مجھے اور کڑی نظروں سے پیارا کو دیکھا۔ پھر مونگ پھلی کھانے میں مصروف ہو گئی۔

اسٹیشن آ گیا اور سب اسٹوڈنٹ پھرتا مار کر دروازے کی طرف بھاگے۔ اندر آنے والوں اور باہر جانے والوں میں ذرا ریل پیل ہوئی۔ اس حالت میں میں نے دیکھا کہ لڑکوں نے بہانے کر کے لڑکیوں کو اپنے سے چپٹا دیا۔ اور لڑکیوں کو بھی اس پر کوئی اعتراض نہیں ہوا۔ بلکہ وہ اور ان کی طرف کھسک گئیں۔ اور شیلا تو اپنے دوست سے بالکل سٹ گئی۔ یہ ہے موجودہ نسل۔

نوجوانوں کے جانے کے بعد میرا دماغ ان باتوں پر جو دیکھیں اور سنیں تھیں تبصرہ کرنے لگا چھیڑ چھاڑ اور جنسی مذاق تو پرلطف تھا۔ لیکن یہ سستے جنسی جذبات کالج کے لڑکے اور لڑکیوں میں عشق و عاشقی تو میرے زمانے میں بھی ہوتی تھی اور میں خود بھی اس میں مبتلا ہو چکا تھا لیکن ان میں بھی رکھ رکھاؤ ہوتا تھا۔ آج جو نظارہ میں نے دیکھا اس میں سستاپن ہی نہیں بلکہ بھونڈاپن اور ننگاپن بھی تھا۔ اب میں سمجھا کہ مجھے دیکھ کر نئی نسل کے لوگ خاموش کیوں ہو جایا کرتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ وہ ایسی باتوں کو میرے سامنے کرنے سے رہے۔

میں جو سینگ کٹا چکا ہوں ان بچھڑوں میں سما سکتا ہوں۔ کھپ سکتا ہوں۔

پلاسٹک آپریشن کراتے وقت تو یہ بات میرے دل میں دور دور تک نہیں تھی کہ میں جوان بنکر لونڈوں میں کھپ جاؤں۔ میں تو بس یہ چاہتا تھا کہ اگر تیس پینتیس برس کی کسی لڑکی سے شادی کرلوں تو لوگ یہ نہ کہیں کہ بیٹی کے برابر بیوی لے آئے۔ اسی لئے نوجوانوں کے اس ہنگامے نے میرے اس احساس کو جو آپریشن کی خوشی تھی ذرا بھی نہیں بگاڑا۔ میں پھر ریل کی کھڑکی میں اپنے دمکتے نوجوان چہرے کو دیکھنے لگا۔ لیکن اب میرے لبوں پر مسکراہٹ نہیں تھی کیونکہ میرے دماغ میں ایک طرف نئی نسل کے جنسی جذبات کا ننگا پن تھا اور دوسری طرف یہ کہ وہ بسوں کو جلا رہے ہیں اور لیبورٹریاں کو برباد کر رہے ہیں۔ میں سوچ رہا تھا کہ ان باتوں میں ایک اندرونی ربط ہے مگر ......

میں ابھی کسی نتیجے پر نہیں پہنچا تھا کہ جی چاہ رہا تھا کہ کوئی سنجیدہ شخص اپنا ہم سن ملتا تو اس سے تبادلۂ خیال کیا جاتا۔

گاڑی چلنے کو ہی تھی کہ ڈبے میں ایک ادھیڑ عمر کی موٹی بھدّی سی خاتون گھسیں بھاگنے کی وجہ سے ان کی سانس چڑھی ہوئی تھی۔ ان کے ساتھ ایک کھدر پوش اور ایک قلی بھی آئے۔ کھدر پوش نے قلی سے لے کر خاتون کا سامان جلدی جلدی لگایا، ہاتھ میں گیندے کا ایک ہار تھا وہ خاتون کے برابر سیٹ پر رکھا اتنے میں گاڑی رینگنے لگی' انھوں نے خاتون کو سلام کیا اور جلدی سے اتر کر رخصت ہوگئے۔

گاڑی تیز ہوگئی۔ خاتون نے اپنا سامان درست کیا۔ آرام سے بیٹھیں اور پھر اپنے ڈبے کے مسافروں پر نظر ڈالی۔ مسافر سب بے تعلق تھے۔ کوئی اونگھ رہا تھا تو کوئی وقت گذاری کے لئے کسی سے ادھر ادھر کی باتیں کر رہا تھا۔ خاتون کی اور ان کے ہار کو صرف میں دیکھ رہا تھا کیوں کہ میں یہ پوچھنے کی کوشش کر رہا تھا کہ یہ کوئی لیڈر ہیں جو کسی کانفرنس سے آرہی ہیں۔۔۔ یا سرکاری افسر ہیں جن کا تبادلہ ہو رہا ہے۔ کیا ہیں۔ لیکن ساتھ ساتھ ایک بات اور تھی جو دل کی گہرائیوں میں چٹکیاں لے رہی تھی۔ وہ یہ کہ یا تو میں نے ان خاتون کو کہیں دیکھا ہے یا ان کے اندازیا چہرے میں کوئی ایسی چیز ہے جو میرے کسی عزیز یا دوست سے ملتی جلتی ہے۔

خاتون نے جب مجھے اس طرح اپنی طرف دیکھتے ہوئے دیکھا تو یہ کہنے لگیں۔

"کیوں صاحبزادے کیا یہ ہار پسند آرہا ہے۔ لے لو میرے کس کام کا ہے۔ کسی کو تحفے میں دے دینا"

تحفہ۔ کہتے وقت ان کے ہونٹوں اور لہجے میں ذراسی چھیڑ تھی۔ لیکن میرا دھیان اس پر نہ جا سکا

اور لفظ صاحبزادے پر چلا گیا۔

یہ لفظ برسوں کے بعد اپنے لئے سنا تھا۔ یہ سن کر ذرا بے چینی محسوس ہوئی۔ ذرا مسرت ہوئی۔

" جی ہاں کچھ ضرورت نہیں ہے۔ میں تو اس سے یہ اندازہ لگا رہا تھا کہ آپ شاید کسی کانفرنس سے آرہی ہیں"

" ٹھیک سمجھے تم۔ یہاں تو زندگی کٹتی ہے کانفرنسوں میں۔ چند سال پہلے تو میرے ساتھ ایک ڈھیر چلتا تھا یاروں کا، لیکن اب لوگ سچی بات سنتے کہاں ہیں۔ اب تو ان کو مزا آتا ہے لچھے دار باتوں میں جو آج کل کے لیڈر دیتا تے ہیں۔ میرا بس تو اب یہ تھا کہ گوشے میں بیٹھ کر اوپر والے کو یاد کرتی۔ لیکن کیا کروں بیٹا تم نئی نسل والوں کی فکر چین نہیں لینے دیتی۔ دیکھتی ہوں کہ تم لوگ دن بدن برباد ہوتے جا رہے ہو"

نئی نسل کے بارے میں میں سوچ ہی رہا تھا اور اس پر تبادلۂ خیال بھی کرنا چاہتا تھا لیکن خاتون کی زبان سے جو یہ قطعی فیصلہ سنا تو اتفاق کرنے میں ذرا سا تکلف ہوا۔

اتفاق نہ کرنے میں ایک وجہ یہ بھی ہوئی کہ اگر یہ خاتون اتنی بڑی ہی لیڈر ہوتیں تو کبھی نہ کبھی کسی نہ کسی اخبار میں فوٹو میری نظر سے گذرتا۔ میں نے کھٹکتے ہوتے لہجے میں پوچھا۔

" برباد کیونکر"

" پوچھتے ہو برباد کیوں کر ۔۔ یہی تو بات ہے تم لوگوں کو اپنی حالت کا ذرا بھی اندازہ نہیں۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ جہاں کی نسل کا یہ حال ہو اس ملک کا کیا حشر ہوگا۔ نہ اخلاق رہا نہ آداب نہ وفاداریاں نہ خدمت قوم کا جذبہ"

لیڈر صاحبہ کے اونچے لہجے نے مجھے ان کی رائے سے اور دُور کر دیا۔

" یہ سب کچھ تھا آپ کے زمانے میں"

" یہ بھی کوئی پوچھنے والی بات ہے۔ اخلاق نہ ہوتا تو ہم ملک کو کیسے آزاد کرا سکتے تھے"

یہ جوش، یہ باتیں کرنے کا انداز، یہ کھنک ان باتوں کو کہیں دیکھا ضرور ہے۔ کس میں۔،

ان اندرونی سوالوں سے بے چین ہو کر میں نے پوچھ لیا

" آپ کا دولت خانہ کہاں ہے"

میرے اس بے محل سوال سے کھٹک کر خاتون نے پوچھا:

"کیوں یہ بے محل سوال کیسا۔"

ان کی کھٹک پر خیال آیا کہ اس ڈھنگ سے تو یہ سوال اس وقت پوچھتے ہیں جب کسی پر چوٹ کرنا ہو۔ تم شاید احمقوں کی دنیا سے آرہے ہو۔ میں نے گھبرا کر کہا کہ معاف کیجئے گستاخی مقصود نہیں، میں نے آپ کو کہیں دیکھا ہے۔

"ضرور کہیں دیکھا ہوگا میں تو ہندوستان بھر میں بیس سال سے ملک کی خدمت کے سلسلے میں گھوم رہی ہوں۔ میری پیدائش اور تعلیم تو لکھنؤ میں ہوئی تھی پھر بمبئی آگئی۔ اور نان کوآپریشن کے زمانے میں آزادی کی تحریک میں شامل ہوگئی۔"

یہ لیجیے۔ لکھنؤ سے بمبئی۔ اچانک میرے دماغ میں کرنٹ دوڑ گیا۔ اچھا تو یہ تم ہو۔ کیسے پتھر پڑگئے تھے میری یادداشت پر کہ تم کو نہ پہچان سکا۔ تم اور اخلاق کی باتیں۔ تم۔

عجیب عالم بیت گیا میرے اوپر۔ میں نہ جانے کتنے سمندر، پہاڑ اور ریگستان پار کر کے تینتیس سال پہلے کی دنیا میں پہنچ گیا۔ جبکہ میں ناتجربہ کار بر خود غلط چھوکرا تھا اور دنیا میرے لئے قوس قزح کے رنگوں میں لپٹی ہوئی امیدوں کی سرزمین تھی۔ لیڈر صاحبہ بولے چلی جارہی تھیں۔

"بیٹا اس تقریر پر مجھے جیل ہوگئی ------"

تو کیا بدل گیا ہوں میں پلاسٹک آپریشن کے ذریعہ کہ جو عورت میری عاشق اور معشوقہ اور بیوی رہ چکی ہے وہ سمجھ رہی ہے کہ میں اس کے بیٹے کے برابر ہوں۔ عورت میرے چہرے کو دیکھ کر کہنے لگی کہ

"معلوم ہوتا ہے کہ اس وقت تم محسوس کر رہے ہو کہ ہمارے اور تمہارے زمانے میں کتنا فرق ہے۔ وہ تھا ست جگ اور یہ ہے کل جگ ----"

کیا وہ ست جگ تھا۔ جب اس عورت نے میرے ساتھ بے وفائی کی تھی۔ کیسی چال بازی کی تھی۔ میں اس کو کلاس میں چھپی چھپی نظروں سے مہینوں تاکا کرتا تھا۔ مگر اس نے کبھی لفٹ نہیں دیا۔ پھر اچانک مجھ پر مہربان ہوگئی۔ پہلے نظروں کا نظروں سے جواب دیا، پھر تبسم اور گفتگو اور پھر — یہ سارے مراحل ایک ہی ہفتے میں طے ہوگئے اور وہ بالکل میری ہوگئی۔ غیر مذہب والے سے شادی کرنے پر تو میرے باپ کبھی راضی نہیں ہوسکتے تھے پھر کیا کروں، بمبئی لے چلو، میں بالغ ہوں،

وہاں سول میرج کر لیں گے۔"

پھر نے گیا میں اس کو بمبئی۔ کیسے گذرے ہیں وہاں دو مہینے۔ معلوم ہوتا تھا کہ سہانے سپنوں میں زندگی بیت رہی ہے۔ اچانک لیڈی ڈاکٹر نے کہا۔ "پانچ مہینے کا حمل ہے"۔ پانچ مہینے کا۔ پانچ مہینے کا۔"

"سارے سپنے بالو کے گھروندے کی طرح ٹوٹ گئے۔ پیارے میں نے جان بوجھ کر دھوکا نہیں دیا۔ ایک غلطی ہو گئی تھی ضرور لیکن مجھے یہ نہیں معلوم تھا کہ یہ بھی ہے۔"

"مگر پرایا بچہ میں برداشت نہیں کر سکتا۔"

میں سمجھتی ہوں یہ سمجھ لو کہ جو ہو گیا سو ہو گیا۔ اب تو میں تمہاری ہوں، زندگی بھر رہوں گی۔

"پھر میں کیا کروں" "سنو وہ فلم والا ہمارا دوست ہے۔ اس سے مدد مانگو۔ فلمی دنیا میں ابارشن کا کاروبار خوب ہوتا ہے۔"

فلم والے سے ملنا اتفاقاً کسی بس پر ہو گیا تھا۔ اس وقت اس عورت نے دوستی پیدا کر لی، اور پھر بڑھالی۔ اس وقت مجھے ایسا لگا کہ جیسے یہ دوستی کسی منصوبے کے ماتحت ہوئی ہے۔ میں نے فلم والے سے مدد مانگی اور اس نے خوشی سے اور آسانی سے فراہم بھی کر دی۔

کیسے عالم سے گذرا ہوں میں اُن دنوں۔ ایک طرف زندگی میں پہلی مرتبہ خلاف قانون کام کر رہا تھا اس سے پولس سے دہشت۔ اور دوسری طرف نامعلوم رقیب سے شدید نفرت۔ پھر اپنی محبت کی ناکامی پر کوفت۔ یہ احساس کہ اپنے ماں باپ اور اپنے خاندان اور تعلیم کو چھوڑا جس کے لئے اس کی وفا مشکوک۔

سو ہائے جنت جسے سمجھا تھا جہنم نکلا۔

"جب یہ عورت اباارشن سے تندرست ہو کر نکل آئی تو فلمی دوست سے پینگیں بڑھانے لگی۔ یہ کیا" "پیارے فلمی دنیا میں قدم ٹکانے کو بھی جگہ مل گئی تو تم لکھتے ہو جاؤ گے لکھ پتی۔ پھر ہم دونوں مزے کریں گے مزے۔"

"مگر وہ کام کیا کرتا ہے فلم میں آج تک نہیں کھلا" "کرتا ہے بے حد اہم کام میں نے تحقیق کر لی ہے۔"

یہ عورت اس فلمی بدمعاش کے ساتھ گھومی گھومی پھرتی تھی اور پیسے کی اس کے پاس افراط رہتی تھی۔ لوگ مجھ پر
انگلیاں اٹھاتے کہ ان لوگوں میں ہوں جو اپنی عورت کی کمائی کھاتے ہیں۔

ایک رات چار بجے میرے گھر پر پولس اچانک آ گئی۔ معلوم ہوا کہ فلمی دوست اور میری بیوی نے ایک جعلی
چیک بھنا لیا ہے۔ پھر مقدمہ چلا اور معاملہ بالکل صاف تھا اس لئے اس کو سزا ہو گئی۔

پھر میں نے کسی عورت کی طرف نہیں دیکھا۔ اب جب سن ۵۵ کا ہو گیا تو تنہائی ناقابل برداشت ہو گئی۔
میرے دوست ڈاکٹر نے کہا اگر تم کو یہ احساس ہے کہ اس عمر میں شادی "بوڑھا گھوڑا لال لگام ہو گی تو پلاسٹک
سرجری کرا لو" کافی تذبذب کے بعد میں تیار ہو گیا عجب اتفاق ہے کہ جوان چہرہ ہاتھ لگا تو یہ پھر آدھمکی۔

عورت کی تقریر چل رہی تھی۔ قوم کی خدمت کا کچھ ایسا شوق تھا کہ میں ۴۲ء میں پھر جیل گئی ......

"کرائم کیا مطلب ہے تمہارا"

دوسری بار کون سا کرائم کیا تھا آپ نے ——

یہ سوال بے اختیار میری زبان سے نکل گیا تھا۔ اگر میں ماضی میں اتنا کھویا ہوا نہ ہوتا تو یا تو یہ سوال
پوچھتا ہی نہیں یا پوچھتا تو دوسرے انداز سے۔

عورت کی آواز میں کھنک کی جگہ کھٹک اور غصہ آ گیا تھا "کیا بک رہے ہو صاحبزادے"
"بگڑو نہیں ایک بات پوچھ لی"

پھر میں نے بے تکلفانہ لہجے میں ذرا اونچے سے کہا
بات یہ ہے کہ آپ غصہ میں شاندار لگتی ہیں اس لئے میں نے کرائم کہہ دیا ۔ میرا لہجہ، تیور اور
بات کرنے کی سطح میں اچانک کچھ ایسی تبدیلی آ گئی تھی کہ لیڈر صاحبہ گھبرا کر میری نظروں کو ٹٹولنے لگیں۔
تم شاندار لگتی ہو ...... سچ ..... ہوں۔ ہاں۔ کیا کہہ رہی تھی میں۔ کچھ پوچھ رہی تھی شاید ہاں یاد آ گیا
کہ رہی تھی کہ مجھے آپ سے مل کر بہت خوشی ہوئی۔ آپ کا اسم شریف۔ اور کہاں ہے آپ کا دولت خانہ"

اس کے لہجے میں گھبراہٹ بھی تھی اور رکاوٹ بھی ۔ توبہ ہے میری محبوبہ جس کے پیچھے میں نے اپنی
ساری جوانی برباد کی۔ کتنی ادھی اور کتنی جھوٹی۔ کتنا احمق ہوں میں بھی۔ ایسی ذات سے محبت کا کیا سوال ۔
بادحرت نفرت بھی تو نہیں کی جا سکتی ہے۔ کچلی ہوئی چھپکلی —— اتنے میں اسٹیشن آ گیا۔

"معاف کیجئے گا، مجھے یہیں اترنا ہے"

بلا سلام کئے پیٹھ موڑ کر میں گاڑی سے اتر آیا۔ اور منہ کا مزہ درست کرنے کے لئے ایک میٹھا پان لیکر کھایا۔

رضیہ فصیح احمد

اڑان

قبرستان کی دیوار کے نزدیک ایک خاموش سایہ سا کھڑا تھا۔ نزدیک سے گزر ہوا تو اس نے مجھے سلام کیا۔

"میں نے کبھی اس سے پہلے آپ کو نہیں دیکھا"

"میری قبر یہاں سے خاصی دور ہے۔ میں نے سوچا کوچ کرنے سے پہلے ایک مرتبہ سارے قبرستان کا چکر لگایا جائے۔"

"کوچ ! کہاں ؟"

"کہیں بھی، سفر ہے شرط مسافر نواز بہتیرے" جواب میں پُراسراریت سی تھی۔

"آپ کو سیر کا شوق رہا ہے ؟"

"جنوں کی حد تک"

"کون کون سی جگہیں دیکھی ہیں آپ نے" میں نے مشتاقانہ پوچھا۔

"پہلے آسمان سے لے کر پہلی پاتال تک کی ساری جگہیں۔ اس سے آگے جانے کا اتفاق نہیں ہوا۔"

"آپ خوش مذاق ہیں" میں نے ہنس کر کہا۔

"آپ کو یقین نہیں آرہا، آ بھی کیسے سکتا ہے۔۔۔ بات صرف اتنی ہے کہ مجھ میں بچپن ہی میں اڑنے کی پراسرار قوت پیدا ہو گئی تھی۔"

"معاف کیجئے تجسس میری کمزوری ہے، اگر آپ بُرا نہ مانیں تو پوچھوں کہ یہ قوت کب اور کیسے پیدا ہوئی ؟"

"لمبی کہانی ہے۔۔۔ آیئے کسی درخت کی چھاؤں میں بیٹھتے ہیں، ایک تو اس قبرستان میں

درخت اتنے کم ہیں، چلئے وہاں سہی" وہ ایک بل کھاتا، نازک سا درخت تھا ہم اس کی چھدری چھدری چھاؤں میں دو تودوں پر جا بیٹھے۔

"ہوا یہ کہ بچپن میں ایک مرتبہ ایک اونچے زینے پر سے لڑھک جانے کے سبب میرے پیروں کی ساری ہڈیاں ٹوٹ گئیں۔ اس وقت میری عمر بہت کم تھی۔ ڈاکٹروں کا خیال تھا کہ کم عمری کی وجہ سے وقت کے ساتھ ہڈیاں خود بخود جڑ جائیں گی، ان پر پلاسٹر چڑھانے کی ضرورت نہیں۔ مگر انہوں نے مجھے اسپتال میں زیر نگرانی رکھا۔ خدا کے فضل سے ہڈیاں ٹھیک ٹھاک جڑ گئیں مگر اسپتال کے قیام کے ابتدائی دنوں ہی میں شدتِ تنہائی اور اڑنے کی بے پناہ خواہش کی وجہ سے مجھ میں یہ قوت پیدا ہو گئی۔ پرندوں کی طرح اڑ کر میں نے جی بھر کر سیر کیں۔"

"خوب" میں نے اس کی بات سے مسحور ہو کر کہا۔

"آپ نے کبھی ہوائی جہاز کا سفر کیا ہے؟"

"کئی مرتبہ" میں نے کہا۔

"کیسا لگتا ہے آپ کو؟"

"اچھا، بہت اچھا۔ مجھے یاد ہے ایک مرتبہ بنگلہ دیش جاتے ہوئے ہمارا جہاز گیا شہر پر سے گزرا تھا، گیا جہاں گوتم بدھ کو گیان حاصل ہوا تھا۔ اس وقت کھڑکی سے ایورسٹ کی چوٹی بالکل سامنے نظر آ رہی تھی ہو بہو تصویر کی طرح یہ منظر میلوں ہمارے سامنے رہا، اور مجھے اتنا لطف آیا کہ بیان سے باہر۔"

"بالکل ٹھیک! آپ کو تو تجربہ ہے۔ کیسی ساری زمین آنکھوں کے سامنے پھیل سی جاتی ہے۔ ہر چیز آپ بہ یک وقت دیکھ رہے ہیں۔ پہاڑ بھی، دریا کے چوڑے چوڑے پاٹ بھی، میدان بھی، سڑکیں بھی اور آتے جاتے شہر بھی۔ اس سے بھی بلندی پر ہوں تو ساری دنیا یوں نظر آتی ہے کہ یہ امریکہ ہے یہ یورپ یہ بحر اوقیانوس ہے اور یہ بحر الکاہل اور یہ ننھا سا نقطہ انگلستان، اور یہ پاکستان۔"

"مگر اتنی بلندی سے یہ سب دیکھنے کے لئے تو بہت تیز نگاہوں کی ضرورت ہوگی؟"

"ہم ہر چیز آنکھوں ہی سے تو نہیں دیکھتے، بہت کچھ اپنے جانے بوجھے علم اور تجربے

سے بھی تو دیکھتے ہیں۔ دیکھنے اور پہچاننے میں تو فرق ہوتا ہے۔"

"آپ نے درست کہا۔" میں نے جواب دیا۔

"آپ کو اندازہ نہیں ہو سکتا کہ یہ قوتِ پرواز بذاتِ خود کتنی خوبصورت چیز ہے۔ میری تو خواہش ہے کہ ہر انسان کو یہ طاقت مل جائے۔"

"ایک بات تو بتائیے کہ جب آپ نے اپنی اس پُراسرار صلاحیت کا ذکر دوسروں سے کیا تو انھوں نے کیا کہا؟"

"شروع میں تو میں نے اس بات کا ذکر کسی سے نہیں کیا۔ باوجود کم عمری کے مجھ میں یہ عقل تھی کہ دوسرے لوگوں کے لئے اس بات کو سمجھنا آسان نہیں ہوگا۔ ایسا نہ ہو کہ ڈاکٹر مجھے گھر جانے کی اجازت ہی نہ دیں۔ آخر ڈاکٹر مطمئن ہو گئے اور مجھے گھر بھیج دیا گیا۔ مگر جب میں نے اپنی پروازیں شروع کیں تو امی کو کچھ شبہ ہو گیا۔ وہ مجھ سے اکثر کہا کرتیں "ضرور تمہارے دل میں کوئی بات ہے، مجھ سے نہ چھپاؤ، میں تمہاری ماں ہوں۔" میں نے انہیں سالوں ٹالا مگر ایک دن ان کے اصرار پر میں نے ساری بات انہیں بتا دی۔ ہوا وہی جس کا ڈر تھا۔ وہ رونے لگیں اور بلک بلک کر کہنے لگیں۔

"مجھے پہلے ہی شک تھا کہ کچھ گڑبڑ ضرور ہے مگر ڈاکٹر مانتا ہی نہ تھا، ہائے اب کیا ہوگا۔"

میرے احتجاج کے باوجود وہ مجھے ڈاکٹر کے پاس لے گئیں۔ اس نے مجھے دوبارہ ہسپتال میں داخل کیا، سینکڑوں ٹسٹ ہوئے اور نہ جانے کتنی دوائیں دی گئیں۔ ڈاکٹر سے میری مستقل بحث ہوتی کہ اڑنے کی قوت بیماری نہیں ہو سکتی مگر وہ بالکل ٹس سے مس نہ تھا۔ مجھے تو وہ ذہنی بیمار لگتا تھا۔ اس کے لئے ان باتوں کو سمجھنا واقعی مشکل تھا۔ وہ تو وہ امی جب بھی میری سیر کے قصے سنتیں فوراً رونا شروع کر دیتیں۔ آخر میں نے بہانہ سازی شروع کی، گویا مجھے علاج سے فائدہ ہو رہا ہے۔ اسپتال کے کمرے میں تنہا رہتے ہوئے مجھے یوں تو پرواز میں آسانی ہو گئی تھی۔ لیکن اوقات رات رات بھر میری سیریں جاری رہتیں مگر اب ان کے بارے میں کسی کو کچھ نہ بتانا میری عادت ہو گئی۔ امی کو پتہ چلا کہ میری پرواز کی قوت

یا دوسرے الفاظ میں میرا وہم ختم ہوگیا ہے تو انہوں نے سُکھ کا سانس لیا۔ ان کا خیال تھا کہ انسان وہی ہے جو دو ٹانگوں پہ چلے، اڑنے والا انسان نہیں ہو سکتا۔

ڈاکٹر بھی جلد مطمئن ہوگیا اور اس نے مجھے دوبارہ اسپتال سے جانے کی اجازت دے دی۔

اب امی نے میرے لئے ایک ساتھی کی تلاش شروع کردی۔ بندھن میں باندھے جانے سے پہلے انہوں نے مجھے سمجھایا کہ دیکھو اپنے اڑنے وڑنے کی بات کسی سے نہ کرنا۔ میری بات یاد رکھنا ورنہ پچھتاؤ گے، ساری عمر تمہارا پیچھا کریں گے اور بگڑی بات پھر نہ بن سکے گی۔ میں نے امی کے کہنے پر عمل کیا، اڑنے کی بات چھپانے کی تو یوں بھی مجھے عادت ہو گئی تھی۔ میں نے پہلے کی بہ نسبت اپنی پروازیں بھی بہت کم کر دیں، پھر بھی امی کی طرح ساتھی کو بھی کرید لگ گئی کہ مجھ میں کوئی کمی یا زیادتی ضرور ہے۔ ایک رات اس نے اپنے بندھن کے واسطے دے کر کہا۔

" دیکھو ساتھیوں میں کوئی بھید بھاؤ نہیں ہونا چاہیئے، ساتھی وہ ہوتا ہے جو اچھے کا بھی ساتھی ہو اور بُرے کا بھی۔ تم مجھ سے کوئی بات قطعی نہ چھپاؤ۔"

میں نے اسے ساری بات بتادی۔ اس نے سب کچھ بڑے صبر و تحمل سے سنا اور کچھ نہ کہا..... مگر رفتہ رفتہ مجھے اس کے رویئے میں فرق محسوس ہونے لگا جیسے پانی کا جہاز چلنا شروع ہو تو احساس نہیں ہوتا مگر کنارہ دیکھ کر پتہ چلتا ہے کہ وہ کتنی دور نکل آیا ہے، اسی طرح غیر محسوس طور پہ ہمارے درمیان فاصلہ بڑھتا رہا۔ دن گزرتے رہے یکسانیت سے اکتا کر میں نے اس سے کئی دفعہ کہا۔

" کچھ تم بھی تو اپنے قصے سناؤ۔ کوئی آپ یا جگ بیتی، پرانے سوز ساز کی، گئی رُتوں کی باتیں۔ ہم ایک دوسرے کے ساتھی ہیں۔ تمہارا تو ایمان ہے کہ ساتھیوں میں کوئی بھید بھاؤ نہیں ہونا چاہیے۔"

اس نے جواب میں لاپرواہی سے کہا۔" میری زندگی میں کوئی ایسی بات نہیں جو بتائی جائے، وہ تو پنسل کی سیدھی سپاٹ لکیر کی طرح ہے جس میں نہ کوئی دلکشی ہے نہ رنگ۔"

چند دن بعد ہی کی بات ہے، میری نیند ہمیشہ بہت گہری ہوتی تھی۔ خدا جانے اس رات کیسے میری آنکھ کھل گئی۔ میں نے دیکھا کہ سونے سے پہلے ساتھی نے اپنے چہرے سے ایک ماسک

اُتار کر الگ رکھ دیا۔ اس کے چہرے پر مندمل زخموں کے بے شمار نشانات تھے جو اتنے عرصے اس نے ماسک کے پیچھے چھپائے رکھے تھے۔ اس کی زندگی سیدھی سپاٹ لکیر نہیں ہو سکتی، اس میں ضرور کوئی راز ہے جو اس نے اب تک چھپا رکھا ہے، کیوں؟ یہ کیوں مجھے گھلانے لگی۔

اس واقعہ کے بعد اس خول چڑھے چہرے کی میٹھی میٹھی باتیں مجھے زہر لگنے لگیں۔ جی چاہتا فوراً وہ نقاب اس کے چہرے سے نوچ کر پھینک دوں مگر میں نے ضبط کیا..... یہ کام آسان نہیں ہے۔ ضبط آدمی کو دو نیم کر دیتا ہے۔ کیا کبھی آپ نے غور کیا ہے کہ ضبط کرنے سے نفرت کرنا آسان ہے !!! نفرت ایک منفی جذبہ ہے لیکن یہ ایک سیفٹی والو (VALVE) ہے۔ آپ کے اندر ضبط کا لاوا کھول رہا ہو تو نفرت کا والو کھول دینے سے اس کی کھولن کم ہو جاتی ہے ورنہ شاید آپ زندہ بھی نہ رہ سکیں۔ میں نے بھی یہی کیا۔ جب ضبط کی کھولن ناقابلِ برداشت ہونے لگی تو میں نے نفرت کا والو کھول دیا مگر نفرت میرے مزاج کے موافق نہ تھی۔

بہت جلد میں نے فیصلہ کیا کہ کسی سے نفرت کرنے سے تو مر جانا بہتر ہے۔ آخر نفرتوں کے ساتھ جیئے جانے کا کیا جواز ہے !! سقراط نے سچائی کی خاطر زہر پیا تو کیوں نہ میں محبت اور رفاقت کی خاطر زہر پی لوں۔ یہ سوچ کر میں نے خود اپنے لئے زہر کا پیالہ بنایا۔ آپ نے سقراط کے آخری لمحات کے بارے میں ضرور پڑھا ہوگا۔ سقراط کو زہر دینے والے شخص نے کہا تھا "جب زہر دل تک پہنچے گا۔ تو کام تمام ہو جائے گا۔" اور سقراط نے کہا تھا "زہر پینے میں وہ لوگ دیر کرتے ہیں جنہیں اس سے کوئی فائدہ ہو مگر میرے دیر کرنے سے کوئی فائدہ نہیں۔ اس کو مر جانے کی جلدی تھی، تبھی اس نے فوراً زہر کا پیالہ ہونٹوں سے لگا لیا اور ایک ہی سانس میں سارا زہر چڑھا لیا۔ جس وقت سقراط نے زہر پیا اس کے پاس اس کے دوست اور غم گسار تھے جو اس کی موت سے سخت دل گرفتہ تھے اور پھوٹ پھوٹ کر رو رہے تھے مگر میرے پاس کوئی بھی نہ تھا سقراط کو اپنی دوسری زندگی کا کیسا یقین تھا...... وہ وہاں بھی ایسے ہی پھٹے پرانے کپڑے پہنے ننگے پاؤں، سچائی کی تلاش میں لوگوں سے سوال کرتا پھرے گا تب اسے مرنے کا کیا غم !!! مگر میں نے اپنے لئے جو زہر تیار کیا تھا وہ سقراط والا زہر نہیں تھا۔ یہ وہ زہر نہیں تھا جس سے پٹ سے آدمی مر جاتے..... جب زہر دل تک پہنچے تو اس کا خاتمہ ہو جائے۔ یہ وہ زہر تھا جو مجھے پینا

تھا اور پھر.... تمام عمر اس کے اثر سے زندہ رہتا تھا۔ یہ جھوٹ، مصلحت آمیزی اور زمانہ سازی کا زہر تھا۔ یہ وہ زہر تھا جو دن میں مجھے ہزار بار مارتا، میری پور پور رگ رگ میں سما جاتا تب بھی مجھے موت نہ آتی۔"

"تو کیا آپ نے وہ زہر پی لیا"؟

"جی ہاں، میں نے وہ زہر گھونٹ گھونٹ کر کے پیا۔ یقین کیجئے اس کا ایک ایک قطرہ نشتر بن کر لگ رہا تھا۔"

"پھر.... پھر کیا ہوا؟" میں نے بے تاب ہو کر پوچھا۔

"نفرت کا جو زہر میرے اندر موجود تھا وہ اس قدر تیز تھا کہ یہ زہر جو میں نے پیا کارگر نہ ہوا۔" اس نے ٹھنڈا سانس لیا۔

"پھر..؟" مجھ سے پوچھے بغیر نہ رہا گیا۔

"پھر میرے ذہن میں ایک خیال آیا کہ اگر ابھی میری قوت پرواز باقی ہے تو کیوں نہ میں ایک آخری کوشش کروں اور اس کے بل پر دور، بہت دور.... زمین کی کشش سے باہر نکل جاؤں اور پھر کبھی لوٹ کر نہ آؤں۔ ایسی ہی رات تھی جب کسی کو کچھ بتائے بغیر میں نے گھر کی چھت پر سے اپنی پرواز شروع کی لیکن زہر کے اثرات سے میری قوتِ پرواز میں ضرور کوئی خلل واقع ہو گیا ہو گا اور میرا جسم راہ ہی میں بھاری پتھر کی طرح دھم سے گر گیا ہو گا کیوں کہ جب میری آنکھ کھلی تو میں نے خود کو قبر کے اندھیرے میں پایا۔"

"تو اب آپ کا کیا ارادہ ہے"؟ میں نے پوچھا۔

"میری طبیعت اس ماحول سے اکتا گئی ہے، میرا ارادہ ہے کہ اب یہاں سے بھی کوچ کیا جائے۔"

"کہاں؟"

"کہیں بھی، مجھے یقین ہے کہ اب میری قوتِ پرواز بحال ہو گئی ہے۔"

یہ کہتے کہتے اچانک اس نے اپنے دونوں بازو پھیلائے اور ہوا میں اڑنا شروع کر دیا۔ میں نے حیران ہو کر چاروں طرف دیکھا۔ گہرے کاسنی آسمان پر نارنجی چاند ترازو کا پلڑا

بنا ہوا ہیں جھول رہا تھا۔ دور آسمان پر ایک نقطہ اب بھی اڑا چلا جا رہا تھا۔ اس طرف سے نگاہ ہٹا کر جب میں نے نیچے دیکھا تو ایک سایہ قبرستان کی دیوار کے پاس اب بھی موجود تھا اور قبرستان کا ماحول بے حد بوجھل بوجھل تھا۔

نئی کتابیں

جھیل اور جھرنے :۔ کہکشاں ملک کے ایسے افسانوں کا مجموعہ ہے جس میں کشمیر جنت نظیر کا سارا حسن اور سارا کرب سمٹ آیا ہے۔ قیمت ۱۵ روپے

استفادہ :۔ عتیق احمد کے تنقیدی اور تجزیاتی مضامین کا مجموعہ ہے جو مصنف کی نقادانہ بصیرت اور فکری رجحان کو نہ صرف واضح کرتا ہے بلکہ ملکی اور غیر ملکی ادب سے اس کی محبت اور دلبستگی کا ایک بلیغ اشاریہ بھی ہے۔ قیمت ۲۱/-

وقت کی دہلیز :۔ زیتون بانو کی پشتو کہانیوں کے تراجم کا دوسرا مصور مجموعہ جو مصنفہ کے معاشرتی اور سماجی سوجھ بوجھ کا آئینہ دار بھی ہے اور جس میں صوبہ سرحد کے غیور اور جفاکش فرزندوں کے رومانی اور نفسیاتی مسائل کی عکاسی بھی ملتی ہے۔ قیمت ۲۵/- روپے۔

انتخاب قند :۔ مرتبہ :۔ تاج سعید۔ رسالہ "قند" (مردان) میں شائع ہونے والی شعری تخلیقات کا خوبصورت مجموعہ۔ قیمت ۱۵/- روپے

ناشر :۔ مکتبۂ ارژنگ، خیابانِ بابر، نزد بوستان آباد۔ پشاور

ڈاکٹر سلیم اختر

جو جاگے ہیں خواب میں!

"ہیں خواب میں"

عجب آسیبی فضا تھی کہ فضا کم تھی کچھ اور زیادہ تھی۔ گویا غیر مرئی آنکھیں پلک جھپکے بغیر گھور رہی ہوں۔ لیکن مڑکر دیکھنے پر پھولوں میں، پتوں میں اور جھاڑیوں میں تبدیل ہو جائیں۔ شاہ بلوط کے سرکشیدہ درخت کی شاخیں بانہیں پھیلائے مکان کو اپنی پناہ میں لئے تھیں۔ ابتدائی چاندنی کی مریض روشنی میں مکان آسیب زدہ کھنڈر کی مانند اپنی خاموشی کے اسرار میں ملفوف تھا۔ لہریا یعنی پگڈنڈی پر قدم رکھا تو سانپ بھی ساتھ ہو لئے لیکن دیکھنے پر سائے میں تبدیل ہو جاتے۔ دور سے کسی گیدڑ کی آواز آئی مگر ہو سکتا ہے کہ وہ گیدڑ نہ ہو کچھ اور ہی ہو۔ لیکن جس نے راستہ کاٹا وہ بلی نہ تھی بلکہ سیہہ تھی کہ کانٹوں کے لبادہ میں بہت بچ رہی تھی۔

بے خواب کیواڑوں کے ماتھے پر زنجیر کا جھومر سج رہا تھا ایک، دو، تین اور پھر چار زنجیر کے چار حلقے جو یا جسم کے اندر تہہ در تہہ بند مساموں سے باہر آنے کے لئے پسینہ زور لگا رہا تھا مگر جسم میں بند بدبو جو راستہ نہ دے رہی تھی، جس کا بوجھ تردد بڑھتا جا رہا تھا مگر زنجیر کے لمس نے موسم تبدیل کر دیا کہ ہاتھ بڑھایا تو خنک زنجیر نے ریڑھ کی ہڈی کو سرد کر دیا۔

دستک سے شیشے میں خاموش کرچیوں میں تبدیل ہو گئی۔ مکان کے باطن میں آواز یوں گونجی گویا اندھے کنوئیں میں پتھر پھینکے جا رہے ہوں۔ اس نے ابھی تک زنجیر نہ چھوڑی تھی جو چپ چپاتے جسم میں قطرہ قطرہ تازگی منتقل کرتی جا رہی تھی۔ مگر جس کی بھی ایک اور تہہ جم گئی تھی۔

زنجیر مزید زور سے ہلانے کی مستقل مزاجی رنگ لائی۔ روشنی کی کپکپاتی لکیر گرد آلود شیشے سے طلوع ہو رہی تھی۔

زنجیر سے ہاتھ اٹھا لیا جو ٹھنڈک کو خیرات دینے کے بعد پسینہ پسینہ تھی۔ ہاتھ میں موم بتی لئے لکڑی کا دیمک کھایا چہرہ گھور رہا تھا سر پہ خشک بیلوں کا جال، چہرے پر جھریوں کی سلوٹوں میں دو گھونسلے جن سے نظریں چڑیا کے خوفزدہ بچوں کی مانند جھانک رہی تھیں۔

ساکت فضا اور دم سادھی ہوا میں موم بتی کی لو تن کر کھڑی تھی!

وہ خوش دلی سے مسکرا کر کچھ کہنے کو منہ کھولتا ہے مگر وہ اندر آنے کا اشارہ کرتا ہوا مڑ جاتا ہے گویا وہ اس کا منتظر تھا۔ موم بتی کی روشنی کے عقب میں اس کے شانے زیادہ جھکے ہوئے اور چال زیادہ بے ترتیب نظر آتی ہے۔ چوبی فرش پر قدموں کی بازگشت اور روشنی کے نیم جان دائرہ میں وہ چلے جاتے ہیں جہاں روشنی کا دائرہ دم توڑتا ہے۔ وہاں سایوں کی مانند پھیلی چوبی دیواریں اور چھت کی کڑیاں ہیں۔ بازگشت اور دائرہ سیڑھیوں پر متحرک رہنے کے بعد ایک کمرہ میں ساکت ہو جاتے ہیں۔

سر پر لٹکتی لالٹین کے سائے میں تین صورتیں گھور رہی ہیں۔ بوڑھا ان کے درمیان خالی جگہ پر بیٹھ کر سائے کے دائرے سے باہر موم بتی رکھ دیتا ہے۔ لو کی کمر میں لمحہ بھر کو خم پیدا ہوتا ہے لیکن فوراً ہی تن کر کھڑی ہو جاتی ہے۔

آنکھ سے آنکھوں کا تعارف ۔۔ لڑکی؟ غالباً جوان! پتلیوں میں موم بتی کی لو رقص کر رہی ہے۔ عورت؟ یقیناً بوڑھی۔ پتلیوں میں لو نقطہ بنی ہے۔ مرد؟ مرد کچھ کہا جا نہیں سکتا کہ نظریں چراتا ہے۔

لٹ تعارف کو منہ کھولا تو دیکھا کہ چاروں فرش پر ایک دوسرے کے ہاتھ پر ہاتھ رکھے بیٹھے ہیں۔ لڑکی، عورت، مرد اور بوڑھا۔ کھلی ہتھیلیوں کی ترتیب سے ہاتھوں کا ہیبہ بنا وہ پوچھنا چاہتا ہے مگر سب کی موجودگی سے لاتعلق ہے۔ جھجک کے بعد وہ بھی ان کے ہاتھوں پر ہاتھ دھر دیتا ہے۔ بوڑھا کھلی ہتھیلی پر موم بتی رکھ دیتا ہے۔

سر پر لٹکی لالٹین کے سائے میں پانچ ہاتھوں کی کھلی ہتھیلیاں اپنے اپنے وجود کا لمس موم بتی میں منتقل کر رہی ہیں کہ شعلہ اس کا عالم رقص میں ہے۔

شاید روح بلانے کے لئے یہ کوئی پُراسرار عمل کرنے جا رہے ہیں چنانچہ منتظر رہا کہ ابھی ٹھنڈی ہوا کے جھونکے پر سوار روح آئے گی اور ماضی کے دفینوں اور مستقبل کے خزینوں کی نشان دہی کرے گی۔ سُن رکھا تھا کہ ایسے موقعوں پر روشنی مدھم ہو جاتی ہے۔ کمرہ نامانوس خوشبو سے بھر جاتا ہے تب رقصاں ذرات سے مرتب ہونے والے ہیولی کے دائرہ میں روح نظر آتی ہے۔

کچھ بھی نہ ہوا نہ سرد جھونکا، نہ رقصاں ذرات، نہ خوشبو!

محسوس ہو رہا تھا گویا متوقع بیٹھے بیٹھے وہ خود میں غیر مرئی وجود اور رقصاں ذرات میں

تبدیل ہوتے جا رہے ہیں۔ یوں کہ اگر تیز ہوا آجائے تو انہیں اڑا کر، کھلی کھڑکی سے باہر لے جا کر بکھیر دے۔

پانچوں موم بتی کی لو پر نگاہیں جمائے بیٹھے رہے اور پھر جیسے روشنی کا دائرہ سکڑتا گیا حتیٰ کہ وہ محض ایک نقطہ بن کر رہ گیا۔ ادھر دن کے باوجود بڑھتی ذرات میں تبدیل ہو کر نقطے کے دھڑکتے دل کی تال پر رقص کر رہے تھے۔

موم بتی بجھ جاتی ہے !

وہ گویا نیند سے بیدار ہو جاتے ہیں مگر لالٹین کے دائرے میں خاموش بیٹھے جیسے دوسرے کے سانسوں کی کہانی سن رہے ہوں۔

سب اٹھتے ہیں اور خاموشی سے اپنے اپنے کمروں کا رُخ کرتے ہیں۔ بوڑھا لالٹین جس کمرہ میں لے جاتا ہے وہاں کمرے کی اپنی روشنی نہیں مگر مریض چاند کی بیمار روشنی نے اجالا منتشر کر رکھا ہے۔ بوڑھا شب بخیر کہے بغیر نکل جاتا ہے۔

بستر آرام دہ ہے مگر نیند سہمی چڑیا کی مانند قریب آنے سے کترا رہی ہے۔

" ہنوز "

نیم تاریک کمرہ میں چیزیں کم اور دن کے سائے زیادہ ہیں حتیٰ کہ بستر پر لیٹے لیٹے وہ خود کو بھی ایک سائے میں تبدیل ہوتے محسوس کرتا ہے اور جس طرح سایہ کا آشنا سایہ ہوتا ہے اسی طرح اسے محسوس ہوتا ہے کہ دروازہ کے باہر سے سایہ گزرا ہے، وہ اٹھ کر باہر آتا ہے واقعی کوئی سیڑھیاں اتر رہا ہے یہ بھی پاؤں دبا کے پیچھے اترتا جاتا ہے۔ یہ لڑکی ہے جس کی ہتھیلیوں میں موم بتی کی لو رقص کر رہی تھی وہ خاموش باغ کی روشوں پر چل رہی ہے سفید لباس پر درختوں سے آتی روشنی اور جاتے سایوں کا سفر ختم ہونے پر وہ باغ کے ایک اجاڑ گوشے میں رک کر اپنے ہاتھوں سے نرم زمین کھودنے لگتی ہے بغیر تھکے اور رکے حتیٰ کہ ایک چھوٹا سا گڑھا بن جاتا ہے، وہ لباس کی تہوں سے ایک تھیلی برآمد کرتی ہے۔ اس میں سے بیج نکال گڑھے میں ڈالتی ہے۔ جسے مٹی سے پُر کر کے ہتھیلیوں سے آہستہ آہستہ زمین تھپتھپاتی ہے، اس کے بعد لمحہ بھر ساکت کھڑی ہو کر اپنے کام کا جائزہ لیتی ہے۔ مسکراتی ہے اور پھر واپس مڑتی ہے۔ وہ جھاڑی کی اوٹ میں ہو جاتا ہے۔ وہ جب پاس سے گزری تو گنگنا رہی تھی۔

دبے پاؤں واپس آکر ابھی لیٹا ہی تھا کہ پھر ایک سایہ کھڑکی کے سامنے سے گزرا اور مارے تجسس کے یہ بھی پیچھے ہولیا۔ یہ عورت ہے جس کی پتلیوں میں لو ایک نقطہ کی مانند جمی تھی اور سیدھی وہاں پہنچی جہاں لڑکی نے گڑھا کھود کر بیج ڈالے تھے۔ عورت پانی بھر کر لائی ہے۔ اور اس گڑھے پر احتیاط سے چھڑکاؤ کرتی ہے۔ نہ اتنا زیادہ کہ بیج ڈوب جائیں اور نہ اتنا کم کہ بیج پیاسے رہ جائیں۔ ایک لمحہ کو وہ رک کر پانی سے تر گڑھے کو دیکھتی ہے جہاں سے سوندھی سوندھی بھاپ اٹھ رہی ہے مسکراتی ہے اور گھر کا رخ کرتی ہے۔

اگر لیٹنے بھی نہ پایا کہ کسی کے گزرنے کا احساس ہوا۔ یہ مرد ہے جو نظریں چراتا تھا۔ وہ لمبے لمبے ڈگ بھرتا سیدھا اسی مقام پر پہنچتا ہے۔ نرم گڑھے کی مٹی کھود کر تمام بیج باہر نکال دیتا ہے۔ یوں لگا جیسے وہ بیج پھینک دے گا، پھر ارادہ بدل کر انہیں اپنے منہ میں رکھ کر چباتا ہوا واپس مڑ جاتا ہے۔

یقین تھا کہ اب بوڑھا بھی پیچھے پیچھے آتا ہوگا۔ چنانچہ واپسی کی بجائے وہیں جھاڑی کی اوٹ میں کھڑا رہا۔ چند لمحوں بعد بوڑھا نمودار ہوتا ہے۔ وہ گڑھے کی مٹی گڑھے کو لوٹاتا ہے اور پھر ہاتھوں سے تھپتھپا کر سطح یوں ہموار کر دی گویا کبھی گڑھا تھا ہی نہیں۔

"جو جاگے ہیں خواب میں"

صبح نیچے اترا تو چاروں بیٹھے تھے اسے دیکھ کر لڑکی بولی "آپ تمام رات چلتے رہتے ہیں؟"

"ہاں" عورت بولتی ہے "میں نے آپ کو باغ میں منڈلاتے دیکھا تھا"

مرد بولا "کچھ لوگوں کو خواب میں چلنے کی بیماری ہوتی ہے۔"

بوڑھا بولا "اس عمر میں یہ مرض اچھا نہیں۔ آپ کسی اچھے معالج سے علاج کرائیے"

وہ حیرت زدہ ان کی باتیں سنتا اور سب کے سنجیدہ اور مطمئن چہرے دیکھتا ہے۔ آٹھ آنکھیں اسے دلچسپی سے گھور رہی ہیں۔ وہ کچھ کہنے کو منہ کھولتا ہے مگر پھر سوچتا ہے کہ ان کے درمیان الفاظ کا پل نہ بن سکے گا۔

اس نے باغ کا رخ کیا تو چاروں بھی پیچھے ہو گئے۔ وہ ان کا جھوٹ بے نقاب کرنے سیدھا باغ کے اس گوشے میں جاتا ہے جہاں رات بھر ناٹک ہوتا رہا۔ اس کی فاتحانہ انگلی گڑھے کی طرف اس طرح اشارہ کر رہی ہے گویا کسی مجرم کی نشان دہی کر رہی ہے۔

"اوہ یہ۔۔۔؟"

سب ہنستے ہیں۔ تب لڑکی پانچ سالہ بچی کی آواز میں بتاتی ہے "میری چڑیا مر گئی تھی اسے میں نے یہاں دفن کیا تھا۔"

اور تب اسے پہلی مرتبہ احساس ہوا کہ پرندوں کی آوازوں سے محروم باغ کے اندھے کنوئیں جیسے سناٹے کو صرف ان کی سانسیں توڑ رہی ہیں۔

آصف اسلم

یزید کی پیاس

صدیقی صاحب کو کئی دن سے بچوں کی پیاس کا خیال آ رہا تھا۔ ان کا روزانہ کا معمول تھا کہ دوپہر کو جب ان کی چھوٹی بچی کے اسکول سے واپس آنے کا وقت ہوتا تو اس کے انتظار میں دروازے پر آن کھڑے ہوتے اور گلی میں دیکھتے رہتے کہ عین دوپہر ہے، سبزی والا اپنی ترکاریاں گرمی سے بچا کر تازہ دم رکھنے کے لئے ان پر پانی کے چھینٹے دے رہا ہے اور نائی اپنی دکان کے سامنے زمین پر چھڑکاؤ کر رہا ہے، اسکول کا گھنٹہ بجتے ہی بچے خزاں کے پتوں کی طرح گلی میں بکھر جاتے، دھوپ میں تپتی سڑک پر بھاری بستے اور کتابیں اٹھائے چلتے ہوئے ان کے پھول سے چہرے کمہلا جاتے۔ اس گرمی میں انہیں کہیں پینے کا پانی نہیں ملتا۔ ان میں سے دو ایک کے پاس تھرماس تھے جن میں وہ اپنے گھروں سے ٹھنڈا پانی بھر کر لے آتے اور پی لیتے لیکن بچے صدیقی صاحب کو وہاں کھڑا دیکھ کر ان سے پانی مانگ لیتے۔ صدیقی صاحب نے کئی مرتبہ اسکول کی انتظامیہ سے جا کر بات کی کہ آپ اتنی لمبی چوڑی فیس لیتے ہیں، بچوں کے لئے پینے کا پانی بھی فراہم کیجئے، لیکن اسکول والے اگر بچوں پر پیسے خرچ کرنے لگتے تو ہیڈ مسٹریس کے گھر بکری کے گوشت کی جگہ مسور کی دال پکنے لگتی۔ محلے کے دوسرے لوگوں سے بھی کہا سنا مگر ہر ایک اپنی مصروفیتوں میں گرفتار، ان جھمیلوں میں بھلا کون پڑتا ہے اور یوں بھی اس تیز رفتار معاشرے میں جو ان چھوٹی چھوٹی باتوں پر رک کر سوچتا ہے وہ زندگی کی دوڑ میں پیچھے رہ جاتا ہے۔ صدیقی صاحب پرانی وضع کے بھلے لوگ تھے اور محلے میں نیک نفس انسان مشہور تھے۔ ایک دن وہ آپ ہی ٹھنڈے پانی کی بوتل اور گلاس لے کر باہر کھڑے ہو گئے اور بچوں کو پانی پلانے لگے۔ گرمی سے بے حال، پیاس سے بلکتے بچوں کو ان کا وجود صحرا میں نخلستان معلوم ہوا اور پیاسے مسافروں کے کارواں کی طرح پانی پر ٹوٹ پڑے۔ ذرا دیر میں بوتل خالی ہو گئی۔ اگلے دن بچے خود ہی پانی مانگنے آ گئے۔

صدیقی صاحب ایک جگ بھر کے ان کے لئے لے گئے۔ برف سا ٹھنڈا پانی کہ گلاس میں انڈیلے جانے کے بعد گلاس کی سطح کہرے جیسے بخارات سے ڈھک گئی۔ گرمی سے بچوں کے چہرے تپ کر لال بھبھوکا ہو گئے تھے، پانی پینے سے جیسے جان میں جان آگئی اور وہ ہنسی خوشی کھیلتے کودتے اپنے گھروں کی طرف بھاگ گئے۔

بچے تو پانی پی کر چلے گئے، مگر صدیقی صاحب کی بیگم دیر تک بڑبڑاتی رہیں: "اتنی مصیبتوں سے پانی بھرو، کھولاؤ، ابالو، بوتلوں میں بھرو، فریج میں ٹھنڈا کرو اور میاں صاحب لاہ چیتوں کو پلا پلا کر ختم کر دیتے ہیں، خود بلانی بھرنا پڑے تو پتا چلے ......" صدیقی صاحب اس وقت تو کچھ نہ بولے البتہ دوسرے دن بازار جاکر سستا سا واٹر کولر اور المونیم کے گلاس خرید لائے اور لاکر برآمدے میں رکھ دیئے کہ بچے جب چاہیں پی لیں۔ گیٹ سے اندر داخل ہوتے ہی برآمدہ تھا۔ برآمدہ بھی کیا تھا چھوٹے سے کوارٹر کے چھوٹے چھوٹے کمروں سے پہلے حاشیہ سا چھٹا ہوا تھا۔ اس کے ایک کونے میں دو اینٹیں ڈال کر کولر رکھ دیا گیا اور گلاس اس کے اوپر اوندھا دیئے گئے۔ صدیقی صاحب نے صبح اٹھ کر اس میں نل سے پانی بھر دیا اور گھر کی ضرورت سے فالتو جو برف بچی تھی وہ بھر دی۔ دوپہر کے وقت جس نے پانی مانگا اس کو بتا دیا کہ کولر اندر رکھا ہے جس کا جی چاہے پی لے۔ کولر رکھا دیکھ کر خوشی سے غل مچاتے بچے مکان میں بھر گئے اور پانی کے گرد جمگھٹا لگا دیا جیسے میلے میں خوانچے فروش کے گرد بھیڑ اکٹھا ہو جاتی ہے۔ اور جب واپس ہوئے تو برآمدے کا منظر بھی لٹے میلے جیسا تھا۔ کولر کی ٹونٹی کسی نے کھلی چھوڑ دی تھی جس سے پانی بہہ بہہ کر فرش پر دریا بنا رہا تھا۔ ایک گلاس زمین پر پڑا تھا۔ ایک غائب ہو چکا تھا اور صدیقی صاحب نے بہت شوق سے جو پھولوں کے گملے سجائے ہوئے تھے ان کی ساری پتیاں نچی ہوئی تھیں۔ اس دن تو صفائی ستھرائی کر دی گئی اور اگلے دن بچوں کو ڈانٹ ڈپٹ بھی کر دی گئی کہ اے بچو" چھوا چھیڑی نہ کیا کرو، مگر جس گھر میں بچے آتے ہیں وہاں گڑبڑ تو مچتی ہے۔ بیگم صدیقی جھنجھلا کر رہ جاتیں کہ پانی پلاؤ نیکی کرو اور گھر کا ستیا ناس بھی کرواؤ۔ اور بچے بھی بہت سارے آنے لگے تھے۔ بعض تو پیاسے ہوتے اور پانی پینے آتے، کچھ تماشے کی غرض سے چلے آتے اور کچھ کے یہ نیا کھیل ہاتھ لگا۔ اسکول کی چھٹی ہوتے ہی سیدھے یہاں کا رخ کرتے۔ دو ایک کو یہ جگہ کھیلنے کے لئے اس قدر پسند آئی کہ وہ دوپہر بھر یہاں بھاگتے دوڑتے اور پانی میں چھپا چھپ کرتے رہتے، اپنے گھر جانے کا نام نہ لیتے

بچوں کے ساتھ اور لوگ بھی پانی پینے آنے لگے۔ بیگم صدیقی کو کئی دفعہ لگا کہ کوئی سایہ مکان میں پھر رہا ہے اور کوئی کمروں میں جھانکتا ہے۔ باہر نکل کر دیکھا تو کوئی راہگیر کولر کے پاس کھڑا پانی پی رہا ہے۔ وہ ایک آدمیوں کو ٹوکا بھی لیکن آپ نے کنواں کھودا ہے تو دوسروں کو پانی لینے سے نہیں روک سکتے۔ وقت بے وقت کوئی نہ کوئی پانی لینے کے لئے آجاتا۔ بیگم صدیقی کی عادت تھی کہ دوپہر میں سو جاتیں۔ دوپہر کے وقت گلی میں اس خاموشی کا راج ہوتا جو متوسط کالونیوں سے مخصوص ہے۔ جس کو کبھی کوئی سائیکل رکشہ اپنی پھٹ پھٹ سے چیرتا جاتا تو لگتا کہ کوئی عفریت ہے جو اپنی تنہائی کی بے کسی میں چیخ رہا ہے۔ اس سناٹے میں وہ پنکھا چلا کے کمرہ ٹھنڈا کر کے لیٹ رہتیں، اب یہ ہونے لگا کہ ذرا آنکھ لگی اور گیٹ کی گھنٹی بجی۔ نکل کر دیکھا تو کوئی پانی مانگنے کھڑا ہے۔ دوپہر بھر میں کئی کئی دفعہ گھنٹی بجتی اور بار بار اٹھنا پڑتا۔ بیگم صدیقی تنگ آجاتیں۔ کسی نے گھنٹی پر اس بے طرح ہاتھ مارا کہ وہ بند نہ ہو سکی اور مستقل بجے گئی۔ گھنٹی کی تیز چبھتی ہوئی آواز سارے گھر میں گونجنے لگی اور کانوں میں آہنی ہتھوڑے کی طرح پڑنے لگی۔ سب کے اعصاب جھنجھنا گئے۔ آخر اس کے تار کاٹے گئے۔ تب آواز بند ہوئی اور چین آیا۔ گھنٹی ہٹی تو لوگ بے دھڑک گھر کے اندر آنے لگے جس کو دیکھو منہ اٹھائے چلا آرہا ہے۔ گھر میں بے پردگی اور بے حفاظتی ہو گئی۔ سامنے کے پلاٹ پر مکان بن رہا تھا اور مزدوروں کی مدد لگی ہوئی تھی۔ ایک دن وہاں سے کئی مزدور پانی لینے آگئے اور پانی پی کر وہیں ہاتھ منہ بھی دھونے لگے۔ ان کے سامنے آنے کی تو کسی میں ہمت نہیں ہوئی مگر جب وہ چلے گئے تو بیگم صدیقی نے نکل کر دیکھا کہ صابن کا میلا پانی فرش پر بہہ رہا ہے اور برآمدے کی سفید دیوار پر جابجا میلے ہاتھوں کے نشان بنے ہوئے ہیں۔ اگلے دن پانی برآمدے سے ہٹا کر محلے کی چار دیواری کے باہر رکھوا دیا گیا۔

گھر میں کسی زمانے میں مرمت کرائی گئی تھی۔ اس وقت کی بچی ہوئی بجری اور سیمنٹ پچھواڑے پڑی ہوئی تھی جس پر رات کو آوارہ کتے سوتے تھے اور دن میں محلے کے بچے مٹی کے محل بناتے تھے۔ وہ سب کام میں لا کر صدیقی صاحب نے گیٹ کے پاس پانی کی ٹنکی بنوا دی اور گلاس رکھوا دیئے۔ پہلے دن اس کو خوب دھلوا کے، منجھوا کے، اس میں صاف پانی بھروا دیا اور برف والے سے کہہ دیا کہ روزانہ اس میں سیر ڈیڑھ سیر برف ڈال جایا کرے کہ پانی خوب ٹھنڈا ہو جائے اور پیسے مہینے کے مہینے ہم سے لے جایا کرے۔ اب یہ ایک سبیل سی بن گئی کہ جس کو پیاس لگے پانی پی لے۔ اسکول کے بچوں، راہگیروں گلی سے گزرنے

والوں کو آسانی ہو گئی کہ گرمی ستائے تو پانی پی لیں۔ گلی دھوپ کے رُخ پر تھی اور دن بھر تپتی رہتی۔ سڑک کے کنارے کوئی پیڑ تھا نہ فٹ پاتھ پر سایہ، راستہ چلنے والے حال سے بے حال ہو جاتے۔ پانی کی فراہمی سے یہ جگہ ان کیلئے شجرِ سایہ دار بن گئی، جو ادھر سے گذرتا اس نے ایک کٹورا ٹھنڈے ٹھنڈے پانی کا انڈیلا، پیا اور پیاس بجھائی تو آگے اپنی راہ پر ہو لیا۔ جیسے جیسے لوگوں کو پتہ چلتا گیا کہ یہاں ٹھنڈا پانی مل جاتا ہے وہ اس سہولت سے فائدہ اٹھانے لگے۔ ٹنکی کا پانی جلدی خرچ ہو جاتا۔ ٹنکی کئی دفعہ خالی ہوتی اور کئی دفعہ بھری جاتی۔ ہر وقت کوئی نہ کوئی ضرورت مند پانی کے لئے کھڑا ہوتا۔ مفت کے پانی کا انتظام ہوتے ہی لوگوں کی ضرورت بھی بڑھ گئی۔ ہر ایک اپنی بساط سے زیادہ پانی لے جانے لگا۔ لوگ آتے اور ٹھنڈے پانی کے کنستر کے کنستر بھر بھر کے لے جاتے۔ صدیقی صاحب نے اپنا معمول بنا لیا کہ صبح اٹھ کر ٹنکی میں سے پچھلے دن کا پانی بہا دیتے اور ٹنکی کو دھو کر اس میں تازہ پانی بھر دیتے۔ برف والا دس گیارہ بجے تک آ کر برف ڈال دیتا، پانی دوپہر تک ٹھنڈا ہو جاتا۔ جب اسکول کی چھٹی ہوتی اور بچوں کے باہر نکلنے کا وقت ہوتا تب تک برف گھل چکی ہوتی اور پانی خوب ٹھنڈا ہو جاتا، اتنا ٹھنڈا کہ کوئی بھی ایک دفعہ میں پی نہیں پاتا بلکہ گھونٹ گھونٹ پینا پڑتا۔ کوئی بچہ گرمی میں دوڑتا ہوا آتا اور چاہتا کہ غٹ غٹ کر کے پانی چڑھا جائے تو بیگم صدیقی برآمدے ہی سے اسے سمجھانا شروع کر دیتیں "رسان سے پیو بیٹا۔ پانی کہیں بھاگا تو نہیں جا رہا" اور اگر کوئی بچہ ایک ہی سانس میں پانی چڑھا جاتا تو وہ جلدی سے باہر آتیں اور بچے کی پیٹھ سہلانے لگتیں کہ کہیں پانی سانس کی نالی میں نہ چڑھ جائے اور بچے کو اُچھو نہ ہو جائے۔ برآمدے میں بیٹھے بیٹھے وہ دیکھتی رہتیں کہ کوئی پانی بھر کے لے جا رہا ہے تو ٹوک دیتیں۔ بعضے مان جاتے اور بعضے لڑنے لگتے۔ ایسے میں چپ سادھنے کے علاوہ اور کیا چارۂ کار تھا؟ خاموش ہونا پڑتا۔ لوگوں کو پانی کی تو آسانی ہو گئی لیکن صدیقی صاحب کے لئے ایک قباحت یہ ہوئی کہ جیسے جیسے ٹنکی بکی ہو گئی اور لوگ اس کے عادی ہوتے گئے برف کی قیمت بھی چڑھنے لگی۔ برف والا تو روز صبح برف ڈال کر چلا جاتا اور پہلی تاریخ کو دروازہ کھٹکھٹاتا کہ صاحب لائیے میرے پیسے۔ گھر میں پیسے کی کھینچ پڑ جاتی۔ پہلے تو یہ تھا کہ برف کے دام اتنے تھے کہ معلوم بھی نہ ہوتا، اب برف والے کو اتنے پیسے پکڑا دینا سب کو کھلنے لگا۔ گھر والے تو پیسوں کی وجہ سے یہ سوچتے رہ جاتے کہ کیا خریدیں اور کیا چھوڑ دیں۔ برف والے کو جو پیسے دیئے جاتے تو لگتا حرام میں جا رہے ہیں۔ بیگم صدیقی ناراض ہوتیں کہ اپنا تو پورا پڑتا نہیں میاں چلے ہیں دوسروں کو فیض یاب کرنے۔ کئی دفعہ ایسا ہوا کہ برف والے کے اتنے پیسے ہو گئے کہ اس سے کہنا پڑا بھئی فی الحال

تو اتنے رکھ لو باقی اگلے مہینے لے لینا اور مہینہ بھر صدیقی صاحب کو برف ڈپو کے سامنے سے نگاہ نیچی کئے گذرنا پڑتا۔ پہلے جتنی برف ڈلوائی جاتی اب اس کی آدھی مقدار خریدی جاتی پھر بھی گھر والے کسی چھوٹی موٹی چیز کو نہ خرید پاتے اور دل مارنا پڑتا تو انہیں برف کے بھر مٹھی روپے فالتو منہ میں ضائع ہوتے ہوئے نظر آتے۔ گھر والوں کا اصرار بڑھا تو آخر برف والے سے کہہ دیا گیا کہ پہلی تاریخ سے ٹنکی میں برف نہ ڈالنا ہمیں نہیں چاہیئے۔ ٹنکی میں سادہ پانی رہنے لگا۔

صدیقی صاحب کی ٹنکی نے محلے کی زندگی میں بہت اہمیت اختیار کرلی تھی اور اب ایک مستقل حیثیت کی حامل تھی۔ لوگوں کو پانی کا تو آرام ہوا ہی سایہ بھی ملنے لگا۔ تیز دھوپ میں پھیلتا اس کا سایہ مکان کے آگے چھاؤں بچھاتا چلا جاتا۔ پانی کی وجہ سے دیواروں میں نمی بس گئی جس کی سیلی ہوئی ٹھنڈک زمین کے اس پورے حصے میں پھیل جاتی جو پانی پینے آنے والوں کے پیروں سے دب دب کر پکا ہوگیا تھا۔ صحرا کی طرح تپتی گلی میں نخلستان جیسی تھی اور نخلستان کی طرح یہاں پہنچتے ہی آنے والے اطمینان کا سانس لیتے، سکون سے بیٹھ جاتے اور دیر تک کاہلی سے سوچتے رہتے کہ ٹھنڈک کو چھوڑ کر کون اس دھوپ گرمی میں آگے جائے۔ یہاں لوگ سستانے آتے اور دیر تک ٹکے رہتے۔ کوئی تھکا ماندہ ٹھیلہ گیر پانی پی کر کمر سیدھی کرنے کی غرض سے گھڑی بھر کو بیٹھ جاتا، یا جن دنوں گرمی اپنے عروج پر ہوتی اور دوپہر بھر لُو کے تھپیڑے چلتے، ٹنکی کے نم سائے میں کوئی نہ کوئی بیٹھا رہتا تو دوسرا اس سے بات کرنے کے لئے رک جاتا۔ دو سے کبھی تین ہو جاتے۔ آس پاس کے گھروں سے مزدور، نوکر اپنا کام ختم کر کے یہاں بیٹھنے لگے یا سودا سلف خریدنے بازار جاتے ہوئے یہاں تھوڑی دیر ضرور ٹھہر جاتے۔ محلے کے بے فکروں کو ایک نیا ٹھکانا ہاتھ آیا۔ دیوار کے سائے میں رومال بچھا کر بیٹھ جاتے تاش چل رہے ہیں، ہنسی مذاق ہو رہا ہے۔ ان کے ہو حق سے گھر والے عاجز آگئے۔ محلے والوں کو بھی اعتراض ہوا کہ یہ ہر وقت کیا چنڈال چوکڑی جمع رہتی ہے۔ شرفا کا وہاں سے گذرنا اور پانی پینا دوبھر ہوگیا۔ گھر والوں کو الگ پریشانی لاحق ہوگئی۔ صدیقی صاحب نے اور محلے کے دوسرے بزرگوں نے بہت کہہ سن کر یہاں لوگوں کا جمع ہونا اور بیٹھنا بند کرا دیا اور طے یہ پایا کہ جب کو پانی پینا ہو پی لے اور پی کر چلا جائے، یہاں بیٹھنا نہ ہے۔ لیکن ایک مشکل سے چھٹکارا پایا تو دوسری آن کھڑی ہوئی۔ لوگوں نے یہاں جمع ہونا چھوڑ دیا تو کوئی دیکھنے بھالنے والا نہ رہا۔ لوگ چوری چوری پانی کے کنستر بھر بھر کے لے جانے لگے۔ کوئی موٹر والا اپنی گاڑی کے لئے پانی لے لیتا اور پیاسے منہ دیکھتے رہ جاتے۔ پانی بہ

ہاتھ صاف کرتے۔ ایک دن کوئی گلاس لے گیا۔ دوسرے گلاس لاکر رکھے گئے تو کچھ عرصہ بعد وہ بھی غائب۔ آئے دن گلاس چوری ہونے لگے۔ اس کا علاج صدیقی صاحب نے یہ نکالا کہ ان کا ایک پرانا مگھا بڑا تھا جس میں پانی بھر کر وہ شیو کیا کرتے تھے، اس پر زنجیر چڑھوا کر ٹنکی کے ساتھ لگا دیا گیا گلاس نہ ہوئے تو ٹنکی کی ٹونٹی چوری ہونے لگی، ہر دوسرے تیسرے دن کوئی ٹونٹی کھول کر لے جاتا۔ اتنی جلدی جلدی نئی ٹونٹی لگوانا پڑتی تو یہ ایک اور مستقل عذاب بن گیا۔ بیگم صدیقی پھر ناراض ہوتیں کہ یہ مفت کا دردِ سر اور مل گیا، میاں چلے تھے نیکی کرنے۔ صدیقی صاحب نے کئی دفعہ سوچا کہ اس ٹنکی پر لعنت بھیجیں اور اپنا پیچھا چھڑائیں، لیکن ٹنکی ختم کرنے پر محلّے والے راضی نہ ہوتے۔ بھلا کون چاہے گا کہ مفت کی گنگا بہتے سے بند ہو جائے۔ لوگوں کے سمجھانے بجھانے پر صدیقی صاحب پھر راضی ہو جاتے ٹنکی میں پھر پانی بھروا دیتے، پھر ٹونٹی چوری ہو جاتی اور پھر نئی لگوانی پڑتی۔ ٹنکی کیا بنی ہوئی چوری کا سلسلہ مستقل ہو گیا اور صدیقی صاحب نے غصّہ میں آکر فیصلہ کیا کہ وہ اب ٹنکی میں پانی نہیں بھروائیں گے محلّے والوں کو ضرورت ہو تو خود بھریں اور پئیں۔ غصّے میں انہوں نے کہہ تو دیا لیکن ان کو برابر خیال آتا رہا کہ پانی کی فراہمی کا سلسلہ جاری رہتا تو اچھا تھا۔ صبح اٹھ کر دیکھا شاید کسی نے پانی بھر دیا تو خالی ٹنکی میں ریت جمع تھی اور اس کے اوپر محلے بھر کی غلاظت الٹی ہوئی تھی۔ ایک دو دن جو ٹنکی کو خالی چھوڑا تو اسے کوڑے دان کے طور پہ استعمال کیا جانے لگا۔ صدیقی صاحب کو خود ہی خیال آیا اور انہوں نے ٹنکی کو دوبارہ پاک صاف کرا کے اس میں پانی بھر دیا اور مجبوراً پھر محلے کے بے فکرے آوارہ پھرنے والے نوجوانوں کی ٹولیوں سے کہنا پڑا کہ یہاں بیٹھ جایا کرو کہ اس کی حفاظت رہے۔ ان کی محفلیں پھر جمنے لگیں، شرفاء وہاں سے کترانے لگے اور لڑکیوں بچیوں کا گذرنا مشکل ہو گیا۔ ایک دن صدیقی صاحب کی بیٹی روتی ہوئی آئی اور شکایت کی "وہ جو ٹنکی کے پاس موٹا سا آدمی گلے میں رومال لٹکائے بیٹھا رہتا ہے وہ مجھے دیکھ کر الٹی سیدھی باتیں کرتا ہے" صدیقی صاحب اسی وقت غصّے میں بھرے ہوئے باہر گئے اور اس آدمی سے کہا سنا مگر وہ تو مرنے مارنے پر تیار ہو گیا۔ الٹا صدیقی صاحب ہی کو اپنی عزت بچا کر اندر آنا پڑا۔ انہیں خیال آیا کہ یہ ٹنکی ہی فساد کی جڑ ہے۔ جب تک یہ ہے تب تک مصیبت بھگتنا پڑے گی۔ اس کو ختم کر دینا چاہئیے۔ نہ رہے گا بانس نہ بجے گی بانسری۔ وہ باہر گئے ٹنکی کی ٹونٹی کھول کر سارا پانی بہا دیا، اس میں مٹی جھونک دی اور کہہ دیا کہ آئندہ اس میں پانی نہیں بھرا جائے گا۔

ٹنکی کا پانی بہاکر وہ واپس آئے تو اس قدر افسردہ تھے۔ جیسے اپنے کسی عزیز کو دفنا کے آ رہے ہوں۔ چہرے پر غم و غصہ سے ایک رنگ آ تا تھا ایک جاتا تھا۔ بیگم صدیقی بھی بھری بیٹھی تھیں، وہ بھی بگڑنے لگیں۔ صورتِ حال کا اندازہ لگا کر بچوں نے بھی پریشان شکلیں بنالیں جیسے مجلسوں میں شہدائے کربلا کے مصائب کا ذکر سن کر بنا لیتے تھے۔ اتنے میں دروازہ بھڑ بھڑانے کی آواز آئی۔ گیٹ پر کوئی کھڑا ہوا تھا اور کھٹکھٹا کھٹکھٹا کے دروازہ توڑے ڈالتا تھا۔ صدیقی صاحب گھبرا کے باہر نکلے کہ جانے کون ہے کیا افتاد پڑ گئی۔ نکل کر دیکھا تو ایک بھکاری عورت اپنے بچے کو لئے کھڑی تھی۔ مالک مکان کو آتا دیکھ کر وہ گھگھیانے لگی "اے بابو اللہ بھلا کرے گا ٹنکی میں پانی نہیں ہے تھوڑا پانی دے دے۔"

صدیقی صاحب نے ترش روئی سے جواب دیا "یہاں نہیں ہے پانی" عورت خوشامد کرنے لگی "دے دینا ذرا سا، بچہ پیاسا ہے۔"

صدیقی صاحب بگڑ گئے "کہہ جو دیا یہاں پانی وانی نہیں ہے۔"

عورت واپس جانے لگی تو جاتے جاتے ہونٹ بچکا کر بولی "ذرا سا پانی بھی نہیں پینے کو دیا۔ یزید کہیں کا ۔ ۔ ۔"

اور یزید نے اپنا یہ نام سن کر سر جھکا لیا جیسے نیکی کا انعام وصول کر رہا ہو۔

شکیلہ رفیق

سائبان

اچھے بھلے شجاع سے اس کے دوستانہ تعلقات چل رہے تھے کہ آج شام وہ ایک ایسی بات کہہ کر چلا گیا جس نے نیر کو سارا وقت پریشان رکھا شام تو بچوں اور گھر کے بکھیڑوں میں جوں توں بیت گئی مگر ذہن میں وہ سوال پھر بھی گردش کرتا رہا۔ مگر اب رات تو اپنی خاموشی اور تنہائی کے باعث شجاع اور اس کے سوال کو یوں اس کے سامنے لے آئی تھی کہ آنکھیں بند کر لینے پر بھی وہ سامنے تھا اور ذہن میں اس کا تیکھا سوال۔

شام کو جب کوفی کی پیالی اٹھاتے ہوئے شجاع نے اس سے کہا۔

"ایک بات تم سے پوچھوں نیر؟"

تو اس نے چونک کر شجاع کو دیکھا کہ..... اس سے قبل اس نے کبھی اس طرح بات نہ کی تھی۔

"ہاں پوچھو"

"کبھی تمہارا اپنے لئے جینے کا جی چاہا؟"

"نہیں" اس نے فوراً ہی کہا۔

شجاع نے بغور اسے دیکھا پھر بولا "جھوٹ کیوں بولتی ہو؟" اس کے انداز میں بے اعتمادی تھی۔

"مجھے کیا ضرورت ہے جھوٹ بولوں وہ بھی تم سے"

"ہاں ہاں..... یوں تو تم مجھ سے جھوٹ نہیں بولتیں مگر؟... اس وقت .....". وہ رکا کہ پھر بولا "مجھے شبہ نہیں بلکہ یقین ہے"

"آخر کیوں؟"

"میں کیوں کر مان لوں کہ تم اتنی بڑی حقیقت بلکہ... ضرورت سے منکر ہو" اس کی بے یقینی اب تک برقرار تھی۔

"کیسی ضرورت ؟"

"انسانی ضرورتوں کی بہت سی اقسام ہیں۔ بھوک لگے تو کھانا نہیں کھاتی ہو؟ ذہن کی طلب پر کتاب اور پھر...... ذات کی ضرورت....." اس نے جملہ دانستہ ادھورا چھوڑ دیا کہ نیئر جیسی ذہین عورت کے لئے اتنے ہی الفاظ کافی تھے۔

"آج تمہیں ہوا کیا ہے؟ اچھی بھلی باتیں کرتے کرتے بہکنے کیوں لگے؟" بڑی رسمی سی مسکراہٹ تھی اس کی۔

"بہکا قطعی نہیں بلکہ قطعی حقیقت بتا رہا ہوں اور...... چاہتا ہوں کہ تم بھی اس حقیقت کو تسلیم کرلو۔" اس نے بڑے بھروسے کہا۔

"ضروری تو نہیں کہ میں بھی تمہارے خیال سے اتفاق کروں" وہ قدرے لاپرواہی سے بولی۔

"دیکھو نیئر! یہ بات آج تمہیں تسلیم کرنی پڑے گی کہ انسان کی اپنی ذات اس کے لئے سب سے اہم ہے۔" شجاع نے یوں کہا جیسے آج یہی بات کرنے کے ارادے سے آیا ہو۔

"نہیں.....! میں نہیں مانتی...... بعض اوقات فرد سے وابستہ دوسری ذاتیں اس کے لئے زیادہ اہم ہوجاتی ہیں۔"

"اب تم صرف ماں بن کر بول رہی ہو...... اور کچھ نہیں..... ورنہ اتنی بڑی حقیقت کو یوں نہ جھٹلاتیں..... بندۂ خدا! میں نے تم سے تمہارے بارے میں کچھ پوچھا ہے؟ تمہارے اندر کی عورت کے بارے میں۔"

"میں نے کہا نا ہر شخص کی اپنی اپنی سوچ ہے..... ہوسکتا ہے جو تم کہہ رہے ہو وہ بھی ٹھیک ہو اور..... یہ بھی ممکن ہے کہ میں بھی درست ہوں۔"

"جی نہیں! دونوں آراء بیک وقت کیوں کر درست ہوسکتی ہیں۔ اس بات پر جب اکثریت متفق ہے تو تم الگ کیسے ہوسکتی ہو؟ اور..... تمہیں اسی وقت اسے ماننا ہوگا" اس نے جیسے فیصلہ سنا دیا۔

"واہ!" وہ لیونہی ہنسی "دھونس ہے تمہاری! میں اپنی رائے کی خود مالک ہوں"

"ہاں..... دوسرے معاملات میں تم مالک ہوگی مگر..... یہ بات تمہیں میری ہی تسلیم کرنی پڑے گی۔"

اب وہ حقیقتاً دھمکی سے بولا۔

"اور..... کوئی نئی کتاب پڑھی تم نے ؟"

"بات کو گھماؤ مت! میں جو پوچھتا ہوں اس کا جواب دو"

"تمہاری فضول باتوں کا میرے پاس کوئی جواب نہیں"

"یہ فضول باتیں ہیں ؟" اب اسے غصہ آنے لگا۔

"میرے نزدیک !"

"ٹھیک ہے میں چلتا ہوں اور..... اب جب ہی آؤں گا جب تم اس بات کو فضول کی بجائے ایک حقیقت تسلیم کر لوگی" وہ کھڑا ہو گیا اس کے ہاتھ میں کوفی کی پیالی اب تک یوں ہی تھی۔

"ارے ارے! یہ آج کیا ہو گیا ہے تمہیں ؟" وہ واقعی متعجب تھی۔

"آج نہیں میں بہت عرصے سے تم سے یہ بات کرنی چاہتا تھا..... یوں کہو کہ موقع آج مناسب ملا..... اچھا میں جا رہا ہوں !"

"کوفی تو پیتے جاؤ !"

"تم پیو ..... اور میری پیالی بھی پی لینا تاکہ ..... ڈھنڈ چھٹ جائے ..... خدا حافظ !"

نیرؔ اسے روکتی ہی رہ گئی مگر وہ تو جیسے کچھ سننے کو تیار نہ تھا۔

یہ ایک نئی صورتِ حال تھی۔ سجادؔ کی موت کے بعد شجاع پہلا شخص تھا جو اسے اچھا لگا تھا۔ شجاع سے اس کی پہلی ملاقات ایک مشاعرے میں ہوئی تھی چونکہ دونوں ہم مذاق تھے اس لئے اکثر یہ ملاقاتیں ہونے لگیں اور اب تو زیادہ تر شجاع کی شامیں نیرؔ کے گھر پر ہی گزرتی تھیں۔ دونوں گھنٹوں ادب پر، فلسفہ پر، سیاست پر اور شاعری وغیرہ پر تبادلۂ خیال کیا کرتے۔

مگر آج ....

شجاع اس کی سوچ کو ایک نئی نہج پر ڈال کر چلا گیا تھا اور اس نے نہ صرف ایسا کیا تھا بلکہ اس کا ناراضگی سے اٹھ کر چلا جانا نیرؔ کے لئے دعوتِ فکر سے کم نہ تھا...... اگلی صبح بھی منّی کو اسکول بھیجنے کے لئے تیار کرتے ہوئے اور گڑیا کے کپڑے بدلتے ہوئے کئی بار جیسے اسے کسی نے جھنجھوڑ ڈالا ہو۔

"جھوٹ بولتی ہو تم !"

وہ ہر بار سر جھٹکتی اور...... شجاع ہر بار سوال بنا اس کے سامنے کھڑا ہوتا۔ سجاد کی موت کو عرصہ گذر چکا تھا۔ ان دس برسوں میں اس نے زندگی کو جیسے چھو کر محسوس کر لیا تھا اور اس سے اتنا کچھ سیکھا تھا جتنا دوسرے افراد تمام عمر نہیں سیکھ سکتے۔ ایک جوان اور خوبصورت عورت بیوہ ہو جائے تو اسے کن پُرخار راہوں سے گذرنا پڑتا ہے اس کا اندازہ صرف ایسی عورت ہی کر سکتی ہے جو خود ایسی ہی صورتِ حال کا شکار ہو کوئی دوسرا فرد اسے سمجھ ہی نہیں سکتا۔

سجاد کی موت کے وقت اس کی عمر ہی کیا تھی بیس بائیس برس، جو عورت کی عمر کا سب سے خوبصورت دور ہوتا ہے۔ اس دور میں اسے کیا کیا نہ دیکھنا پڑا تھا۔ بعض افراد کی نگاہوں میں تو گناہ اتنا نمایاں ہوتا کہ موٹے اور ڈھیلے لباس کے باوجود وہ اپنے کو دوپٹے سے مزید ڈھانپنا شروع کر دیتی اور اس کے پسینے چھوٹ جاتے۔ انہی سب باتوں کے سبب اس نے مردوں کے متعلق ایک یہ رائے قائم کر لی کہ مرد، صرف مرد ہوتا ہے اور کچھ نہیں خواہ وہ زندگی کے کسی بھی شعبہ سے متعلق ہو...... کیسے کیسے کرداروں اور کیسی کھلی نگاہوں سے وہ نمٹی تھی اور بڑی خوش اسلوبی سے نمٹی تھی اور...... اب تو یہ سب خواب کی مانند دھندلا چلا تھا کہ آج.. ...شجاع نے پہلے ایک ہی جملے سے وہ ساری دھند چھانٹ کر اسے باہر نکال لیا تھا۔

جب شجاع سے وہ پہلی مرتبہ ملی تھی تو اسے اپنی اس رائے میں کہ مرد صرف مرد ہوتا ہے، تبدیلی کرنی پڑی تھی کہ شجاع اسے بہت مختلف لگا تھا۔ اس نے کبھی اس سے کوئی غلط بات نہ کی تھی۔ وہ گھنٹوں مختلف موضوعات پر باتیں کرتے۔ کبھی کبھی شجاع اس کی تعریف بھی کر دیتا مگر اس کے خیال میں یہ کوئی ایسی بات نہ تھی۔ دوست ایک دوسرے کی تعریف کیا ہی کرتے ہیں، لیکن آج تو شجاع وہ شجاع ہی نہ رہا تھا۔ اس کے انداز میں اتنی نمایاں تبدیلی تھی جس نے نیرؔ کا سارا دن الجھن زدہ سا دیا تھا اور وہ سوچ میں ڈوبی رہی تھی، کہیں ایسا تو نہیں شجاع اسے صرف دیکھتے دیکھتے تنگ آ گیا ہو؟ آخر کو وہ مرد ہے...... پھر وہ ساری رات بھی اس کی اسی سوچ میں جلتی رہی مگر وہ کسی نتیجے پر نہ پہنچ سکی۔ پھر وہ اگلی شام کی منتظر ہو گئی جب شجاع آئے گا اور اس موضوع پر [illegible] بات کرے گا۔

مگر دوسرے روز شام رات میں ڈھل گئی اور شجاع نہ آیا...... تب اسے بات کی سنجیدگی پر سوچنا پڑا۔ "ایسی خفا ہونے والی کیا بات تھی بھلا اس میں؟" اس نے سوچا پھر خود ہی خجل ہو گئی کہ کیا واقعی وہ اتنی ہی نا سمجھ ہے؟ جو شجاع کی منشا نہ سمجھ سکی! اس نے سر تھام لیا۔ میں...... یہ کیوں بھول گئی تھی کہ شجاع

صرف میرا دوست نہیں ایک مرد بھی ہے اور بات پھر وہیں آکر رک گئی کہ مرد صرف مرد ہوتا ہے۔

اگلے روز جب بچے اسکول چلے گئے تب اس نے شجاع کے نمبر گھمائے۔ وہ شجاع کے گھر کبھی نہ گئی تھی کہ اس کی بیوی اور گھر والے اسے غلط نہ سمجھ بیٹھیں اور پھر وہ خود ہی ہر شام وہاں موجود ہوتا کبھی کوئی ضروری بات ہوتی تو وہ فون کر لیتی۔

"ہیلو۔!" دوسری جانب شجاع ہی تھا۔

"تم تو ایسے خفا ہو کر بھاگے کہ پھر نظر ہی نہیں" اس کا لہجہ سادہ و دوستانہ تھا۔

"تم سناؤ.... تمہارے خیالات میں تبدیلی آئی؟ یا ابھی وہیں ہو؟" اس نے قدرے رکھائی سے کہا۔

"پہلے میرے سوال کا جواب دو" وہ ہنس کر بولی

"یہ تمہارے سوال کا جواب ہی تھا" وہ مزید روکھا ہو گیا۔

"ناراض ہو؟"

"یہ بعد کی باتیں ہیں ...... پہلے میرے سوال کا جواب دو ...... ویسے میں تم سے ناراض نہیں ہوں" وہ سوچ میں پڑ گئی پھر مصالحانہ انداز میں بولی "شجاع! تم میرے بہت اچھے دوست ہو..... اور ....."

"انکار کی صورت میں تم مجھے اور...... دوستی دونوں کو کھو بیٹھو گی" شجاع نے اس کی بات درمیان سے کاٹ دی۔

"اچھا تم گھر تو آؤ پھر باتیں ہوں گی" وہ یہی کہہ سکی

"گھر آنے پر بھی ایسی باتیں ہونی ہیں تو بے کار ہے........ لہذا جب تک میری بات کا جواب اثبات میں نہیں مل جاتا میرا آنا ناممکن ہی سمجھو" لہجہ فیصلہ کن تھا۔

"یہ تو بڑی زیادتی ہے..... تم ایک دم ہی اتنی پرانی دوستی ختم کر رہے ہو؟" اس نے شکوہ کیا۔

"بہت خوب! ویسے اطلاعاً عرض ہے کہ دوستی کے خاتمے کا اعلان آپ کی جانب سے ہو رہا ہے"

"وہ کیسے؟"

"تم مجھ سے متفق ہو جاؤ گی تو سب درست ہو جائے گا ورنہ...... ظاہر ہے...... بس اب سب

کچھ تم پر ہے"! اس نے اک اک بات پہ زور دیا۔

" اچھا تم ایک بار آؤ تو سہی "!

" جو کہنا تھا میں کہہ چکا ..... بے کار ڈسٹرب کر رہی ہو کام کے وقت ..... تم سوچ لو .....
خوب سوچ لو ..... میں تمہیں وقت دینے کے لئے تیار ہوں مگر ..... صرف نیتر بن کر سوچنا .....
اچھا خدا حافظ!"

فون کھٹ سے بند ہو گیا اور وہ رسیور تھامے منہ کھولے رہ گئی۔

تمام دن وہ خواہ مخواہ ہی بہت سے کام بکھیرے رہی۔ اس نے خود کو بے حد مصروف کر لیا مگر
شجاع کی وہ باتیں ایک لمحہ بھی ذہن سے محو نہ ہوئیں بلکہ ہتھوڑے کی مانند ذہن پر لگا کر بے چین ہی کرتی
رہیں ..... حتیٰ کہ رات آ گئی ..... بستر پر لیٹ کر تو سوچیں کھنکھورے ہی بن جاتی ہیں وہ پھر وہی
سب سوچنے لگی ..... آج! اسے کسی فیصلہ پر پہنچنا تھا۔ اس نے اپنے ذہن کے پردے پہ ایک بار پھر اس
روز کی گفتگو منعکس کی، بات کرتے سمے تو اپنے نظریے کے دلائل کے جوش میں اس نے شجاع کے تاثرات
پر غور ہی نہ کیا تھا مگر ..... اب اس کے ہر جملے کے ساتھ اس کے تاثرات بھی یاد آ رہے تھے مثلاً جب
اس نے یہ کہا کہ انسان کی سب سے اہم ضرورت ذات کی ضرورت ہے تب ..... وہ کتنی عجیب نگاہوں
سے نیتر کو دیکھ رہا تھا جو صرف ایک مرد کی نظریں تھیں اور کچھ نہیں' اس کی آنکھیں وہ بقیہ مافی الضمیر
بھی بیان کر رہی تھیں جو لب نہ کہہ سکے تھے۔

آنکھیں .....

جو وجود کا سب سے سچا حصہ ہوتی ہیں اور کبھی جھوٹ نہیں بولتیں اور پھر آج فون پر تو اس
نے کچھ بھی باقی نہ رکھا تھا صاف صاف کہہ دیا تھا کہ وہ اپنی بات کا جواب اثبات میں چاہتا ہے وہ شجاع
نہیں اس کے اندر کا مرد بول رہا تھا جو نیتر کو آج تک صرف عورت کے روپ میں دیکھتا رہا تھا اور غالباً
مناسب موقع کا منتظر تھا جو یہ بھی بھلا بیٹھا تھا کہ وہ نہ صرف شادی شدہ بلکہ بچوں کا باپ بھی ہے۔ لیکن مرد
اس پہلو کو ہمیشہ یوں نظر انداز کر جاتا ہے ..... یہ اس کے لئے کوئی مسئلہ ہوتا ہی نہیں مسائل تو
سارے عورت کے لئے ہی ہوتے ہیں۔

وہ رات بھی اسی بارے میں غور کرتے کرتے کٹی۔ اس نے اپنے آپ سے کئی سوال کر ڈالے کیا سجاد کی

موت کے بعد کوئی ایک رات بھی ایسی گزری جب اسے بستر پر لیٹتے ہی نیند آگئی ہو؟ کیا ایسا نہیں ہوا کہ نیند کی گولیاں کھانے کے باوجود بھی نیند اس سے روٹھی ہی رہی؟ ہمیشہ تنہائی میں سجاد کا بھرپور اور جوشیلا پیار اسے یاد آ کر تڑپاتا نہیں رہا؟ کیا اسے خود کو سنبھالنے کے لئے کرب و اذیت سے نہیں گزرنا پڑا؟ ان تمام سوالوں کا جواب اثبات میں تھا۔ تمام پہلوؤں پر سوچنے کے بعد وہ آخرکار اس نتیجہ پر پہنچی کہ شجاع کی سوچ اپنی جگہ بالکل درست ہے سچ ہی تو کہتا تھا شجاع! انسان کے لئے سب سے اہم اس کی اپنی ذات ہوتی ہے ۔۔۔ حقیقت کو تسلیم کرنا ہی پڑے گا کہ اس سے فرار کب تک ممکن ہے، آخر کب تک؟ ہاں میں نے شکست تسلیم کر لی ہے ۔۔۔۔۔۔۔ میں ہار گئی ہوں ۔۔۔۔ بس اعتراف پر اسے بالکل تنہا ہونے کے باوجود پسینہ آ گیا ۔۔۔۔۔ صبح کا اجالا پھیلنا شروع ہو چکا تھا وہ بستر سے اٹھ گئی۔

ناشتہ کے بعد گڑیا اور منے نے حسب معمول اس کے پیار لئے اسے پیار کئے اور اسکول کی بس میں بیٹھ گئے آج نجانے کیوں وہ گیٹ پر کھڑی دیر تک بچوں کی جاتی بس کو دیکھتی رہی ۔۔۔ اس نے گیٹ بند کیا پھر کمرے میں آ کر فون کے قریب رکھی کرسی پر سر لٹکا کر بیٹھ گئی۔ آج شجاع کو فون کر کے جواب سے آگاہ کرنا تھا وہ کئی لمحے سوچتی رہی ۔۔۔ شاید الفاظ جمع کر رہی تھی جن سے گفتگو کی ابتدا کرنی تھی۔ آخر اس نے شجاع کے نمبر گھمائے۔

" ہیلو! شجاع بول رہے ہو؟ " جانتے ہوئے بھی اس نے تصدیق چاہی۔

" ہاں! بالکل شجاع ہوں اور ۔۔۔۔۔ تمہارے جواب کا بے تابی سے منتظر بھی " شجاع اس کی آواز سن کر جیسے خوش ہو گیا۔

" میں نے تمہارے سوال پر بہت غور کیا ہے اور ۔۔۔۔"

" اور تم ۔۔۔۔۔ ہار گئی ہو " اسے جیسے یقین تھا

" تم نے ضرورتوں کا ذکر کیا تھا شجاع؟ "

" ہاں ہاں! "

" ضرورتیں پوری کرنے کے ذرائع بھی تو ہوتے ہیں " اس کی آواز میں اچانک ہی مدھم سی کاٹ پیدا ہو گئی۔

" مثلاً؟ " وہ عجلت سے بولا۔

"مثلاً ....." وہ کہتے کہتے رکی پھر بولی "تم چونکہ ایک مرد ہو لہٰذا اتنے حساس ہو کر کبھی نہیں سوچ سکتے لہٰذا .... کہنا بیکار ہی ہے .... بہرحال ..... یہ بات مجھ سے کسی انداز میں بھی کبھی جاتی میری جانب سے انکار ہی ہوتا!"

اس نے ہونٹ کاٹے

"کیا؟ کیوں؟ ..... یعنی! تمہارا مطلب ہے جب بھی وہ ..... سچ نہ ہوتا؟" شجاع کے لہجے میں حیرت گھل گئی۔

"تم ...... سچ ہی کہتے ہوئے شجاع! مگر ..... میں یہ کیوں کر بھول جاؤں کہ ..... میں ...... اس زمین پر ایک تنہا جسٹر نہیں ...... بلکہ ...... اس سے شاخیں بھی پھوٹ چکی ہیں اور ...... جڑ کو اکھاڑ پھینکنے سے ..... اس سے وابستہ شاخیں ..... ٹوٹ کر رہ جائیں گی؟؟"

اس نے بے حد دکھی اور ٹھہرے لہجے میں اک اک لفظ پہ زور دے کر کہا اور سلسلہ منقطع کر دیا۔

کوثر ستار

ٹیبو

وہ بہت شدت پسند تھا۔ نفرت ہو، محبت ہو، دوستی ہو، دشمنی ہو، حماقت ہو، عداوت ہو، ناگ میں، لگاوٹ ہو، جھوٹ ہو، سچ ہو۔ زندگی کے تمام دوسرے معاملات کے سلسلے میں وہ کسی سے کسی وقت اور کسی سطح پر کوئی سمجھوتہ کر ہی نہیں سکتا تھا۔ سچائی اس کی کسوٹی پر جو پورا اترتا، وہ اسے کھوٹا نظر آتا۔ اس کے ہاں کلچر کے معنی خوش مزاجی، خوش طبعی، خوش اطواری، شیریں گفتاری اور ادب و تمیز تھے۔ اس کے نزدیک ایک مہذب اور مکمل آدمی کی کیفیت پر ان اسٹکرز (STICKERS) کا ہونا بہت ضروری تھا اور جو فرد اس کے مفروضہ تقاضوں کو پورا کرنے سے قاصر رہتا نااہل ثابت ہوتا۔ اس کو اس کی متلون اور سخت گیر فطرت نہایت آسانی سے باوجود سالہا سال کی دوستی اور قریبی تعلق کے ایک میلی چادر کی طرح بدل دیتی۔ پہلے وہ ایسے آدمی کو اپنے گون کا بنانے کی کوشش کرتا اور اس کی شخصیت میں پلے ہوئے جراثیم مارنے کے منصوبے بناتا۔ اور ان کو عملی جامہ پہنانے کے لیئے پہلی تجربہ گاہ اس کا اپنا گھر تھا۔ وہ منٹوں، گھنٹوں، دنوں اور برسوں اعتراضات اور اصلاحات کے آلات سے جراحی کرتا رہتا۔ درس اور پند و وعظ کے مرہم پھاہے کرتا۔ ان تجربات میں اس کی اولین توجہ اس کی اپنی بیوی کی جانب ہوتی جو اس کے مفروضوں اور معیاروں کے مطابق بدمزاج اور بددماغ تھی۔ دراصل وہ نفرت، اختلاط اور رنج و غم کے جائز اور فطری اظہار کو بدمزاجی کہتا۔ اس کے خیال میں ایک فرد کو چوبیس گھنٹے خوش ذوقی، خوش طبعی اور زندہ دلی کے جذبوں کی بنیادی کولڈ کریم لگائے رہنا چاہیے تھا۔

وہ جب درس دینے پر آمادہ ہوتا تو علم و فضل، تاریخ و تمدن اور فلسفہ و ادب کی شعاعیں فضا میں بکھرنے لگتیں اور زور بیان، جامد و صامت ہواؤں میں حرکت و حرارت پیدا کر دیتا۔ وہ کلچر کی ایسی ایسی موثر مثالیں پیش کرتا کہ کورے سپاٹ پتھروں کی رگوں میں خون دوڑنے لگتا۔ گندا اور زنگ آلود ذہنوں پر صیقل ہو

جاتی۔ اس نے ایک بار اپنی بی بی سے بحث و مباحثہ کے دوران خفا ہو کر کہا تھا۔

"موتی لفظ کلچر تمہارے حلق کے نیچے نہیں اُتر سکتا۔ بڑے بڑے بقراط اور سقراط اسے نگل نہ سکے۔ چند ہی لوگ اس دارو ئے تلخ اور زہر ہلاہل کو حلق سے اتار پائے ہیں۔ میں تم کو کلچر کی ایک معمولی سی مثال دیتا ہوں۔ شاید تم اس سے اس کی گہرائی اور گیرائی کا اندازہ کر سکو۔

"ایک مرتبہ بابر شدید خارش میں مبتلا ہو گیا۔ انہیں دنوں افغانستان کا سفیر اس سے ملنے آگیا۔ بابر نے اس کے ساتھ تین گھنٹے گزارے مگر اپنی کسی جنبش یا حرکت سے، باوجود شدید تکلیف کے، یہ ظاہر نہیں ہونے دیا کہ خارش جیسی موذی تکلیف میں مبتلا ہے۔"

بیسویں صدی کے سائنسی دور میں اس کے کلچر کا معیار اور اس کے آدرش کا جہانِ معنی بہت وسیع اور عریض تھا جس میں وہ اپنی بیوی کو بڑی استقامت اور خندہ جبینی سے گھرا دیکھنا چاہتا تھا۔ بیوی جو پہلے ہی سے کمزور اعصاب کی، زود رنج اور حساس تھی اور چھوٹے چھوٹے مسئلوں پر فکر کرنے اور سوچنے والی فطرت لے کر آئی تھی اور ذرا ذرا سی بات پر دکھی اور غمزدہ نظر آنے لگتی۔ اس نے بچپن ہی سے اپنے گھر خاندان اور پاس پڑوس بلکہ ملکی اور دنیاوی مسائل کو بالغ نظر انسان کی طرح محسوس کرنا شروع کر دیا تھا۔ وہ انسان کی خود غرضی، مفاد پرستی، ظالمانہ فطرت، بہیمانہ سلوک پر گھنٹوں کڑھتی، ہیروشیما۔ ناگاساکی، فلسطین، ویت نام جیسے الفاظ اس کے ذہن میں چیونٹی کی طرح رینگتے۔ وہ جب اخباروں میں کسی حادثے سے متعلق روتے بلکتے بچوں، عورتوں اور مردوں کی تصاویر دیکھتی تو بے کسی، بے چارگی اور بے بسی کی سوئیاں اس کے بدن میں چبھنے لگتیں اور وہ بے چین اور بے قرار ہو جاتی۔ اور اب چونکہ ازدواجی زندگی بھی غیر معمولی تھی۔ سسرال کے گھر درے اجنبی، بے کیف، یک رخ اور نوکیلے ماحول نے اس میں مزید اضافہ کر دیا۔ علاوہ بریں "سادہ زندگی اور ارفع تصور" اس کا مسلک تھا۔ اس لئے کبھی وہ کوئی پر پیچ بات، داؤ گھات اور روادار نہیں رہ سکتی تھی، اور بہت جلد فکر و تشویش اور ناگواری کی شکنیں اور سلوٹیں اس کے چہرے پر ابھر آتیں اور یہی زہر اس کے لہجے کی نرمی میں گھل جاتا اور تلخ گوئی پیدا ہو جاتی۔ اور یہی وہ سنگین لمحہ ہوتا جب وہ آپے سے باہر ہو جاتا اور جو کچھ کر سکتا اور کہہ سکتا کہہ ڈالتا۔ یہ بات نہیں تھی کہ وہ بیوی سے محبت نہیں کر سکتا تھا۔ اس نے موتی کو اپنا سب کچھ داؤ پر لگا کر حاصل کیا تھا۔ موتی جب اس کی یاوہ گوئی اور بدسلوکی سے عاجز آ جاتی یا وعظ سنتے سنتے تھک جاتی تو کہہ اٹھتی "چوبیس گھنٹے تو شاید پاگل اور رولر بھی خوش مزاجی کا اظہار نہیں کر سکتے۔ یہ بھلا کیسے ممکن ہے!"

یہ کہتے کہتے اس کی آنکھیں بھیگ جاتیں۔ تم کو ناممکن کو ممکن بنانا ہوگا۔ دیکھو دنیا میں سب سے زیادہ محبت میں نے تم سے کی اور کرتا ہوں۔ شاید میری فطرت یہ تقاضہ اس فرد سے کرتی ہے جس کو میں جان کہتا ہوں۔ تم میری اتنی ذرا سی خواہش پوری نہیں کرسکتیں۔

وہ چپ چاپ سنتی اور پھر ایک چھوٹا سا جملہ چھوڑ دیتی "بس تم یہ چاہتے ہو کہ تمہاری ہر خواہش پوری ہوتی رہے۔ آخر میں بھی تو انسان ہوں۔ میری کوئی خواہش کبھی پوری نہ ہو، چوبیس گھنٹوں میں میرا ایک لمحہ بھی نہیں ہو سکتا۔ جس میں میں اپنی اور صرف اپنی مرضی سے جیوں اور مجھ پر کوئی قدغن، کوئی پابندی نہ ہو۔ تم نے کبھی یہ سوچا ہے کہ محرومی خواہ وہ کیسی ہی ہو انسان کو حقیقی مسرت سے کتنا دور کر دیتی ہے۔ تم نے کبھی اس پر بھی غور کیا کہ تمہارے اپنوں نے مجھے کیا دیا۔ شفقت، محبت، پسندیدگی تو کیا دو قمت کا ایک چھلا تک نہیں پڑھایا۔ ایک ناک کی لونگ تک نہیں دی۔ یہ دکھ کسی لڑکی کو افسردہ اور چڑچڑا بنانے کے لئے کافی سے زیادہ ہے۔ بقول تمہارے اگر یہ کوئی دکھ نہیں۔ بیسویں صدی کی اس پود تعائی میں کسی انسان کی زندگی میں افسردہ یا بدمزاج رہنے یا ہونے کی کوئی اور وجہ ہوسکتی ہے"

اس کی خود پرستی اس کا جواب یہ دیتی۔

" میں یہ سب کچھ نہیں سننا چاہتا۔ میں تم سے صرف ایک بات چاہتا ہوں اور ہزار طریقے سے ہزار موقعوں پر کہہ چکا ہوں کہ خواہ تم پر کچھ گزرے خوش مزاجی کو اپنا اوڑھنا بچھونا بنائے رکھو۔ مونی خوش مزاجی میری زندگی کی سب سے بڑی محرومی ہے۔ میری کئی پشتیں اس محرومی نے فنا کردیں۔ نگل لیں۔ میں آج تم کو بتادوں کہ میں نے بدمزاجی کی گود سے جنم لیا ہے۔ میں بدمزاجی کے دامن میں پلا بڑھا ہوں۔ یہ بدمزاجی میری عمر کو ساعت بہ ساعت کم کررہی ہے۔ مجھے خوش مزاجی کے آکسیجن کی سخت ضرورت ہے۔ اور وہ تم ـــ صرف تم دے سکتی ہو"

جب وہ اس طرح کہتا تو مونی ایک دم مسکرا دیتی اور وہ بات تک جس کا ذکر بھی نہ ہوتا اور جس سے یہ اندیشہ ہوتا کہ یہ اس کو ناراض کرسکتی ہے یا ناگوار گذر سکتی ہے اس کو زندہ درگور کردیتی۔ وہ چوبیس گھنٹے اپنی ساری قوتیں اور صلاحیتیں اس بات پر صرف کرتی کہ اس کے اپنے چہرے پر کہیں سے کسی اختلاف، رنج یا دکھ کی ناگواری کا سایہ تک نہ پڑے۔ وہ آئینے کے سامنے کھڑی ہوجاتی اور طرح طرح سے اپنے چہرے پر مسکراہٹ پیدا کرنے کی مشق کرتی اور کبھی قہقہہ مار کر ہنسنے لگتی۔

دن، ہفتے، مہینے اور سال گزرنے لگے اور اس نے خوش مزاجی کے چوکٹھے میں خود کو اس طرح فٹ

کرلیا کہ اس پر بڑے سے بڑے حادثے، دُکھ، اہانت و تضحیک کا کوئی اثر نہ ہوتا۔ وہ ہنستی بولتی مسکراتی، قہقہے لگاتی رہتی۔ یہاں تک کہ جب وہ کوئی خوفناک یا حسرتناک خبر سناتا تو موتی کا جواب صرف ایک مسکراہٹ ہوتا۔ وہ کچھ جز بز سا ہو کر رہ جاتا۔ کبھی کبھی وہ اس خیال سے مسرور رہتا کہ موتی اب اس کے جذبات کا بڑا خیال رکھنے لگتی ہے۔ ایک دن وہ معمول کے مطابق کسی خیال میں منہمک تھا کہ اچانک اس کی نگاہ کاغذ کی کھڑکھڑاہٹ کے ساتھ موتی کی طرف اٹھ گئی۔ لیکن موتی کے چہرے نے کسی بات یا راز کی چغلی نہیں کھائی۔ اس کی تجسس آمیز فطرت نے فوراً سوال کیا۔

"کیا ہے بھئی؟"

"کچھ نہیں امی کا خط ہے۔"

"کوئی خاص بات؟" اس نے گھبرائے ہوئے لہجے میں پوچھا کیوں کہ کچھ دن پہلے کی یہ خبر کہ اس کا بوڑھا باپ پاکستان میں آخری سانسیں لے رہا ہے اس کو دہلائے ہوئی تھی۔ متوقع حادثے کے اندیشے کے زیر اثر اس نے موتی کے ہاتھ سے خط چھین لیا جس کی عبارت کچھ اس طرح تھی۔

"تمہارے ابو کے ایک دوست کا خط ملا ہے جس میں لکھا تھا تمہارے ابو تم لوگوں کو یاد کرتے ہوئے رخصت ہو گئے۔"

ابھی خط پورا بھی نہ ہوا تھا کہ وہ چکرا کر زمین پر بیٹھ گیا۔ جب اسے ہوش آیا اور اس کی آنکھیں کھلیں تو دیکھا کہ موتی اس پر اپنے سموچے وجود سے جھکی ہوئی ہے اور مسکرا مسکرا کر اس کی دل جوئی کی کوشش کر رہی ہے۔ اس کی آنکھوں سے ابلتے ہوئے لاوے کو بڑی بے فکری اور بے نیازی سے پونچھ رہی ہے۔ اس سے موتی کا یہ رویہ برداشت نہ ہو سکا۔ وہ جو موتی کو پاس پاکر دنیا و مافیہا کو بھول جاتا تھا۔ اس کے پتھر کی طرح سرد و سخت ہاتھوں کو ایک جھٹکے کے ساتھ علیحدہ کر دیا۔ اس کی مسکراہٹ اس کو زہر قاتل لگنے لگی۔ وہ سوچنے لگا کہ اگر یہ ذرا دیر اور یوں ہی مسکراتی اور چہکتی رہی تو شاید میں اپنے حواسوں میں نہ رہوں اور مجھ سے کوئی ایسی حرکت سرزد نہ ہو جائے جس کا مداوا نہ ہو سکے۔ وہ موتی کو شدید نفرت اور حقارت سے گھورتا ہوا اپنے کمرے کی طرف چل دیا۔ وہ اس روز سے موتی سے کترا یا کترایا سا رہنے لگا۔ اس کے سارے سلوک اب صرف بدسلوکیوں میں بدل گئے۔ اسے ہر وقت یہ جونک ڈستی رہتی۔

"موتی...... میرے بوڑھے اور شفیق باپ کی موت اور یہ زہریلی مسکراہٹ۔ اس کا جی چاہتا کہ

موں کا ہاتھ پکڑ کے اس کو گھر سے باہر نکال دوں۔ کبھی وہ سوچتا کہ اگر موفی مری تو میں بھی قہقہے لگاؤں گا۔ جب اس سوچ سے بھی اس کو تسکین نہ ہوتی تو وہ جنونی انداز میں اٹھتا اور موفی کو بلا وجہ زدوکوب کرتا۔ موفی اس سلوک کا جواب بڑی خندہ پیشانی اور خوش مزاجی کے مظاہرے سے دیتی۔ موفی کو اس تبدیلی کا احساس تک نہیں ہو سکتا تھا۔ وہ اس طرح سوچنے کی عادی نہیں رہی تھی۔ وہ صبح بالکل نارمل اٹھتی۔ زندگی کو جیسے تیسے گھسیٹتی اور رات کو پابندی کے ساتھ ہنستی مسکراتی سو جاتی۔

ٹھیک ایک سال بعد ایسا ہی ایک مرحلہ پھر آیا۔ اس نے دیکھا کہ موفی بالکل اسی انداز میں ایک خط کھولے پڑھ رہی ہے۔ پہلے اس نے کوئی توجہ نہ کی اور شدید لاتعلقی کا اظہار کیا۔ لیکن جلد ہی اس کی جلد باز طبیعت نے اس سے سوال کرا ہی دیا۔

"کیا پڑھ رہی ہو؟"

"خط ہے۔"

"وہ تو میں بھی دیکھ رہا ہوں۔ کس کا ہے؟"

"گھر سے آیا ہے۔"

"سب خیریت ہے۔"

"جی نہیں" اس نے بڑی خندہ پیشانی سے جواب دیا۔

"بتاتی کیوں نہیں۔"

"[illegible] ہوں" یہ کہتی ہوئی وہ آہستہ سے اس کے نزدیک پہنچی اور وہیں ڈھیر ہو گئی۔ ایسا لگتا تھا کہ موفی کے لاشعور میں اس خبر نے چنگاریاں بکھیر دی ہوں۔ اور اس کا شعور ان چنگاریوں پر مسکراہٹ کی ریت ڈالنے کی کوشش کر رہا ہو۔ اس کی ہنسی جس نے کچھ [illegible] اور موفی کے ہاتھ سے اس نے خط لے لیا جو اس کی شعوری [illegible] سے دبا ہوا تھا۔ خط کا ایک حصہ [illegible] تحریر آ گیا جس میں لکھا تھا۔

"تم کو تار بھی [illegible] ہو گا [illegible] وظیفہ کے لیے [illegible] [illegible] [illegible] تھا [illegible]
[illegible] کوشش میں [illegible] بہت [illegible] [illegible] ہو گئے۔ [illegible] کے قریب [illegible] رہ [illegible] کہ [illegible] حادثے کے بعد وہ بول ہی نہیں پائے۔ ایک بار لب ہلے تو صرف تمہارا نام نکلا۔"

اس نے ایک لمحے کے لئے سوچا کہ موفی جو اپنے باپ سے عشق کرتی تھی اور جو زندگی بھر اس کا آدرش

بنا رہا۔ جس باپ کے ذکر سے اس کی آنکھوں میں زندگی جاگ اٹھتی تھی، چہرے پر تازگی دوڑ جاتی تھی اور ایک ایک عضو رقصاں ہو جاتا تھا۔ اس کی موت کی خبر مونی کو رُلا نہیں رہی ہے۔ بے ہوش نہیں کر رہی ہے بلکہ وہ اطمینان اور سکون کے ساتھ اس خبر کو پڑھ رہی ہے سنا رہی ہے۔ دوسرے ہی لمحے اس کی آنکھوں کے سامنے وہ تصویر لرزنے لگی جس روز اس کے باپ کے مرجانے کی خبر کا خط آیا تھا اور وہ بے اختیار رُسا ہو گیا تھا۔

اس نے قریب ہی کھڑی مونی کو اپنے بازوؤں میں بھینچ لیا اور کبھی اس کے بالوں کو، کبھی اس کی آنکھوں کو، کبھی اس کے معصوم معصوم رخساروں کو چومنے لگا۔ اس کی سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا کبھی وہ اس کے آگے ہاتھ جوڑتا اور کبھی بلک بلک کر رونے لگتا اور روانسی آواز میں کہتا۔

" مونی مجھ پر غصہ کرو۔ مونی مجھ سے بحث کرو، مجھ سے لڑو، مجھے برا بھلا کہو، مجھے نوچو، کاٹو، مجھ سے اپنا دکھ کہو۔ مونی چیخو، جی بھر کر چیخو۔" وہ زور زور سے چیخ رہا تھا۔ اور مونی اپنی وضعداری نباہنے میں مصروف تھی، وہ اپنے ہونٹوں کی مشین سے کولڈ اسٹوریج میں رکھی ہوئی باسی پھیکی سرد مسکراہٹ اس طرح سے اگل رہی تھی جیسے اسے اُبکائی آ رہی ہو۔

مشرف احمد

پرندے

شور سے بھرے ہوئے شہر کے اس حصے میں جہاں مارکیٹ کا پرانا انگریزوں کے زمانے کا بنا ہوا ٹاور بس میں آنے جانے والوں کو وقت بتاتا تھا۔ اس ٹاور کے زیر سایہ اندرونی علاقے میں شور کے اعصاب پل پل کو آرام کرتے محسوس ہوتے اس بلند عمارت کے سائے میں پھیلی ہوئی دکانوں کے ایک جانب مرغیوں اور پرندوں کے ڈبے ایک ساتھ رکھے ہوئے تھے۔ یہاں آکر آدمی اس بے ہنگم چیخ پکار سے صرف اس حد تک چھٹکارا پاتا تھا کہ اس کی سماعت پرندوں کی آوازوں سے آشنا ہو جاتی تھی۔

میں کئی چڑی ماروں کی دکانوں سے ہوتا ہوا اس دکان تک آیا تھا وہیں میں نے اس آدمی کو دیکھا شاید وہ میرے آنے سے پہلے ہی سودا کر چکا تھا۔ اور ایک ایک چڑیا کو پنجرے کے ادھ کھلے دروازے سے نکال کر آزاد کر رہا تھا۔ اس کا ہاتھ پنجرے سے باہر نکل کر بلند ہوتا اور فضا میں ایک لمحے کو بھوری گیند سی اچھلتی اور مجھے شور خاموشی میں بدلتا ہوا محسوس ہوتا۔

بازار کی آدھی دکانیں مرغی والوں کی تھیں اور باقی دکانوں پر مختلف پنجروں میں لعل، پودنے، بحری طوطے اور چڑیاں علیحدہ علیحدہ پنجروں میں بند تھیں۔ میں کافی دیر سے لعلوں کا ایک جوڑا خریدنے کے لئے مختلف دکانیں جھانکتا ہوا اب اس دکان تک آیا تھا۔ زندگی کی اور چیزوں کی طرح لعل بھی بڑے مہنگے تھے۔ دکانداروں نے گراں قیمتوں کا سبب یہی بتایا تھا کہ لعل امریکہ اور یورپ بھیجے جاتے ہیں، اسی وجہ سے مہنگے ہو گئے ہیں۔

اس دکان پر آکر بھی میں نے لعلوں اور چھوٹے بڑے پنجروں کی قیمت دریافت کی شاید یہاں سے بھی میں مایوس ہی لوٹ جاتا۔ مگر اس اجنبی آدمی کا چڑیاں آزاد کرنا مجھے کچھ ایسی غیر معمولی بات لگی کہ میرے پاؤں وہیں جم گئے۔ اجنبی کو دیکھتے رہنے کے ساتھ ساتھ میں ایک نظر چڑی مار کی دکان پر بھی

ڈال لیتا تھا جہاں چھوٹے بڑے پنجرے جن میں مختلف پرندے بند تھے، جگہ کی کمی کے باعث ایک دوسرے کے اوپر رکھے ہوئے تھے۔ میری نگاہ دکان کے بائیں جانب لٹکے ہوئے لکڑی کی تیلیوں کے ایک چھوٹے سے پنجرے پر جا پڑی، اس پنجرے میں دو لعل بند تھے، جن کے پروں پر سیاہ و سفید تل ان کی خوبصورتی میں اضافہ کر رہے تھے اور چڑی مار کے بیان کے مطابق ایک موسم کی بارش دیکھ چکے تھے۔ بڑے پنجروں میں بند بہت سارے دوسرے لعلوں کے مقابلے میں یہ جوڑی خوبصورت اور جسامت میں بڑی نظر آرہی تھی۔ میں نے قیمت دریافت کی تو چڑی مار نے جواب دیا۔

"یہ پالتو ہیں بکاؤ نہیں ۔"

میں نے دوبارہ ان لعلوں کی طرف دیکھا جن کی آزادی کے لئے اس تنگ پنجرے میں کوئی جگہ نہیں تھی۔ اس تنگ سے پنجرے میں شاید وہ اپنے پر بھی پوری طرح کھول کر پھڑپھڑا بھی نہیں سکتے۔ اسی لمحے ان کے جسموں میں حرکت پیدا ہوئی اور ان کا جسم تھوڑا سا پھول کر رہ گیا۔ بےچارے قیدی! اس لمحے میرے جی میں ایک ہی خیال آیا کہ بڑی سے بڑی قیمت ادا کر کے بھی لعلوں کی اس جوڑی کو آزاد کرا دینا چاہیئے۔ یہ خیال آتے ہی میں نے اس آدمی کی جانب دیکھا جس میں اس تنگ سے پنجرے میں لعلوں کو بند دیکھنے کی وجہ سے کچھ دیر کو غافل ہو گیا تھا۔ شاید وہ آخری چڑیا تھی جو اس نے ان قیدی چڑیوں میں سے نکالی تھی، کیونکہ اس کے فضا میں بلند ہوتے ہی اس نے پنجرے کی نیم وا دروازے کو بند کیا۔ چڑیا کو فضا میں اڑتے دیکھ کر ایک لمحے کو اس آدمی کے چہرے پر جو مسکراہٹ آئی تھی وہ اگلے ہی لمحے غائب ہو گئی۔ دوبارہ اس کا چہرہ ماتمی ہو گیا تھا۔ ایسا چہرہ جو آدمی کے حوصلے نہ نکال سکنے پر ہوتا ہے۔ پنجرے میں ابھی کافی چڑیاں باقی تھیں۔

تعارف نہ ہونے کے باوجود بے اختیار میں نے سوال کر ہی ڈالا۔" آپ روزانہ اسی طرح چڑیاں خرید کر انہیں آزاد کر دیتے ہیں۔؟" اس کے چہرے پر ناگواری کی کیفیت پیدا ہوئی چند ثانئے وہ خاموش رہا میں سمجھا کہ وہ جواب نہیں دے گا۔ مگر جب اس کا چہرہ دوبارہ پرسکون ہوا تو وہ بولا۔

"جی ہاں میرا یہی ارادہ ہوتا ہے۔ روزانہ نہیں جب جیب اجازت دیتی ہے۔ پھر آزردہ لہجے میں کہنے لگا کہ آدمی کا یہ مقدر کہاں کہ وہ اپنی خواہش کے مطابق مخلوق کو آزاد کرا سکے۔"

اس آدمی کے جانے کے بعد میں لعلوں کی خریداری تو بھول گیا اور چڑی مار کے بارے میں اس سے

سوال کر ڈالا۔

"مجھے تو اس آدمی کی گزاری ڈھیلی معلوم ہوتی ہے۔" چڑی مار نے اپنے ہاتھ کی انگلی کو کنپٹی کے ساتھ لگاتے ہوئے جواب دیا۔ "عجیب چریا پن کی باتیں کرتا ہے۔ کبھی کہتا ہے میرا آدمی قید ہے" کبھی کہتا ہے "ہم سب کا آدمی۔ کسی دن آتا ہے تو دیر تلک باتیں کئے چلا جاتا ہے۔ اور کبھی بالکل گم صم دوکان پہ آیا۔ جیب سے پیسے نکالے مجھے دیئے۔ چڑیاں اڑائیں اور یہ جا وہ جا۔"

"یار تم نے کبھی اس آدمی سے اس کا سبب دریافت نہیں کیا۔" میں نے ذرا زیادہ اپنائیت کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا۔ چڑی مار بھی شاید اس وقت کچھ موڈ میں تھا یا شاید اس کا سبب یہ ہو گا کہ ابھی اس کی دکان پر کوئی اور گاہک نہیں آیا تھا۔ کہنے لگا۔

"بابو جی ہم ایسی باتوں کے چکر میں زیادہ پڑتے نہیں ہیں اپنا تو دھندا ہی ایسا ہے کوئی گراہک آئے کہے کہ درجن بھر چڑیاں کاٹ دو تو میں ان کا سر کاٹ ڈالوں گا۔ پھر بھی میں نے ایک دفعہ یونہی پوچھ لیا تھا۔" چڑی مار نے کہا۔

"تو کیا جواب دیا تھا اس نے۔" میں نے بے تابی سے سوال کیا۔

کہتا تھا "چڑیوں میں درویشوں کی روحیں رہتی ہیں اور فقیر چاہے کسی روپ میں ہو اس کی دعا قبول ہوتی ہے۔" چڑی مار اس کے بعد خاموش ہوا یا باتیں کرتا رہا مجھے کچھ یاد نہیں۔ البتہ یہ بات سن کر پرندوں کی چہکار میں میں اپنا آپ فراموش کر چکا تھا۔ "اس آدمی نے بھی خوب طریقہ نکالا ہے۔" میں خیالات میں کھو گیا تھا۔ "یہ عجیب آدمی داستانوں کے عہد میں زندہ ہے۔ صرف اس نے تھوڑی سی تبدیلی کر لی۔ پرانے زمانے میں کسی ملک کا بادشاہ بیمار پڑتا۔ مرض لاعلاج ہو جاتا۔ حاذق طبیب اور دانا افراد عاجز و لاچار ہو جاتے تو بادشاہ کو اپنے بندی خانوں کے دروازوں کو کھول دینے اور قیدیوں کو رہا کرنے کا مشورہ دیا جاتا تھا۔" یہ سوچتے ہوئے میری نظریں دوبارہ اس تنگ سے پنجرے پر جا پڑیں جہاں سلوں کا ایک خوبصورت جوڑا اس تنگ سے پنجرے میں بیٹھا ہوا تھا اور پرواز نہیں کر سکتا تھا۔ ایک زمانہ ایسا بھی آ سکتا ہے جب وہ بالکل ہی اڑنا بھول جائیں۔ یہ خیال مجھے دوبارہ اس دکان کے ماحول میں کھینچ لایا تھا۔

"یہ جوڑا بیچ دو۔"

"نہیں بابو جی بالکل نہیں۔ یہ تو اپنے پارٹنر کے شوق کی چیز ہے۔ یہ تو ایک لاکھ روپے میں بھی نہ دوں گا" چڑی مار نے جواب دیا۔ "اتنی زیادہ رقم میرے پاس ہے بھی نہیں" میں نے ہنس کر کہا تھا۔ اور میں یہ سوچ کر افسردہ ہو گیا تھا کہ میں اس جوڑے کو آزاد کرانے کا اختیار نہیں رکھتا۔ اسی لمحے میں نے فیصلہ کیا تھا کہ جب میں کسی کو آزاد نہیں کرا سکتا تو مجھے کسی کو قید کرنے کا بھی کوئی حق نہیں ہے۔ میں اپنے بچے کے لئے لعل خرید کر نہیں لے جاؤں گا۔ ایک حسرت بھری نگاہ میں اس تنگ پنجرے کے باسیوں پر ڈالتا ہوا وہاں سے چلا آیا تھا۔

گھر پہنچا تو دروازہ کھولتے ہی بیوی نے سوال کیا۔ "نے آئے ہو۔ بچہ صبح سے انتظار کر رہا ہے۔" اتنے میں میرا چھوٹا بچہ دوڑتا ہوا آکر لپٹ گیا۔ اور پوچھنے لگا۔ "ابو میلی چلیاں لائے" (ابو میری چڑیاں لائے)

"بیٹے دکاندار نے کہا ہے کہ وہ کل تک ہمیں لعل پکڑ دے گا۔ کل ضرور لاکر دوں گا اپنے بیٹے کو" بسکٹ اس کی جانب بڑھاتے ہوئے میں نے کہا۔ "یہ لو بسکٹ کھاؤ آہا آہی کتنا اچھا ہے۔"

جب میں نے بیگم کو سارا واقعہ سنایا اور کہا کہ پرندے جن میں لعل اور چڑیاں سبھی شامل ہیں اس لئے نہیں ہوتے کہ انہیں قید کیا جائے تو اس نے برہم ہو کر جواب دیا۔

"تم تو ہمیشہ کے ضعیف الاعتقاد ہو۔ کیا تم یا وہ پاگل آدمی دنیا کے سارے پرندوں کو جہاں جہاں بھی وہ قید ہیں آزاد کرا سکتے ہو"؟

"اونہہ بے وقوف، چڑیاں آزاد کرانے سے کہیں قیدی بھی آزاد ہوتے ہیں۔ اور پھر اس کی بات کا تو ایک جواز ہے۔ وہ تو اپنے کسی آدمی کو قید سے چھڑانے کے لئے یہ سب کچھ کر رہا ہے۔ آپ کو تو کسی آدمی کو قید سے نہیں چھڑانا۔ سب لوگ تمہاری طرح کے ہو جائیں تو بس دنیا کا کام چل چکا۔"

"میری بات تو سنو" میں نے ملتجیانہ انداز میں کہا۔ "چڑی مار کا بیان ہے کہ وہ عجیب آدمی کبھو کبھی یہ بھی کہتا ہے کہ وہ تنہا اس کا آدمی نہیں ہے۔"

مگر شاید مجھے اپنی دلیل کمزور پڑتی محسوس ہوئی اور حقیقت میں یہ کوئی ایسی دلیل بھی نہیں تھی۔ اسی وجہ سے مجھے یہ کہنا پڑا کہ "ہے یہ عجیب سی بات، کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔"

وہ اپنی بات پر مُصر تھی۔ "میں کچھ نہیں جانتی کل آپ لعلوں کا ایک جوڑا ضرور خرید کر لائیں

گے۔ بچہ کتنا انتظار کر رہا ہے آپ کو کیا معلوم ؟"

مجھے سب کچھ معلوم تھا۔ صبح ہوتے ہی ہمارے کمرے کے دریچے کے باہر اُگے ہوئے درخت پر چڑیاں آکر شور مچانا شروع کر دیتی ہیں۔ ان میں سے کئی چڑیاں پھدک پھدک کر درخت کی شاخوں سے اندر کمرے تک آتی جاتی رہتی ہیں اور میرا بچہ ان چڑیوں کو دیکھ دیکھ کر خوش ہوتا رہتا ہے۔ ہمیں اس مکان میں آئے ہوئے ابھی ایک سال بھی نہیں ہوا۔ جب ہم یہاں آئے تو گرمی کا موسم تھا۔ کمرے میں آجانے والی بہت ساری چڑیوں میں سے اکثر ایک نہ ایک چڑیا تیز رفتار پنکھے سے ٹکرا کر مر جاتی مگر نہ تو پنکھا بند کیا جا سکتا تھا اور نہ چڑیوں کے شوقِ پرواز میں کمی آسکتی تھی۔

صبح دفتر جاتے ہوئے جب یہی تقاضا ہوا تو میں نے ایک بار پھر سمجھانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا "بچے کی بات ہے۔ دو چار دن کی ضد ہے بھول جائے گا۔ تم زمین پر باجرا ڈال دیا کرو بہت ساری چڑیاں جمع ہو جایا کریں گی۔ بچہ خوش ہو جائے گا۔"

"میں کہتی ہوں نہیں نہیں" بیگم نے چیخ کر کہا "چڑیاں اس طرح کبھی اس کے پاس نہیں ٹھہریں گی۔ پھر ان چڑیوں کا رنگ بھی تو لعلوں جیسا نہیں ہوتا۔"

دوکان پر پہنچا تو وہی منظر گویا میرا منتظر تھا۔ وہ پرندے اسی تنگ سے پنجرے میں مقید۔ میں نے اپنی نظریں اس جانب سے ہٹالیں اور چڑی مار سے معاملے کی بات کرنے لگا۔

"بابو جی یہ جوڑی لے جائیں بچوں کے لئے ابھی کچھ دن میں ان کے پروں کا رنگ گہرا ہو جائے گا۔ برسات سر پر کھڑی ہے۔ بارش کے ساتھ ہی ان کے پروں پر بھی ایسے ہی خوبصورت نشان آجائیں گے۔"

چڑی مار نے اس تنگ سے پنجرے کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ نہ جانے اس لمحے میں نے کیسے خود کو وہاں سے فرار ہونے سے روکا تھا۔

کافی دن گذر گئے میں اپنے گھر میں دو قیدیوں کو دیکھنے کا عادی ہو گیا تھا۔ ایک دن میری بیوی کہنے لگی "ان لعلوں نے تو ابھی انڈے بھی نہیں دیئے۔ معلوم نہیں یہ جوڑا ہے بھی یا نہیں۔ اتنے بڑے پنجرے میں یہ دو اچھے نہیں لگتے۔ ایک دو جوڑا اور خرید لاؤ۔"

میں اس دکان پر پہنچا تو وہ عجیب آدمی وہاں موجود تھا اور چڑیاں آزاد کر رہا تھا۔ غیر ارادی طور پر میرے منہ سے نکل گیا۔

"کیوں صاحب ابھی تک آپ کا آدمی ..... ؟"

ابھی میں اپنی بات پوری بھی نہ کر پایا کہ وہ تقریباً چیخ کر بولا۔ اس کے چہرے کا رنگ متغیر ہو گیا تھا۔

تم .... لاعلم .... پھر اس نے تیزی سے پنجرے سے ہاتھ نکالا۔ چڑی مار نے بجلی کی سی تیزی سے آگے بڑھ کر پنجرہ بند کر دیا تاکہ چڑیاں بغیر حساب کے آزاد نہ ہو سکیں، میں اس چہرے اور اس آواز سے ڈر گیا تھا اور بغیر لعل خریدے وہاں سے واپس چلا آیا تھا۔

وہ چہرہ جو بیک وقت قید بھی تھا اور آزاد بھی، اس نے مجھے اپنی قید میں لے لیا تھا۔ راستے میں اور گھر تک پہنچنے کے بعد بھی میں اس چہرے اور اس آواز کو فراموش نہیں کر پایا تھا۔ مجھے یوں لگ رہا تھا گویا زندگی کے اس ان دیکھے پہلو کا انکشاف جو مجھ پر تھوڑے دن پہلے ہوا تھا آج اس کی تکمیل ہوئی ہو۔ اس روز بھی گھر میں ہم تین نفوس تھے۔ اور کمرے کے باہر دریچے پر جھکا ہوا درخت اور لعلوں کا وہ جوڑا جس کی نسل بڑھنے کی ہمیں فکر تھی ... جتنے لال چاہوں میں انہیں لا کر اس پنجرے میں بند کر سکتا ہوں۔ مگر کیا جب میں چاہوں تو انہیں آزاد بھی کر سکتا ہوں، ؟ بیوی اور بچے کا چہرہ میری آنکھوں کے سامنے تھا۔ یہی میری قید تھی۔ بیوی جو باورچی خانے میں کام میں مصروف تھی اور بچہ جو کھلونوں سے کھیلنے میں مصروف تھا۔ شام کے اس سناٹے میں لعل درخت کے تلے تنہا بیٹھے تھے۔

رات کو کونسا پہر تھا جب میری آنکھ کھل گئی۔ وہاں میرے سوا سب تھے بھی اور نہیں بھی۔ میں آگاہی کے اس لمحے میں تھا جب اس عجیب آدمی کا چہرہ رات کے اس سمے میرا تعاقب کرتا ہوا یہاں تک آ گیا تھا۔ وہ آدمی جو خود بھی ایک قیدی ہی تھا اپنے کرب کا قیدی۔ قید صرف سنگ و آہن کی دیواروں کے پیچھے مجبور کر دیئے جانے کا نام تو نہیں۔ وہ اپنے کرب سے نجات پانے کے لئے چڑیاں آزاد کرتا تھا۔ اس کا یہ عمل کس کے لئے تھا۔ میں نہیں جانتا۔ ہاں یہ ہے کہ دوسروں کے ساتھ ہم بھی ان کی قید میں اپنی آزادی کے باوجود شریک ہوتے ہیں۔ دوئی مٹ گئی تھی، وہ چہرہ اور میں اب ایک ہی تھے۔ مجھے اپنے ہر موئے بدن سے ایک ہی آواز سنائی دے رہی تھی۔ یہ آواز، حکم کے مانند تھی۔ اور اس سے نجات کی ایک ہی صورت تھی۔ آخر وہ لمحہ آ پہنچا جب آدمی ہر پابندی اور قید سے ماورا ہو جاتا ہے۔ اور میں نے اس اندھیری رات میں اٹھ کر پنجرے کا دروازہ کھول دیا۔

ولیم فاکنر
انعام الحق

بال

سوسن ریڈ یتیم بچی تھی۔ وہ برشت گھرانے کے ساتھ رہتی تھی، جن کے اپنے دو تین بچے تھے، بعض لوگ کہتے تھے کہ سوسن ان کی بھانجی یا بھتیجی ہے بعض حسبِ معمول برشت بلکہ اس کی بیوی کے کردار پر بھی شبہ کرتے تھے۔ ظاہر ہے کہ اس قسم کا شبہ زیادہ تر عورتیں ہی کیا کرتی ہیں۔

جب ہاک شا پہلے پہل موسم گرما میں اس بستی میں آیا اور اس نے میکسی حجام کی دکان میں کام کرنا شروع کیا اس وقت وہ پانچ برس کی تھی، مسز برشت سوسن کو ساتھ لئے پہلی بار وہاں آئی۔ میکسی نے مجھے بتایا کہ وہ اور دوسرے حجام یہ تماشا دیکھتے رہے کہ مسز برشت تین دن تک سوسن کو دکان کے اندر لے جانے کی کوشش کرتی رہی۔ اس وقت وہ دُبلی پتلی ننھی سی لڑکی تھی۔ اس کی آنکھیں بڑی بڑی اور وحشت زدہ تھیں اس کے سیدھے سیدھے بالوں کی رنگت نہ مرمریں اور نہ بھوری۔

میکسی نے بتایا کہ کیسے بالآخر ہاک شا دکان سے نکل کر بازار گیا اور پندرہ منٹ کے بعد کوشش کر کے اس نے لڑکی کو دکان کے اندر لا کے اپنی کرسی پر بٹھا دیا۔ یہ وہ شخص تھا جسے کسی نے بستی کے کسی مرد یا عورت سے ہاں یا نہیں سے زیادہ بات کرتے نہیں دیکھا تھا۔

"مجھے ایسا لگتا تھا کہ جیسے ہاک شا یہ جانتا تھا کہ سوسن اس کے ساتھ چلی آئے گی" میکسی نے بتایا۔

سوسن نے عمر میں پہلی بار بال کٹوائے اور ہاک شا نے ہی کاٹے۔ وہ اور آل کے نیچے سمٹی سمٹائی خرگوش کی طرح بیٹھی رہی لیکن چھ ماہ بعد وہ از خود دکان میں آنے لگی اور صرف شا کو اپنے بال کاٹنے دیتی۔ لیکن اس کے باوجود اپنے وحشت زدہ چہرے اور بڑی بڑی آنکھوں کے ساتھ اور آل کے اوپر سے خرگوش ہی سی لگتی تھی۔

میکسی کا کہنا ہے کہ اگر ہاک شا مصروف ہوتا تو وہ اس کی کرسی کے قریب دوسری نشست پر بیٹھ جاتیں

سامنے پھیلا کر اس وقت تک بیٹھی رہتی جب تک ہاک شا کام سے فارغ نہ ہو جاتے۔ میکسی کا خیال تھا کہ وہ ہاک شا کی مستقل گاہک تھی۔ اور یہ خیال درست تھا کیونکہ جب ایک بار ایک اور حجام میٹ فاکس نے بال تراشنے کی پیشکش کی تو ہاک شا جو معروف تھا بجلی کی طرح کوند کر اس کی طرف مڑا اور کہا" میں بس ایک منٹ میں فارغ ہوا جاتا ہوں۔ اس کا کام میں خود کر۔ دوں گا"

میکسی نے مجھے بتایا کہ اس وقت ہاک شا کو اس کی دکان میں کام کرتے ہوئے تقریباً ایک سال ہو چکا تھا اور یہ پہلا موقع تھا کہ اس نے کسی بات کے متعلق اس قدر مثبت انداز میں گفتگو کی ہو۔

اس موسم خزاں میں لڑکی اسکول جانے لگی۔ وہ روزانہ صبح شام حجام کی دکان کے سامنے سے گزرتی۔ وہ اب بھی شرمیلی تھی اور چھوٹی بچیوں کی طرح تیز تیز چلا کرتی تھی۔ اس کا زرد بادامی رنگ سَر کھڑکی کے پاس سے اس تیزی سے مڑ سے نکل جاتا تھا جیسے وہ پہیوں پر چلی جارہی ہو۔ پہلے وہ ہمیشہ اکیلی ہوتی لیکن جلد ہی اس کا سر اور سروں کے ہجوم میں مل جاتا۔ سب لڑکیاں باتیں کرتی جاتیں اور وہ کھڑکی کی طرف بالکل نہیں دیکھتی مگر ہاک شا کھڑکی کے پاس کھڑا برابر باہر دیکھتا رہتا۔

میکسی نے بتایا کہ " مجھے اور میرے میٹ کو وقت دیکھنے کے لئے کبھی کلاک کی طرف نظر اٹھانے کی ضرورت نہیں پڑتی تھی کیونکہ ادھر آٹھ بجنے میں پانچ منٹ باقی ہوتے یا تین بجتے کہ ہاک شاہ کھسک کر کھڑکی کے پاس چلا جاتا۔ اسے اپنے اس فعل کا ذرا برابر احساس نہ ہوتا تھا۔ وہ اس وقت تک وہاں کھڑا رہتا جب تک اسکول کے تمام بچے گزر نہ جائیں۔ میکسی نے یہ بھی بتایا کہ جب سوسن بال ترشوانے دکان میں آتی تو ہاک شاہ اسے پیپرمنٹ کی دو تین گولیاں دیتا حالانکہ دوسرے بچوں کو وہ صرف ایک ایک گولی دیا کرتا تھا۔

دوسرے میٹ حجام فوکس نے مجھے اس گڑیا کے متعلق بتایا جو ہاک شا نے کرسمس کے موقعہ پر سوسن کو دی تھی۔ مجھے یہ نہیں معلوم کہ اسے یہ بات کیسے معلوم ہوئی۔ وہ ہاک شا کے بارے میں میکسی سے کہیں زیادہ جانتا تھا۔ وہ خود شادی شدہ تھا۔ ڈھیلا ڈھالا پھُس پھُسا سا فربہ آدمی۔ چہرہ جذبات سے خالی تھکی تھکی اداس آنکھیں مگر تھا بہت پُرمذاق آدمی۔ اور ہاک شا کی طرح ماہر حجام۔ وہ بھی زیادہ باتیں نہیں کرتا تھا۔ معلوم نہیں ہاک شا کے متعلق اس نے اتنی معلومات کہاں سے حاصل کیں۔ حالانکہ کوئی باتونی آدمی اس سے کچھ بھی معلوم نہ کر سکتا تھا۔ عموماً باتونی آدمی کو سوائے لفاظی کے اور کسی چیز سے کوئی سروکار نہیں ہوتا۔

بہرکیف میٹ نے مجھے بتایا کہ ہاک شا بڑی باقاعدگی سے لڑکی کو ہر کرسمس پر تحفہ دیتا رہتا تھا حتیٰ کہ

جب وہ کافی سیانی ہوگئی تو بھی وہ اس کی کرسی پر آکر بیٹھتی تھی اور ہاک شا اُسے صبح و شام اسکول آتے جاتے برابر دیکھتا رہتا۔ کوئی تصور بھی نہیں کر سکتا تھا کہ یہ وہی دُبلی پتلی لڑکی ہے جو بڑی تیزی سے بڑی ہو گئی ہے اور اب وہ پہلے کی طرح شرمائی بھی نہیں رہتی تھی۔

کچھ لوگ کہتے تھے: اس کا سبب اس کی یتیمی ہے۔ لیکن یہ بات نہ تھی۔ لڑکیاں لڑکوں سے مختلف ہوتی ہیں۔ وہ مقابلتاً لڑکوں سے کمزور ہوتی ہیں۔ آپ کسی ساٹھ سالہ مرد کو دیکھ لیجئے۔ اس کی پیرانہ سالی اور طفلانہ پن میں کچھ زیادہ فرق نظر نہیں آئے گا۔

یہ بات نہیں تھی کہ وہ بڑی تھی کوئی عورت کبھی بڑی پیدا نہیں ہوتی یا وہ سب ہی بڑی پیدا ہوتی ہیں اور جنم لیتے ہی ان میں بڑائی آجاتی ہے۔ بات دراصل یہ ہے کہ ان کی شادی اس منزل سے قبل کر دینا چاہیئے جب کہ بڑائی ایک فطری انجام کو پہنچ جاتی ہے۔ ہم انہیں ایک نظام کا پابند بنانے کی کوشش کرتے ہیں جس کا تقاضا یہ ہے کہ ایک عورت کی اس وقت تک شادی نہیں ہو سکتی جب تک کہ وہ ایک خاص عمر کو نہ پہنچ جائے۔ قدرت ایسے کسی نظام کی پابند نہیں ہوتی۔ چہ جائے کہ عورتیں اس قسم کی پابندی پر توجہ کریں۔

وہ بہرحال بہت جلد بڑھی اور مروجہ نظام کے تصدیق کرنے سے پہلے وہ بلوغت کی آخری حد تک پہنچ گئی۔ میں اس بارے میں خود کوئی رائے زنی نہیں کر سکتا کیونکہ میں خود ایک بیٹی کا باپ ہوں۔

میٹ نے بتایا کہ ابھی وہ تیرہ سال کی ہوگی کہ مسز برنشت نے غازہ لگانے پر چھڑی سے اس کی پٹائی کی۔ اس نے یہ بھی کہا کہ اس سال کے دوران وہ بدتمیزی کے ساتھ قہقہے لگاتی، دو تین لڑکیوں کی معیت میں تمام وقت بازاروں میں گھومتی رہتی تھی۔ حالانکہ اسے اس وقت اسکول میں ہونا چاہیئے تھا۔ تھی وہ پہلے کی طرح دُبلی پتلی۔ اس کے بال سنہرے یا بھورے سیاہ نہیں ہوئے تھے۔ اس کے گال پینٹ سے اتنے تھپے رہتے تھے کہ یہ گمان ہونے لگتا کہ ادھر وہ ہنسی اور ادھر سوکھی ہوئی کیچڑ کی طرح اس میں دراڑیں پڑجائیں گی۔ وہ چھوٹی دھاریوں والے ایسے سوتی لباس پہنتی جو ایک تیرہ سالہ لڑکی کے لئے بہت چست اور تنگ ہوتے اور جن کا مقصد سوائے اس کے کچھ نہیں تھا کہ وہ بھی بڑی لڑکیوں کی طرح اپنے جسم کے خطوط کی نمائش کر سکے۔

میٹ نے بتایا کہ جب اس نے ایک روز اُسے گزرتے ہوئے دیکھا تو اسے محسوس ہوا کہ وہ جرابیں نہیں پہنے ہے اور اسے یہ بھی احساس ہوا کہ اس کی ٹانگیں ایک عورت کی جیسی تھیں۔ اگرچہ وہ ابھی

صرف تیرہ سال کی چھوکری تھی۔

میں کہتا ہوں کہ وہ مجبور تھی۔ اس میں نہ اس کا کوئی قصور تھا اور نہ برشت ہی کا بچوں کے ساتھ جرائم تک بھی بدنصیب ہوتی ہیں کیونکہ وہ چھوٹی ہوکر اتر جاتی ہیں۔ صرف مردوں کا ہی رویہ ان کے ساتھ نرم ہوتا ہے۔ مثال کے طور پر اس بستی کے مردوں کو ہی لے لیجئے۔ وہ ہاک شا کے ساتھ کس طرح پیش آتے تھے۔ اس کے متعلق تمام باتیں معلوم ہو جانے کے بعد بھی جب کبھی چہ می گوئیاں ہوتیں تو ان میں کسی کی بھی ہمت نہیں پڑتی تھی کہ ہاک کے سامنے کوئی بات کر سکے۔ ان کے خیال میں وہ بھی اس بات سے واقف تھا۔ اس کو بھی سن گن ہو گئی ہوگی، لیکن جب بھی وہ لڑکی کے متعلق دکان میں گفتگو کرتے تو شا کی غیبت میں۔

میرا تو یہ خیال ہے کہ یہ سب لوگ کچھ یوں ہی سے تھے۔ کیونکہ ان میں کوئی ایک بھی ایسا نہ تھا جس نے ہاک شا کو کھڑکی میں سے لڑکی کو سڑک یا بازار سے گزرتا دیکھتے ہوئے نہ پایا ہو۔ لیکن وہ ظاہر یہی کرتا کہ وہ اتفاقاً اس وقت سینما کے سامنے سے گزر رہا تھا جب کہ شو ختم ہوا تھا اور وہ اس وقت کسی نوجوان کے ساتھ باہر نکل رہی ہوتی۔

سوسن نے چودہ سال کی عمر سے پہلے جوانوں کے ساتھ گھومنا شروع کر دیا تھا۔ لوگ کہتے تھے کہ وہ گھر والوں کی نظریں بچا کر نکل جاتی تھی اور پھر چپکے سے گھر واپس آجاتی۔ مسز برشت یہ سمجھتی تھیں کہ کسی سہیلی کے گھر میں ہوگی۔

لوگ ہاک شا کے سامنے اس کا کوئی ذکر نہیں کرتے تھے اور اس کے رات کا کھانا کھانے کے لئے جانے کا انتظار کرتے رہتے یا پھر اس وقت کا جب وہ اپریل میں دو ہفتوں کے لئے تعطیلات گزارنے کے لئے چلا جاتا جس کے متعلق کسی کو نہیں معلوم ہوتا کہ وہ کہاں جاتا تھا۔ اور اس کے جانے کے بعد بھی وہ لڑکی کو ادھر ادھر مارا مارا پھرتے اور ہنگامہ آرائی کرتے دیکھتے رہتے۔ وہ جلد یا بدیر مصیبت میں ضرور پڑ جاتی تھی، حالانکہ مسز برشت کو پہلے ہی سے معلوم ہو جایا کرتا تھا۔

اس نے ایک سال پہلے ہی اسکول چھوڑ دیا تھا۔ برشت اور اس کی بیوی یہی سمجھتے رہے کہ وہ روزانہ اسکول جاتی ہے۔ حالانکہ وہ عمارت کے اندر جھانکتی تک نہ تھی۔

وہ اسکول کے لڑکوں یا شادی شدہ مردوں میں سے کسی سے بھی بلا امتیاز اسکول سے ہر مہینے رپورٹ منگانے کا انتظام کر لیتی تھی اور خود ہی اسے پڑھ کر کے مسز برشت سے دستخط کرانے کے لئے گھر

لے آتی تھی۔ بالآخر اس نے اسکول چھوڑ دیا اور وس سینٹ کے ایک اسٹور میں کام کرنے لگی۔ وہ دکان پر بال ترشوائے آتی تو چہرے پر پینٹ تھپا ہوتا اور ایسے بیہودہ رنگ کے لباس میں آتی جس سے اس کا پورا جسم نظر آتا تھا۔ اس کا چہرہ بہ یک وقت جرأت، احتیاط اور ژرف نگاہی کا آئینہ دار ہوتا۔ بال چھپے اور چہرے کے گرد بکھرے ہوتے۔ اس کا لباس بھی بالوں کے زرد یا بادامی رنگ پر اثر انداز نہیں ہوتا تھا وہ جون کے توں رہتے۔

وہ ہمیشہ ہاک شا کی کرسی پر نہیں بیٹھتی تھی، بعض اوقات کسی اور کرسی پر جا بیٹھتی اور حجاموں سے باتیں کیا کرتی۔ اس کے آتے ہی ساری دکان شور و غل اور خوشبو سے بھر جاتی۔ اس کی ٹانگیں سائے کے نیچے سے باہر نکلی ہوتیں۔ ایسے وقت ہاک شا اس کی طرف نگاہ تک نہیں اٹھاتا تھا اور کام سے فارغ ہونے کے بعد بھی نظریں نیچے کیے سوچ میں ڈوبا نظر آتا تھا اور یہ ظاہر کرنے کی کوشش کرتا کہ وہ معروف ہے حالانکہ وہ اس کے لباس کی تہوں میں کھویا ہوتا تھا۔

انہیں حالات کے دوران جب وہ حسب معمول اپریل کی مخصوص تعطیلات میں اپنے پوشیدہ سفر پر روانہ ہوا جس کے متعلق لوگوں نے پوچھنا ہی چھوڑ دیا تھا۔ میں چند روز بعد جیفرسن پہنچا اور دکان میں داخل ہوا تو لوگ اس کے اور لڑکی کے متعلق چہ میگوئیاں کر رہے تھے۔

"کیا وہ اب بھی اس کو کرسمس میں تحفے دیتا ہے" میں نے پوچھا۔

"اس نے دو سال پہلے اسے ایک کلائی کی گھڑی خرید کر دی تھی" میٹ فوکس نے اطلاع دی۔ "اس نے اس کے ساٹھ ڈالر ادا کیے تھے"

میکسی ایک گاہک کی شیو بنا رہا تھا۔ وہ رک گیا، جھاگ میں لتھڑا ہوا استرہ اس کے ہاتھ میں تھا۔

"واللہ!" وہ بولا۔ پھر تو اس نے یقیناً ـــــ تمہارا خیال ہے کہ وہ........ تھا..... وہ تھا جس.....

میٹ نے ادھر ادھر دیکھے بغیر کہا۔ اس نے ابھی گھڑی اسے نہیں دی....

"خوب۔ لعنت اس کنجوس پر" میکسی بولا "کوئی بوڑھا آدمی بھی جوان لڑکی کے پیچھے بیوقوف بنتا ہے؟ یقیناً وہ بہت بڑا ہے۔ لیکن ایسا آدمی جو کسی کے ساتھ فریب کرے اور اسے کچھ دے بھی نہیں"

میٹ نے گھوم کر دیکھا وہ بھی ایک گاہک کی شیو بنا رہا تھا "اگر تم کو معلوم ہو جائے کہ اس نے گھڑی اس لڑکی کو کیوں نہیں دی تو پھر کیا کہو گے؟ سنو، وہ سمجھتا ہے کہ لڑکی ابھی اتنی کمسن ہے کہ اسے سوائے اپنے

عزیزوں کو اور کسی سے زیور نہیں ملنے چاہئیں۔"

میٹ پھر کام میں لگ گیا۔ اس کی کہنی باقاعدگی سے حرکت کرنے لگی اور استرہ ہلکے ہلکے جھٹکوں سے چلنے لگا "اسے یہ کیسے معلوم ہو سکتا ہے سوائے کسی عورت کے اور کوئی اسے یہ بات بتا نہیں سکتا! اور مسز کوفان کے علاوہ وہ کسی عورت کو نہیں جانتا۔ میرا خیال ہے اسے سُن گُن لگ گئی ہوگی۔"

"یہ سچ ہے۔" میکسی بولا۔

بدھ کی صبح کو جب میں وہاں پہنچا تو ہاک شا دو ہفتے قبل چھٹی پر جا چکا تھا۔ میں نے جیفرسن میں ڈیڑھ دن میں سب کام ختم کیا اور وہاں سے چل دیا۔

آئندہ ہفتہ کے وسط میں میں ڈویژن پہنچ گیا۔ مجھے کوئی جلدی نہ تھی میں اسے موقعہ دینا چاہتا تھا۔

(۲)

اگر اس نے کبھی کسی سے محبت کی ہوتی تو کوئی نہ کوئی تو کہتا کہ ہاک شا نے اسے بھلا دیا تھا مطلب بہت سے ہے۔ میں نے ان دنوں سڑکوں پر کام شروع نہیں کیا تھا (یہ تیرہ سال پہلے کی بات ہے) اسے میں نے پورٹ فیلڈ میں ایک حجام کی دکان میں ایک کرسی کے پیچھے کھڑا دیکھا تو میرے منہ سے بے اختیار نکل گیا۔ یہ رہا ایک پیدائشی کنوارا۔ یہ رہا ایک آدمی جو تنہا پیدا ہوا اور اب چالیس سال کا ہو چکا ہے۔

معمولی سی خاکستری رنگت کا آدمی جس کا چہرہ ایسا تھا کہ دس منٹ بعد آپ کو یاد نہ رہے اور آپ سے پہچان نہ سکیں۔ وہ سرج کے نیلے سوٹ میں ملبوس اور سیاہ بوٹائی لگائے تھا۔ جو پیچھے سے جُڑی تھی جیسے آپ سٹور سے بندھی کی بندھی خریدتے ہیں۔ میکسی نے مجھے بتایا کہ ایک سال بعد جب وہ جنوب کو جانے والی ٹرین سے جیفرسن کے اسٹیشن سے اترا تو اسی نیلے سوٹ میں تھا اور وہی ٹائی لگائے تھا۔ وہ مصنوعی چمڑے کا ایک سوٹ کیس اٹھائے ہوئے تھا اور جب میں نے اسے اگلے سال جیفرسن میں میکسی کی دکان میں ایک کرسی کے پیچھے کھڑا دیکھا اور اگر وہ کرسی وہاں نہ ہوتی تو اسے ہرگز نہ پہچان سکتا۔ وہی ٹائی یوں لگتا تھا گویا اسے کرسی گاہک اور سب ساز و سامان کے ساتھ اٹھا کر ساٹھ میل دور بجنسہ لا کر رکھ دیا گیا ہے۔ مجھے یقین کرنے کیلئے کھڑکی سے باہر دیکھنا پڑا کہ کہیں میں ایک سال قبل تو پورٹ فیلڈ میں نہیں آ گیا اور فوراً مجھے خیال آیا: کہ چھ ہفتے پیشتر جب میں پورٹ فیلڈ گیا تھا تو وہ وہاں موجود تھا

مجھے اس کے متعلق یہ تمام حالات تین سال بعد معلوم ہوئے ہیں سال میں چار پانچ بار ڈویژن جایا کرتا تھا مس سی پی اور ایلا باکی ریاستوں کی حد بندی کے خط متعارفہ پر ایک اسٹور، چار پانچ مکانات اور لکڑی چیرنے کا ایک کارخانہ واقع تھے۔ میں نے وہاں ایک گھر دیکھا تھا جو وہاں کے بہترین گھروں میں سے تھا۔ گھر ہمیشہ بند رہتا تھا۔ جب میں بہار کی آخر راتوں یا ابتدائی گرمیوں میں ڈویژن کا قصد کرتا تو اس گھر کے قریب کام کاج کے آثار ہمیشہ نظر آتے۔

صحن گھاس پھوس سے صاف۔ پھولوں کی کیاریاں اور باڑیں اور چھت مرمت کی ہوئی ہوتیں۔ پھر جب میں موسم خزاں یا سردیوں میں ڈویژن واپس جاتا تو صحن میں پودے وغیرہ اور جنگلے کی ایک آدھ لکڑی غائب ہوتی جو دوسرے لوگ اپنے جنگلے کی مرمت کے لئے اکھاڑ کر لے جاتے یا ایندھن کے طور پر جلا دیا کرتے اور گھر ہمیشہ بند رہتا تھا۔ باورچی خانے کی چمنی میں سے کبھی دھواں اٹھتا نظر نہیں آیا۔ چنانچہ ایک روز میں نے اسٹور کیپر سے پوچھا تو اس نے مجھے بتایا کہ یہ ایک شخص اسٹار نز کی ملکیت تھا لیکن اس کا سارا خاندان مر چکا تھا۔ وہ بہت اچھے لوگ سمجھے جاتے تھے۔ وہ کچھ رہن شدہ زمین کے مالک تھے۔ اسٹارنز ان کاہل آدمیوں میں سے تھا جنہیں پیٹ بھر کھانا اور پینے کو تمباکو مل جائے تو اسی میں مگن رہتے۔

اسٹارنز کی ایک بیٹی تھی جو گھر سے بھاگ گئی تھی اور اس نے ایک مزارع کسان کے نوجوان بیٹے سے شادی کر لی تھی۔ اس کو یہ بات بالکل پسند نہ تھی۔ لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اسٹارنز کو اس پر کوئی اعتراض نہ تھا۔ شاید اس کی وجہ یہ تھی کہ یہ نوجوان جس کا نام اسٹرائیلنگ تھا اتنا ہی جفاکش تھا جتنا اسٹارنز کاہل اور سست تھا اور اس صورت میں وہ اعتراض کر بھی نہیں سکتا تھا۔

بہر حال ان کی نسبت طے ہو چکی تھی اور اسٹرائیلنگ نے کافی روپیہ جمع کر لیا تھا اور گیسو تراشی کی تربیت حاصل کرنے کے لئے برمنگھم چلا گیا۔ اس نے سفر کا کچھ حصہ ویگن میں اور باقی پیدل چل کر طے کیا تھا۔ وہ ہمیشہ موسم گرما میں لڑکی سے ملنے آتا تھا۔

اور پھر یوں ہوا کہ ایک روز اسٹارنز ڈیوڑھی میں کرسی پر بیٹھا بیٹھا چل بسا۔ کہتے ہیں کہ وہ اتنا کاہل تھا کہ سانس بھی لینا نہیں چاہتا تھا۔ لوگوں نے اسٹرائیلنگ کو بلا بھیجا۔ اس کے متعلق میں نے یہ سنا تھا کہ برمنگھم کی دکان میں اس کا اچھا خاصا کاروبار چل رہا تھا۔ وہ روپیہ بھی پس انداز کر رہا تھا۔ اس نے مکان کا بھی انتخاب کر لیا تھا اور فرنیچر اور سب سامان کی قیمت بھی ادا کر دی تھی اور اس موسم گرما میں وہ شادی

کرنے والا تھا۔ اسٹارنز کے پاس لے دے کے صرف رہن شدہ زمین تھی۔ چنانچہ تجہیز و تکفین کے تمام اخراجات اسٹرائیلنگ کو ادا کرنا پڑے۔

اسٹرائیلنگ کو یہ سودا بہت مہنگا پڑا۔ اسے اسٹارنز کی بیوی کے لئے ماتمی لباس سلوانا ضروری تھا چنانچہ اسے از سرِ نو محنت شروع کرنا پڑی۔ لیکن وہ مکان کرایہ پہلے چکا تھا۔ فرنیچر اور انگوٹھی کی قیمت ادا کر چکا تھا اور شادی کا لائسنس بھی خرید چکا تھا۔ لیکن اس کی پھر طلبی ہوئی۔ اب کی لڑکی کی باری تھی۔ اسے کسی قسم کا بخار تھا۔

قولت پسند لوگ تو آپ جانتے ہی ہیں کس قسم کے ہوتے ہیں۔ نہ کوئی ڈاکٹر نہ حکیم۔ اور اگر کوئی ہو بھی تو اسے یہ لوگ تو پ دم کرا دیں۔ گولی سے اڑا دیں۔ سردی لگ جائے تو بلا سے لگ جائے۔ عین ممکن کہ تندرست ہو جائیں۔ اس کا بھی قوی امکان رہتا ہے کہ دو دن کے بعد ہیضہ کرکے قضا کر جائیں۔

جب اسٹرائیلنگ پہنچا اس وقت لڑکی ہذیانی کیفیت میں تھی۔ اس کے سب بال مونڈ دیئے گئے اور یہ کام اسٹرائیلنگ کو انجام دینا پڑا۔ کیوں کہ وہ اس کام میں ماہر تھا اور پورے خاندان میں پیشہ ور وہی تھا۔

لوگوں نے مجھے بتایا کہ اسٹرائیلنگ کی منسوبہ نحیف و ناتواں تھی اس کی صحت کبھی ٹھیک نہیں رہتی تھی اور بالآخر وہ یہ جانے بغیر کہ اس کے بال کس نے کاٹے تھے۔ مرگئی۔ وہ ہذیانی حالت میں یہی بڑبڑاتی تھی کہ ماں کا خیال رکھنا۔ رہن شدہ جائیداد! ابا جان اسے اس حالت میں چھوڑ نا پسند نہیں کریں گے! ہنری کو بلاؤ! ہنری اسٹرائیلنگ یعنی ہاک شا۔

اس واقعہ کے دوسرے سال جب میں نے اسے جیفرسن میں دیکھا تو میں نے کہا اچھا! تو تم ہی ہو ہنری اسٹرائیلنگ۔

ہاک شا کے پاس لڑکی کی ایک تصویر تھی۔ یہ اس کی واحد تصویر تھی۔ ہاک شا نے بالوں کی ایک لٹ کے ساتھ جو اس نے کاٹ لی تھی۔ تصویر کے ساتھ ایک زرگی رسالہ کو بھیج دیا تھا کہ ان بالوں سے تصویر کا فریم بنا دیا جائے لیکن تصویر اور بال ڈاک میں کہیں گم ہو گئے۔

اس نے لڑکی کی تجہیز و تکفین کی۔ مکان چھوڑ دیا جو کرایہ پر تھا اور فرنیچر وغیرہ بھی فروخت کر دیا تاکہ پھر سے روپیہ پس انداز کر سکے۔ وہ برمنگھم واپس چلا گیا اور اس سے اگلے برس اس نے اپنی منسوبہ کی قبر پر

کتبہ لگوایا۔ اور پھر واپس چلا گیا۔ پھر لوگوں نے سنا کہ اس نے برمنگھم والی دکان چھوڑ دی اور غائب ہو گیا۔ حالانکہ سب لوگ اسے روکتے رہے کہ وہ بہت جلد دکان کا مالک بن جائے گا۔ لیکن اس نے دکان چھوڑ دی۔ اگلے اپریل میں لڑکی کی برسی کے موقعہ پر وہ پھر دکھائی پڑا۔ اور مسز اسٹارنز سے ملا۔ اور دو ہفتے رہ کر چلا گیا۔

اس کے جانے کے بعد لوگوں کو پتہ چلا کہ وہ کاؤنٹی کے بینک میں رہن شدہ زمین کا سود ادا کرتا رہتا ہے اور ہر سال اس غرض سے آتا ہے۔ آخر مسز اسٹارنز بھی چل بسی۔ اور اس کی موجودگی ہی میں فوت ہوئی۔ وہ گھر کی صفائی اور مرمت کے سلسلہ میں وہاں دو ہفتے سے ٹھہرا ہوا تھا۔ اس خیال سے کہ وہ آرام اور سکون سے رہے۔ مسز اسٹارنز اسے اس کام سے نہیں روکتی تھی۔ کیونکہ وہ اونچے طبقے کی تھی اور ہاک شا نیچ ذات تھا۔ مرتے وقت اس نے یہی کہا۔ "تمہیں یاد ہے کہ مرنے والی نے کیا کہا تھا۔ رہن شدہ جائیداد مسٹر اسٹارنز سے میں جب ملوں گی تو وہ بہت پریشان ہوں گے۔

ہاک شا نے اس کی بھی تدفین کی اور اس کی قبر پر لگانے کے لئے مناسب کتبہ بھی خریدا۔ اس کے بعد اس نے رہن شدہ زمین پر اصل رقم کی ادائیگی شروع کر دی۔ ایلباما میں اسٹارنز کے کچھ رشتہ دار تھے ڈویژن کے لوگوں کا خیال تھا کہ وہ ہاک شا سے جائیداد کا مطالبہ کریں گے۔ اور یہ بھی ممکن تھا کہ وہ اس کے منتظر ہوں کہ ہاک شا رہن شدہ زمین کو پہلے چھڑا لے، وہ بڑی باقاعدگی سے ہر سال رقم کی ادائیگی کرتا وہاں جاتا۔ گھر کو دھو دھا کر صاف کرتا اور یہ کام وہ اپریل کے دو ہفتوں میں سرانجام دیتا تھا اور واپس چلا جاتا۔ کسی کو نہیں معلوم تھا کہ وہ کہاں چلا جاتا ہے۔ البتہ ہر سال اپریل میں بینک میں قسط کی ادائیگی اور مکان کی صفائی جو اس کی ملکیت نہ تھا اس کا معمول بن گیا تھا۔ اس طرح اس نے پانچ سال گزار دیئے میں نے اسے جیفرسن میں میکسی کی دکان میں کام کرتے ہوئے پہلی بار دیکھا تھا۔ جب وہ سرج کے کوٹ اور نکٹائی میں ملبوس تھا، یہ اس کے ایک سال بعد کا ذکر ہے۔ وہ اس وقت اس لباس میں جیفرسن جانے والی جنوب کی گاڑی سے ہاتھ میں ایک کاغذی بکس دبائے اترا تھا۔

میکسی کا کہنا ہے کہ لوگ دو دن تک اسے چوراہے پر دیکھتے رہے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ کسی سے واقف نہیں ہے۔ یا اسے کوئی کام ہے یا پھر جلدی میں ہے۔ وہ چوراہے پر چہل قدمی کر رہا تھا۔

نوعمر اور آوارہ لڑکے جو سارا دن کلب کے صحن میں جُوا کھیلتے رہتے تھے اور اس انتظار میں رہتے تھے کہ نوجوان لڑکیاں ڈاک خانہ یا فوارے کی طرف سرِ شام لباسوں کے نیچے کولہے مٹکاتی ہوئی نکلیں اور اپنے پیچھے خوشبو کی لہریں چھوڑتی ہوئی گزریں، انہیں آوارہ گرد لڑکوں نے اس کو ہاک شا کا نام دیا تھا۔ ان کے خیال میں وہ کوئی سراغ رساں تھا اور اس میں کسی شک و شبہ کی گنجائش نہ تھی۔

جیفرسن میں میکسی کی دکان پر کرسی کے پیچھے اس نے بارہ سال گزار دیئے اور اس دوران وہ ہاک شا کے نام سے مشہور تھا۔ اس نے میکسی کو صرف اتنا بتایا تھا کہ وہ ایلا باما سے آیا ہے جس پر میکسی نے پوچھا تھا کہ ایلا باما تو بہت بڑی جگہ ہے۔ تم اس کے کس حصہ سے آئے ہو کیونکہ ہاک شا کے انداز سے معلوم ہوتا تھا کہ وہ سوائے برمنگھم کے اور ایلا باما کے کسی اور جگہ سے نہیں آسکتا اور ہاک شا نے اثبات میں جواب دیا تھا کہ ہاں برمنگھم سے۔

اس سے زیادہ میکسی اس کے متعلق کچھ نہ کہہ سکا۔ مگر مجھے اس کو کرسی کے پیچھے دیکھ کر پورٹ فیلڈ یاد آگیا۔

"پورٹ فیلڈ؟" میکسی بولا۔ "میرا بہنوئی اس دکان کا مالک ہے۔ کیا تم نے پچھلے سال پورٹ فیلڈ میں کام کیا تھا۔ اس نے ہاک شا سے پوچھا تھا اور اس نے جواب دیا کہ ہاں میں وہیں تھا۔

میکسی نے مجھے بتایا کہ ہاک شا گرمیوں میں رخصت نہیں لیتا تھا اور اس کے بجائے اپریل میں دو ہفتے کی تعطیل کیا کرتا تھا۔

جس سال مسز برشت سوسن ریڈ کو پہلی بار دکان پر لائی تھی یہ بات اسی سال ہوئی۔ جب اپریل میں ہاک شا نے چھٹی مانگی تو میکسی نے پوچھا کیا تم کام چھوڑنا چاہتے ہو جس کا جواب ہاک شا نے نفی میں دیا اور کہا تھا کہ مجھے یہ جگہ پسند ہے۔ مجھے اپریل میں صرف دو ہفتوں کی چھٹی چاہیئے۔ "کچھ کام ہے؟" میکسی نے پوچھا۔ "ہاں" ہاک نے جواب دیا۔

میکسی نے جب چھٹی لی تو وہ اپنے بہنوئی سے ملنے پورٹ فیلڈ چلا گیا۔ شائد اس خیال سے کہ وہاں وہ اپنے بہنوئی کے گاہکوں کی شیو بنا دیا کرے گا۔ جیسے کوئی بحری ملاح اپنی تعطیلات کسی مصنوعی جھیل میں چپوؤں والی کشتی چلا کر گزارتا ہے۔ اس کے بہنوئی نے اسے بتایا کہ ہاک شا اس کی دکان پر مستقل کام کرتا تھا مگر جب اپریل میں چھٹی لے کر گیا تو پھر واپس نہیں آیا۔ اس نے بولیوڈ ٹینسی

اور ایک مرتبہ طورنس ایلا باما کی ایک دکان پر بھی کام کیا اور پھر چھوڑ کر چل دیا اس نے میکسی سے یہ بھی کہا

د اس طرح وہ تمہارے یہاں سے بھی چلا جائے گا۔

چنانچہ جب میکسی گھر واپس آیا تو اس نے ہاک شا سے اس کی تصدیق کرائی کہ اس نے ایک ایک سال ایلا باما ٹینسی اور مسی سپی کے مختلف شہروں میں کام کر کے چھوڑ دیا تھا۔ بلکہ اس نے اس سے یہ بھی پوچھا کہ تم اتنے اچھے حجام ہو اور بچوں کے بال خاص طور پر اچھے کاٹتے ہو پھر ان جگہوں پر کام چھوڑنے کی وجہ کیا ہے؟۔

پھر اپریل آ گیا۔ ہاک شا نے دو ہفتوں کی رخصت لی۔ شیلو کیا، کاغذی سوٹ کیس لیا اور شمال کی جانب جانے والی گاڑی پر سوار ہو گیا۔

میکسی نے پوچھا "کسی سے ملنے جا رہے ہو؟"

ہاں ! ذرا دور جا رہا ہوں۔ ہاک شا نے جواب دیا۔ وہ اسی سرج کے کوٹ اور ٹائی میں چلا گیا۔

مجھے میکسی نے بتایا کہ دو دن کے بعد مجھے معلوم ہوا کہ ہاک شا نے بینک سے اپنی ساری سال کی بچائی ہوئی رقم نکلوالی تھی اور مسز کوواں کے ہاں مقیم رہا۔ گر جا گیا۔ لیکن روپیہ بالکل خرچ نہیں کیا۔ وہ سگریٹ بھی نہیں پیتا تھا۔ چنانچہ میرے، میکسی اور میٹ کے علاوہ ہمارے خیال میں جیفرسن میں ہر شخص یہی سوچتا تھا کہ اس نے ایک سال تک بھاپ جمع کی ہے اور اب وہ میمفس کے FLESHPOTS میں کسی خفیہ..... کا ارادہ رکھتا ہے۔

ڈیو فرسٹ کا ایجنٹ مع ایونگ بھی مسز کوواں کے ہاں رہتا تھا اس نے بتایا کہ ہاک شا نے صرف جنکشن اسٹیشن تک کا ٹکٹ خریدا تھا وہاں سے وہ میمفس، برمنگھم یا نیو آرلینز کہیں جا سکتا تھا

خیر اب تو وہ جا چکا میکسی نے کہا "اور یہ بات یاد رکھو کہ یہ ہماری اس سے آخری ملاقات تھی؟"

سب ہی لوگ اس طرح سوچ رہے تھے حتیٰ کہ دو ہفتے گزر گئے۔ پندرھویں دن ہاک شا اپنے مقررہ وقت پر چلتا ہوا دکان یوں پہنچا جیسے وہ بستی سے کبھی باہر گیا ہی نہیں تھا۔ اس نے کوٹ اتارا اور اپنا استرہ تیز کرنے لگا۔ اس نے کبھی کسی کو یہ نہیں بتایا تھا کہ وہ کہاں گیا تھا۔ بس تھوڑی دور

بعض اوقات مجھے خیال آتا کہ میں انہیں بتا دوں۔ میں جب بھی جیفرسن جاتا اسے وہیں کرسی

کے پیچھے کھڑا رکھتا۔ وہ بالکل نہیں بدلا تھا۔ اس کے چہرے پر بڑھاپے کے بھی آثار نظر نہیں آتے تھے۔ اس لیڈی لڑکی کے بالوں کی طرح اس میں بھی کوئی تبدیلی نہیں ہوئی تھی باوجودیکہ وہ ان میں گوند اور خضاب لگایا کرتی تھی۔

لیکن وہ چھٹیوں کے بعد موجود ہوتا اور آئندہ سال کے لئے رقم پس انداز کرنا شروع کر دیتا۔ وہ اتوار کو گرجے جاتا اور ان بچوں کے لئے جو اس سے بال ترشوانے کے لئے آتے تھے پیپرمنٹ کا لفافہ اپنے پاس رکھتا۔ یہاں تک کہ سال بھر کی بچت اور کاغذی سوٹ کیس لے کر اس کے ڈوبزن جانے کا وقت آجاتا جہاں اسے رہن کی رقم کی ادائیگی اور مکان کی صفائی کرنا ہوتی۔

بعض اوقات جب میں جیفرسن آتا تو وہ چھٹی پر گیا ہوا ہوتا اور میکسی مجھے بتاتا کہ کیسے وہ اس لڑکی کے بال تراشتا چلا جاتا تھا اور پھر اسے دکھانے کے لئے کس طرح آئینہ اونچا کرتا گویا وہ کوئی ایکٹرس ہو، وہ اس سے اجرت بھی نہیں لیتا تھا۔ اور اپنی جیب سے ایک کوارٹر ادا کر دیتا تھا۔ یہ بات میٹ فوکس نے بتائی تھی۔

"خیر ہمیں اس سے کیا غرض"، میکسی کہتا۔ "ہمیں تو ایک کوارٹر سے غرض تھی، ہمیں اس کی کوئی فکر نہیں تھی کہ یہ کوارٹر آتا کہاں سے تھا۔"

پانچ سال بعد ممکن ہے کہ میں یہ کہہ دیتا کہ اس لڑکی کی یہی قیمت تھی۔ کیونکہ وہ بالآخر مصیبت میں گرفتار ہو گئی۔ کم سے کم لوگ یہی کہتے تھے۔ میں اس سے زیادہ نہیں جانتا کہ لڑکیوں اور عورتوں کے متعلق زیادہ تر باتیں وہی لوگ رشک اور مخاصمت کی بناء پر کرتے ہیں جن میں ہمت کا فقدان ہوتا ہے اور وہی جو اپنے مقصد میں ناکام رہتے ہیں۔

ایک بار جب اپریل میں وہ رخصت پر گیا ہوا تھا تو سرگوشیاں ہو رہی تھیں کہ وہ لڑکی بالآخر کیسے مصیبت میں پھنس گئی اور اس نے کس طرح تارپین کا تیل پی کر اپنا علاج کرنے کی کوشش کی اور شدید بیمار پڑ گئی۔

بہرحال وہ تین ماہ تک بازاروں سے غائب رہی۔ بعض کہتے تھے کہ وہ میمفس کے کسی اسپتال میں ہے۔ اور جب دوبارہ وہ بال ترشوانے دکان میں داخل ہوئی تو میٹ کی کرسی پر بیٹھ گئی حالانکہ ہاک کی کرسی خالی تھی۔ وہ پہلے بھی اسے دق کرنے کے لئے یہی کیا کرتی تھی۔

میکسی کہتا تھا کہ وہ ٹھنگنی سی گہرے شوخ رنگ کپڑوں میں میٹ کی کرسی پر بیٹھی ہوئی رنگین تھتنی معلوم ہوتی تھی اور اس نے ساری دکان کو اپنی باتوں، قہقہوں، خوشبو اور دراز برہنہ ٹانگوں سے زعفران زار بنا رکھا تھا اور ہاک شا ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اپنی خالی کرسی سے ہی معروف کار ہے۔

مجھے بعض اوقات خیال آتا کہ میں انہیں بتا دوں۔ لیکن میں نے سوائے گمادن اسٹیونز کے اور کسی کو نہیں بتایا۔ وہ ضلع کا مجسٹریٹ تھا اور بہت ہوشیار۔ جتنا کہ معمولی تعلیم یافتہ وکیل یا حاکم ہونا چاہیئے۔ وہ اس وقت اوررڈ چلا گیا تھا جب میری صحت نے جواب دے دیا تھا (میرا حساب کتاب گورڈون ویلی جنگ میں تھا) جب میں اسپتال سے واپس آرہا تھا تو میمفس کی ٹرین میں اسٹیونز سے میری ملاقات ہوگئی تھی اور اس نے مجھے مشورہ دیا تھا کہ میں سڑکوں کے کام کی کوشش کروں اور مجھے اس کمپنی میں ملازمت مل گئی۔

میں نے یہ بات اسے دو سال قبل بتائی تھی کہ "اب وہ لڑکی اس سے بُرا سلوک کرنے لگی ہے اور اب وہ اتنا بوڑھا ہو چکا ہے کہ کسی اور لڑکی کو حاصل کر کے اس کی پرورش نہیں کر سکتا۔ میں نے یہ بھی بتایا کہ کسی روز وہ اس مکان کا پورا قرضہ ادا کر دے گا اور ایلا باما والے اہلِ اسٹارنز آ کر اس پر قبضہ کر لیں گے اور وہ تباہ ہو جائے گا اور میں نے پوچھا کہ تمہارے خیال میں پھر وہ کیا کرے گا؟"

"میں نہیں جانتا" اسٹیونز نے جواب دیا۔

"ممکن ہے کہ وہ وہاں سے چلا جائے اور مر جائے" میں نے کہا۔

"ممکن ہے شاید وہ مر جائے۔" اسٹیونز نے کہا۔

"خیر" میں نے کہا وہ پہلا آدمی نہیں ہوگا جس نے تنو ہواؤں سے شکست کھائی۔

"اور مرنے میں بھی وہ پہلا آدمی نہیں ہوگا" سٹیونز نے کہا۔

(۱۰)

چنانچہ گزشتہ ہفتہ میں ڈویژن گیا اور کئی، وزر لاجیلینے نے مکان دیکھا تو اس پر نیا نیا روغن کیا ہوا تھا۔ اسٹور کیپر نے بتایا کہ ہاک شا نے جو رقم ادا کی تھی وہ آخری قسط تھی۔ اسٹارنز کی رہن شدہ اراضی اب واگذاشت ہو چکی ہے اور ایلا باما والے اسٹارنز کے رشتہ دار اسے لے سکتے ہیں۔ اس نے کہا۔

بہرحال ہاک شا نے جو وعدہ اس لڑکی اور مسز اسٹارنز سے کیا تھا پورا کر دکھایا۔

ہاک شا؟ وہ بولا "کیا وہ اسی نام سے پکارا جاتا ہے؟ مجھ پر لعنت۔ مجھ پر لعنت

تین ماہ بعد پھر میرا جیفرسن جانا ہوا۔ جب میں حجام کی دکان کے سامنے سے گزرا تو بغیر رُکے ہوئے میں نے اندر دیکھا۔ ہاک شا کی کرسی کے پیچھے کوئی اور نوجوان سا شخص کھڑا تھا۔

"تعجب ہے کہ ہاک نے ہیر منٹ کا الفاظ کیسے چھوڑا ہوگا" میں نے اپنے دل میں سوچا لیکن وہ رکا نہیں اور صرف اتنا کہا "اچھا تو آخر وہ چلا ہی گیا!" میں یہ سوچ کر متحیر ہو رہا تھا کہ جب وہ بوڑھا ہو جائے گا اور حرکت بھی نہ کر سکے گا تو کہاں ہوگا۔ شاید وہ کہیں کسی گاؤں میں تین چار کرسیوں والی مختصر سی دکان میں آستینوں والی قمیص سیاہ ٹائی اور سرج کی پتلون میں مر جائے گا۔"

میں یہ سوچتا ہوا آگے بڑھ گیا۔ میں نے اپنے گاہکوں سے ملاقات کی، کھانا کھایا اور شام کو اسٹیونز کے دفتر میں چلا گیا۔

"بستی میں ایک نیا حجام آگیا ہے" میں نے کہا۔

"ہاں" اسٹیونز نے کہا۔ وہ کچھ دیر تک مجھے دیکھتا رہا پھر بولا۔ "تم نے سنا نہیں؟"

"کیا؟" میں نے پوچھا۔ پھر اس نے میری طرف سے منہ موڑ لیا۔ وہ بولا "مجھے تمہارا خط مل گیا تھا کہ ہاک شا نے رہن شدہ زمین واگزاشت کرالی ہے اور مکان کی ازسرِنو پالش کرادی ہے۔ مجھے اس کے متعلق کچھ اور بتاؤ۔"

چنانچہ میں نے اسے بتایا کہ کس طرح میں ہاک شا کے چلے جانے کے اگلے دن ڈویژن پہنچا۔ لوگ اسٹور کی ڈیوڑھی میں اس کے متعلق باتیں کر رہے تھے اور حیران تھے کہ آخر اسٹارنز کے ایلا باما والے رشتہ دار کب آئیں گے اس نے مکان میں پالش خود کی تھی۔ میرا خیال ہے کہ وہ اسٹارنز کی قبر کی صفائی کر کے اس کے خواب میں مخل ہونا نہیں چاہتا تھا۔ میں ان قبروں کو دیکھنے گیا۔ اس نے کتبوں کو صاف کر دیا تھا اور لڑکی کی قبر پر سیب کے درخت کی شاخ لگا رکھی تھی جس میں پھول کھل رہے تھے اور سب لوگ اس کے متعلق باتیں کر رہے تھے۔ مجھے بھی خلش ہوئی کہ گھر کے اندر کا حصہ دیکھوں۔ کنجی اسٹور کیپر کے پاس تھی۔ اس نے کہا کہ اس کے خیال میں مکان ہاک شا کے لئے بالکل موزوں ہوگا۔

گھر اندر سے اسپتال کی طرح صاف ستھرا تھا۔ چولہے پر بھی پالش کی گئی تھی۔ ایندھن کا ڈبا بالکل بھرا ہوا تھا۔ اسٹور کیپر نے مجھے بتایا کہ ہاک شا یہ کام ہر سال کیا کرتا تھا اور جانے سے پہلے لکڑی کا صندوق بھر کر رکھ جاتا تھا۔ ایلا باما والے رشتہ دار اس کی تعریف کریں گے" میں نے کہا۔ ہم واپس گول کمرے میں آگئے۔ کونے

میں ایک "میلا دون" رکھا تھا۔ اور میز پر ایک بائبل پڑی تھی اور لیمپ رکھا تھا لیمپ صاف تھا اور پیالہ بھی صاف اور خالی تھا اس میں تیل کی بو نام کو بھی نہ تھی، شادی کا لائسنس فریم میں جڑا ہوا آتشدان کے اوپر لٹکا ہوا تھا اس پر ۴ر اپریل ۱۹۰۸ء کی تاریخ تحریر تھی۔

یہاں وہ رہن کے کاغذات رکھا کرتا تھا۔ اسٹور کیپر نے جس کا نام ہڈول تھا کہا۔ اس کے بعد وہ میز کے قریب گیا اور بائبل کھولی۔ پہلے صفحہ پر دو کالم پیدائش اور اموات کے لئے تھے۔ لڑکی کا نام صوفیہ تھا ہمیں نے اس کا نام پیدائش کے کالم میں تو دیکھ لیا اور اموات کے کالم میں جو آخری تھا اس میں مسز اسٹار نز لکھا تھا ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ابھی دس منٹ پہلے لکھا گیا ہے۔ صوفیہ اسٹار نز وفات ۱۶ر اپریل ۱۹۰۸ء۔ آخری نام خود ہاک شا نے لکھا تھا بہت خوش خط جیسے کسی خوشنویس نے لکھا ہو۔

مسز ول اسٹار نوس ۲۳ر اپریل ۱۹۱۴ء

ہڈول نے کہا " یادداشت آخر میں ہوگی۔"

ہم نے پلٹ کر آخری صفحہ دیکھا۔ ایک صاف ستھرا کالم ہاک شا کے قلم سے لکھا تھا "۱۶ر اپریل ۱۹۱۷ء ۲۰۰ ڈالر" یہ اس وقت کی تحریر تھی جب اس نے اگلی قسط ادا کی تھی۔ ۱۶ر اپریل ۱۹۱۸ء ۲۰۰ ڈالر اور ۱۶ر اپریل ۱۹۱۹ء ۲۰۰ ڈالر۔ ۱۶ر اپریل ۱۹۲۰ء ۲۰۰ ڈالر۔ آخری قسط ۱۶ر اپریل ۱۹۳۰ء ۲۰۰ ڈالر۔ اس کے بعد تمام رقمیں جمع کر کے اس نے لکھا تھا۔ ادائیگی مکمل ہوگئی۔ ۱۶ر اپریل ۱۹۳۰ء

یہ سب قدیم طرز کی تجارتی درس گاہ کی کاپی پر لکھا ہوا فقرہ لگتا تھا جو بے اختیار قلم سے نکل گیا ہو۔

" تو گویا اس نے جو وعدہ اس لڑکی سے کیا تھا وہ پورا کر دکھایا۔" اسٹیونز نے کہا۔

"یہی بات میں نے ہڈول سے کہی تھی۔" میں نے کہا۔

اسٹیونز سنی کو ان سنی کرتا ہوا بولتا چلا گیا تو وہ بوڑھی عورت سکھ کی نیند سو سکتی ہے۔ میرا خیال ہے کہ جب قلم اس کے قابو سے باہر ہو گیا تو وہ یہی کہنا چاہتا ہوگا کہ وہ اب سکھ کی نیند سو سکتی ہے۔ صرف یہی نہیں بلکہ جب اس نے کالم میں لکھا کہ ادائیگی مکمل ہوگئی تو رقت اور مایوسی اس کے پیچھے اور تاریکی اس طرح چھا گئی ہوگی۔ جیسے پھولوں سے لدا ہوا کوئی لوکا یا بے تاج اور طرہ لگائے کوئی لڑکی۔

" صرف لڑکی نے اس کے ساتھ برا سلوک کیا " میں نے کہا بیتالیس سال کی عمر اتنی بڑی عمر ہوتی

ہے کہ کسی اور لڑکی کی تلاش جستجو میں نہیں رہا جا سکتا اور وہ تو اس وقت پچپن سال کا ہو چکا ہوگا۔

اسٹیونز نے میری طرف دیکھا اور بولا " غالباً تم نے نہیں سنا؟"

" ہاں" میں نے کہا بات یہی ہے۔ جب میں ادھر سے گزرا تو میں نے حجام کی دکان میں جھانک کر دیکھا لیکن میں جانتا تھا کہ وہ چلا گیا ہوگا۔ میں تمام عرصہ یہ جانتا تھا کہ ادھر رہن شدہ مکان واگزاشت ہوا اور وہ رفوچکر ہو گیا۔ ممکن ہے کہ اسے لڑکی کے بارے میں کبھی معلوم ہی نہ ہوا ہو۔ یہ بھی عین ممکن تھا کہ اسے معلوم ہو اور اس نے اس کی پروا نہ کی ہو۔"

تمہارا خیال ہے کہ اسے لڑکی کے متعلق معلوم نہیں تھا؟

" میں تو یہ سمجھتا ہوں کہ وہ بغیر یہ معلوم کئے کیسے رہ سکتا ہے، لیکن یقین سے کچھ نہیں کہہ سکتا۔ تمہارا کیا خیال ہے؟

" مجھے معلوم نہیں اور نہ میں معلوم کرنا چاہتا ہوں مجھے اس سے بڑی بات کا علم ہے۔"

" وہ کیا؟" میں نے پوچھا۔ وہ میری جانب برابر دیکھ رہا تھا۔ "تم برابر یہی کہے جا رہے ہو کہ میں نے وہ خبر نہیں سنی۔ وہ کون سی خبر ہے جو میں نے نہیں سنی؟"

" لڑکی کے متعلق" اسٹیونز نے کہا اور میری طرف دیکھا۔

" اس رات جب ہاک شا گزشتہ تعطیل گزار کر آیا۔ ان کی شادی ہو گئی اور وہ اسے اپنے ساتھ لے گیا۔"

حکایت یوسفؑ اور ہم

بہت دنوں کی بات ہے ایک لڑکے نے خواب میں دیکھا کہ سورج، چاند اور گیارہ ستارے اسے سجدہ کر رہے ہیں۔ اس نے اپنا خواب اپنے والد سے بیان کیا اور تعبیر پوچھی۔ انھوں نے جواب دیا: "تو بڑا آدمی بنے گا۔ اتنا بڑا کہ تیرے گیارہ بھائی اور ماں باپ تجھے سجدہ کریں گے۔ لیکن بیٹے دیکھنا اس خواب کو اپنے بھائیوں کو نہ سنانا ورنہ وہ تیرے دشمن ہو جائیں گے۔"

لڑکے نے باپ کی نصیحت نہ مانی اور اپنا خواب اپنے بھائیوں کو سنا دیا۔ باقی حصہ آپ کو معلوم ہے۔ حضرت یوسفؑ کنوئیں میں ڈالے گئے، پھر غلام کی حیثیت سے بیچے گئے۔ پھر ایک جھوٹے الزام میں قید ہوئے۔ یہ سب کیوں ہوا؟ اس لئے کہ انھوں نے اپنے باپ حضرت یعقوبؑ کی نصیحت نہیں مانی تھی۔ یہ اس قصہ کا اخلاقی پہلو ہے۔ لیکن اس سے بھی پہلا اور بنیادی سوال یہ ہے کہ انھوں نے اپنا خواب اپنے بھائیوں کو کیوں سنایا۔ اور خواب سنانے کے معنی کیا ہیں؟ حضرت یوسف نے جب تک خواب دیکھا تھا کوئی بات نہیں تھی۔ خواب دیکھ کر اچنبھے میں تھے۔ یہ کیسا خواب ہے اور اس کے کیا معنی ہیں۔ ایک خوشگوار الجھن۔ ایک مزیدار اضطراب: "اس خواب میں ضرور کچھ ہے۔ جس کا میری زندگی سے گہرا تعلق ہے۔ کیا کوئی مجھے اس خواب کے معنی بتا سکتا ہے۔ خواب اچھا ہے اس کی تعبیر بھی ضرور اچھی ہوگی۔" اور جب حضرت یعقوبؑ نے انھیں تعبیر بتائی تو وہ خوش ہوتے۔ انہیں اپنی اہمیت کا احساس ہوا انہیں معلوم ہوا وہ بہت بڑے آدمی بننے والے ہیں۔ انھوں نے اپنے ذہن میں ایک تصویر بنائی، ایک تصویر جس میں وہ تختِ حکومت پر بیٹھے ہیں اور ان کے ماں باپ اور گیارہ بھائی انھیں سجدہ کر رہے ہیں۔ وہ اپنی اس ذہنی تصویر سے سرشار ہو گئے۔ میں بہت اہم ہوں، بہت بڑا ہوں۔ مجھے یہ خواب دوسروں کو بھی سنانا چاہیے۔ حضرت یعقوب نے ان کی اس کیفیت کو دیکھا اور ان کے دل کی حالت سمجھ گئے۔ انھیں معلوم تھا

یوسف کی یہ ذہنی تصویر اپنی عظمت کا احساس۔ اپنی اہمیت اور بڑائی کا خیال یوسف کو آزمائش میں مبتلا کر دے گا، لیکن اب وہ کچھ نہیں کر سکتے تھے۔ یوسف اپنی تصویر کی محبت میں مبتلا ہو گئے تھے۔ اب انھوں نے یہ چاہا کہ وہ اس کا اظہار نہ کریں مگر یہ ناممکن تھا۔ آدمی جب اپنے ذہن میں کوئی تصویر بناتا ہے تو اسے دوسروں پر ظاہر کئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ یوسف کی طرح ہم سب بھی اپنے ذہن میں اپنی ایک تصویر بناتے ہیں اور دوسروں پر اس تصویر کو ظاہر کرنا چاہتے ہیں۔ ہماری زندگی کا ہر المیہ اسی سے پیدا ہوتا ہے۔

ہماری ذہنی تصویر کیا ہے۔ ہماری ذات کے بارے میں ہمارا ایک خیال ہے۔ یہ خیال ہمیشہ ہماری اہمیت سے وابستہ ہوتا ہے۔ ہم اس خیال کو اپنے اندر پالتے ہیں اس کی نگہداشت کرتے ہیں۔ اپنے جذبے، احساس اور تخیل کا سارا آب و رنگ اسی کی آرائش اور زیبائش پر صرف کرتے ہیں وہ ہمارے لئے دنیا کی سب سے حسین سب سے محبوب چیز ہوتا ہے، جس طرح ایک بت پرست اپنے بت کی پوجا کرتا ہے اسی طرح ہم اپنے اس خیال کی پرستش کرتے ہیں، ہم اس کے لئے اپنی جان دے سکتے ہیں۔ یہ خیال ہمیں اتنا عزیز ہوتا ہے کہ ہم اس کی محبت میں اپنی "ذات" کو بھول جاتے ہیں اور یہ خواب یگی ہمارے اندر اتنی گہری سرایت کر جاتی ہے کہ ہم اپنی ذات سے بیگانہ ہو کر صرف اپنے خیال کی دنیا میں گم رہتے ہیں۔ یہ ہمارا جھوٹا شخص ہوتا ہے۔ اوسپنسکی نے اس بات کو ان الفاظ میں بیان کیا ہے:

"تشخص کی ایک عام صورت ہے جو ہم کو خوابیدہ رکھنے میں بڑا حصہ لیتی ہے اس کو باطنی تفکر کہا جاتا ہے، اس کا مطلب یہ ہے کہ تشخص اس تصور سے کیا جائے جو اپنی ذات کے بارے میں قائم کیا گیا ہو کیونکہ ہر شخص کے ذہن میں اپنی تصویر ہوتی ہے جو کچھ مستند ہوتی ہے اور کچھ غیر مستند۔ اپنی تصویر بنا کر ہر شخص اس کو دنیا کے سامنے پیش کرتا ہے اس امید میں کہ دنیا اس کو بعینہ اس تصویر کی حیثیت سے قبول کرے گی۔ تھیٹر کے انداز میں خود کو دنیا کے سامنے پیش کرنے کا یہ عمل آدمی کا بیشتر وقت لے لیتا ہے یہاں تک کہ دوسرے لوگوں سے بات کرتے وقت وہ زیادہ تر اپنے اس تاثر کے بارے میں مشغول رہتا ہے جو وہ قوموں کے سامنے پیش کرنا چاہتا ہے۔

وہ بڑے غور سے اپنی باتوں کے سلسلے میں لوگوں کا رد عمل نوٹ کرتا ہے، چہروں کے تاثرات دیکھتا ہے۔ اس بات پر توجہ دیتا ہے کہ جواب میں ان کا لب و لہجہ کیا ہے اور انہوں نے کیا کہا اور کیا نہ کہا۔ وہ اس بات کا بھی اندازہ لگاتا ہے کہ اس کا کتنی عزت سے استقبال کیا گیا۔ لوگوں نے اس کی باتوں میں کتنی دلچسپی لی اور باتوں کے علاوہ کتنے اور ذرائع سے انہوں نے دلچسپی کا اظہار کیا۔ دیکھئے وہ اس تاثر کے بارے میں کتنا مشغول ہوتا ہے جو دوسروں پر چھوڑتا ہے۔ یہ شدید مشغولیت اور اس کے ساتھ ٹھیک تاثر کو پیش نہ کرنے کا احساس جھجک :

"شعورِ ذات" کہلاتا ہے۔ لیکن یہ حقیقی شعورِ ذات کی ضد اور گہری خوابیدگی کا مظاہرہ ہوتا ہے۔"

حقیقی شعورِ ذات، شعورِ شخصیت سے بالکل مختلف چیز ہے۔ لیکن ہم شعورِ شخصیت ہی کو شعورِ ذات سمجھنے لگتے ہیں ہم اپنی ذات اور اپنی ذات کے بارے میں اپنے خیال کے درمیان تمیز نہیں کر سکتے ہمارے لئے دو ایک چیز بن جاتے ہیں۔ اور یہ دھوکا ساری زندگی قائم رہتا ہے۔ ڈی ایچ لارنس نے لکھا ہے کہ ہم سب اپنی ذات کے بارے میں اپنے خیال کے زندان میں رہتے ہیں۔ لیکن یہ احساس بہت کم لوگوں کو ہوتا ہے کہ وہ قید میں ہیں۔ وہ اس زندان کو اپنا گھر سمجھ لیتے ہیں اور اس سے نکلنے کے بجائے اس کے در و دیوار کو سجانے لگتے ہیں اور اس سے اس طرح مطمئن اور مسرور ہو جاتے ہیں جس طرح کوئی اپنے گھر میں مسرور و مطمئن ہوتا ہے۔ لیکن جن لوگوں کو قید کا احساس ہوتا ہے ان کی پوری زندگی زنداں کی دیواروں سے سر مارنے میں گزر جاتی ہے۔ ہماری شخصیت کا زندان ہمارے لئے اتنا حقیقی ہوتا ہے کہ ہم پوری زندگی کو اس کے رخنۂ دیوار کے ذریعہ دیکھنے لگتے ہیں اور اس طرح دیکھنے کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ کبھی زندگی کو۔ اس زندگی کو جو حقیقی ہے اور ہمارے زنداں سے وجود رکھتی ہے کبھی اس طرح نہیں دیکھ سکتے جیسی وہ ہے۔ ہم، ہمارے تعلقات، ہمارے وہ تمام رشتے جو ہم دوسروں سے قائم کرتے ہیں جھوٹے رشتے ہوتے ہیں لیکن ان سے ہمارا تعلق ہماری ذات کی بنیاد پر نہیں ہمارے خیال یا ذہنی تصویر کے مطابق قائم ہوتا ہے۔ کرشنا مورتی اپنے ایک مکالمہ میں کہتا ہے "اگر ہم اپنے موجودہ تعلقات کا بغور مطالعہ کریں خواہ وہ قریبی ہوں یا رسمی۔ گہرے ہوں یا سرسری تو پتہ چلے گا کہ یہ تعلقات پارہ پارہ ہیں، بیوی ہو یا شوہر۔ لڑکا ہو یا لڑکی ہر ایک اپنے عزائم اور اپنے ذاتی اور انانیت کے حامل مشاغل ہی زندگی گزارتا ہے ہر ایک اپنے خول میں ہے۔ یہ تمام عوامل مل کر فرد میں ایک ایک پیکرِ خیال یا ذہنی تصویر کو جنم دیتے ہیں اور دوسروں سے اس کے تعلقات اسی ذہنی تصویر کے توسط سے قائم ہوتے ہیں اس لئے حقیقی تعلقات قائم ہوتے ہی نہیں۔"

ہمارے حقیقی تعلقات صرف اس وقت قائم ہو سکتے ہیں جب اس کی بنیاد ہماری اور دوسروں کی ذات پر ہو۔ لیکن جس طرح اپنے شعورِ ذات کے بجائے شعورِ شخصیت کی دنیا میں زندگی بسر کرتے ہیں، یا یوں کہیے کہ اپنی ذات کے بجائے صرف اپنی ذات کے بارے میں اپنے خیال کو دیکھتے ہیں۔ اسی طرح ہم دوسروں کو دوسروں کی ذات کی روشنی میں نہیں دیکھتے۔ ہم اپنی طرح ان کے بارے میں بھی ایک ذہنی تصویر بناتے ہیں اور اس ذہنی تصویر کے مطابق ان سے تعلق قائم کرتے ہیں۔ ہمیشہ یہ ذہنی تصویر کسی شخص کے

کے بارے میں ہمارے رد عمل پر مبنی ہوتی ہے۔ چاہے یہ رد عمل نفرت کا ہو چاہے محبت کا۔ ہم ہر شخص کو اپنے اسی ذاتی ردِ عمل کی روشنی میں دیکھتے ہیں۔ اس طرح دوسروں سے ہمارا تعلق دو افراد کا تعلق نہیں ہوتا۔ دو ذہنی تصویروں کا تعلق ہوتا ہے۔ ڈی ایچ لارنس نے اپنے مشہور افسانہ "کپتان کا گڈا" میں ہمارے اس ذہنی عمل کو افسانہ کے ہیرو کے ذریعہ بیان کیا ہے۔ وہ اپنی پوری زندگی کا جائزہ لیتے ہوئے افسانہ کی ہیروئین سے کہتا ہے۔

"تم جو چاہے کہہ سکتی ہو لیکن آج کوئی بھی عورت، اس بات سے قطع نظر کہ وہ اپنے مرد سے کتنی محبت کرتی ہے کسی بھی لمحے اس کا گڈا بنانا شروع کر سکتی ہے اور وہ گڈا اس کے ہاتھ کا بنایا ہوا بہترین گڈا ہوگا۔ اس کا پسندیدہ مرد اس گڈے کے علاوہ اور کچھ نہیں ہوگا، غالباً میری بیوی نے بھی میرا گڈا بنایا ہے۔ اپنے خیالوں میں وہ یقیناً گڈا بناتی رہتی تھی۔ اس نے جی بھر کر میرا خیالی گڈا بنایا

کیونکہ میں۔ نے اپنے بارے میں اس کو دوسری عورتوں سے باتیں کرتے سنا ہے، تم نے جو میرا گڈا بنایا ہے اس سے میری بیوی کا بنایا ہوا گڈا کیسی بے وقعت معلوم ہوتا تھا۔ مگر اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ جب کوئی عورت کسی مرد سے محبت کرتی ہے تو اس کا گڈا ضرور بناتی ہے، گڈا بنائے بغیر اس کا جی ٹھنڈا نہیں ہوتا۔ اور جب وہ گڈا بنا لیتی ہے تو وہی اس کے لئے سب کچھ ہوتا ہے۔ محبت کا مطلب بھی یہی ہے۔"

ہماری محبتوں کا مطلب ہے گڈا بنانا۔ ہم اپنی محبتوں اور نفرتوں میں زندہ حقیقی انسانوں کے گڈے بناتے ہیں اور ان گڈوں کو یا تو قید کرتے ہیں، ان سے کھیلتے ہیں، انھیں اپنے سینے سے لگائے پھرتے ہیں۔ یا غصہ اور نفرت سے انہیں پھینک دینا چاہتے ہیں، ہم انہیں سینے سے لگائیں یا پھر پھاڑ کر پھینک دیں بہر حال ہوتے وہ گڈے ہی ہیں۔ زندہ اور حقیقی انسان نہیں ہوتے۔ ڈی ایچ لارنس نے اپنی ایک نظم میں بھی اپنی محبت کا ذکر کیا ہے جو گڈے بناتی ہے۔ یہ محبت اَنا کی پروردہ اور سراسر ذہن کی پیداوار ہوتی ہے حقیقی محبت سے اس کا دور کا بھی تعلق نہیں ہوتا، لیکن ہماری مجبوری یہ ہے کہ ہم اس محبت کے سوا کسی اور محبت کو جانتے بھی نہیں، یہ گڈے بنانے والی محبت کیا ہوتی ہے ڈی ایچ لارنس کے الفاظ میں اس کی تصویر دیکھئے۔

ذہن جب محبت میں دراندازہوتا ہے
یا قوتِ ارادی اس پر اپنی مہر لگاتی ہے
یا شخصیت اس کو اپنے اسمائے حسنیٰ میں سے

ایک اسم قرار دیتی ہے۔
یا انا اس پر چڑھ بیٹھتی ہے
تب۔۔۔۔۔۔
محبت یا تو نہیں رہتی
بس ایک چوپٹ چیز باقی رہ جاتی ہے
اور ہم نے محبت کو بہت چوپٹ کیا ہے
ذہن کی توڑی مروڑی ہوئی
قوت ارادی کی توڑی مروڑی ہوئی
انا کی توڑی مروڑی ہوئی
بیچاری محبت!

ڈی ایچ لارنس کے (افسانے) کپتان کا گڑیا کا ہیرو ایسی محبت سے تنگ آ کر کہتا ہے "مجھ سے محبت نہ کی جائے۔ نہ میں محبت کروں گا، میں کسی کو اجازت نہیں دوں گا کہ وہ مجھ سے محبت کرے۔ یہ توہین ہے۔ مجھے یوں معلوم ہوتا ہے کہ چالیس سال تک محبت نے میری توہین کی ہے ان عورتوں نے بھی جنھوں نے مجھ سے محبت کی ہے۔ مجھ سے محبت نہ کی جائے۔ اور میں محبت نہیں کروں گا۔ میری عزت کی جائے اور میری اطاعت کی جائے۔ یا پھر کچھ بھی نہیں۔"

مرد اور عورت کے تعلقات میں شادی اہم ترین رشتہ ہے۔ مشرق میں یہ رشتہ عورت کی طرف سے ایجاب اور مرد کی طرف سے قبول کا رشتہ تھا، اس کی بنیاد یا ہمی محبت پر نہیں تھی۔ اس کے بجائے عورت مرد کی عزت کرتی تھی اور اس کی اطاعت اپنا فرض سمجھتی تھی۔ مغرب میں مرد اور عورت کی مساوات کے ساتھ شادی برائے محبت کا نیا آئیڈیل پیدا ہوا۔ ڈی ایچ لارنس جب شادی کے لئے محبت کے بجائے عزت اور اطاعت کا مطالبہ کرتا ہے تو وہ مشرق کے بہت قریب پہنچ جاتا ہے۔ لیکن خود مشرقی تصور کی بنیاد کس بات پر ہے۔؟ کیا یہاں مرد اور عورت کا تعلق ذہنی تصور پر مبنی نہیں ہوتا؟

مشرق میں مرد کا تصور "دیوتا" یا "خدا کے مجازی" کا ہے۔ عورت یہاں بھی مرد کی ذہنی تصویر بناتی ہے مگر یہ تصویر انفرادی نہیں ہوتی۔ یہ وہ تصویر ہوتی ہے جو وہ روایت سے اخذ کرتی ہے۔ اس لئے اس کا

اصول محبت نہیں ہے کیونکہ محبت انفرادی تصویر کے بغیر پیدا نہیں ہوسکتی۔ عورت کے لئے مرد دیوتا ہے مگر کوئی خاص مرد نہیں، ہر وہ مرد جو روایتی طور پر اس کا شوہر بنا دیا گیا ہے۔ عورت کا پورا وجود اس شوہر کے لئے ہے خواہ انفرادی طور پر اس کے بارے میں کچھ بھی محسوس کرتی ہو۔ یہ محبت کا نہیں عزت اور اطاعت کا رشتہ ہے۔ خیر ذکر تھا اس بات کا کہ ہم حقیقی اور زندہ انسانوں سے محبت نہیں کرتے، ہم صرف "ذہنی تصویر" سے محبت کرتے ہیں۔ یہ ذہنی تصویر ہمارے ہر نقص کی بنیاد ہے۔ یہاں تک کہ خدا سے بھی ہمارا رشتہ یہی ہے، ہم خدا کو نہیں خدا کی تصویر کو پوجتے ہیں یہ تصویر پتھر کی ہے یا لفظوں کی ہے۔ یا صرف ایک خیالی تصویر ہے۔ اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ بت بہرحال بُت ہے چاہے وہ خیال کا بُت ہی کیوں نہ ہو، ہم خدا کو بُت بنائے بغیر نہیں پوج سکتے۔ حضرت یوسف نے اپنا ایک بُت بنایا، اور اس سے آزاد ہونے کے لئے انھیں چاہ و زنداں کی صعوبتوں سے گذرنا پڑا۔ تب انہیں معلوم ہوا کہ وہ خود کیا ہیں اور خدا کیا ہے جو ہر تصویر سے بے نیاز ہے۔ تو کیا اس حکایت سے یہ نتیجہ برآمد ہوتا ہے کہ انسان صرف مصائب کے ذریعہ ہی اپنی ذہنی تصویر سے آزاد ہوسکتا ہے؟ میں جواب سے مطمئن نہیں ہوں مگر یہ بات بہرحال اپنی جگہ ہے کہ انسان کا، اس انسان کا جو اپنے ہر عمل میں زندہ اور حقیقی بننا چاہتا ہے' پہلا مسئلہ اپنی ذہنی تصویر سے آزاد ہوتا ہے۔

محمد حسن عسکری

پاکستان میں ادب کا مستقبل

میرے اکثر مہربان مجھ سے یہ شکایت کرنے لگے ہیں کہ میں زیادہ دن تک ایک رائے پر قائم نہیں رہتا، اور مجھے رائے تبدیل کرنے میں اتنی دیر نہیں لگتی جتنی کسی کو کپڑے بدلنے میں لگتی ہے۔ یہ شکایت ٹھیک ہی معلوم ہوتی ہے، اور اپنی مدافعت میں کچھ کہنا بھی اچھا نہیں لگتا۔ میں کوئی "مفکر" تو ہوں نہیں کہ مجھے نئے خیالات سے ڈر لگے، چاہے میں افسانے لکھوں یا نہ لکھوں، مگر میرے احساس کا انداز رہے گا وہی جو افسانہ نگار کا ہوتا ہے۔ یعنی مجھے براہ راست خیالات سے کوئی دلچسپی نہیں۔ میری توجہ کا مرکز تو وہ تبدیلیاں ہیں جو سماج میں انسانوں کے شعور میں آئے دن ہوتی رہتی ہیں۔ اگر میں چاہوں بھی کہ جو حالات میری "رائے" سے مختلف ہیں وہ میرے ذہن میں نہ آئیں تو میرے لئے ممکن نہیں۔ کیونکہ "خیالات" میرے ذہن میں آتے ہی نہیں، بلکہ مجھے انسانوں کے نئے تجربات کا احساس پیدا ہوتا ہے، یہ تجربات بعض دفعہ خوشگوار یا اُمید افزا نہیں ہوتے، میرا بھی جی چاہتا ہے کہ یہ تجربات ظہور میں نہ آتے تو اچھا تھا۔ لیکن یہ بھی نہیں ہو سکتا کہ ان تجربات کو جتنی سچائی اور وضاحت مجھ سے ممکن ہے اس کے ساتھ بیان نہ کردوں۔ سچ بولنا خصوصاً اپنے اور اپنے سماج کے بارے میں سچ بولنا کوئی لطف یا مزے کی بات نہیں ہے۔ اپنا بس چلے تو شاید کوئی آدمی سچ بولنے کی مصیبت قبول ہی نہ کرے گا۔ مگر سچ بولا نہیں جاتا، بلوایا جاتا ہے، یہ بھی ایک قسم کا جنون ہے جس میں آدمی کو اپنے اوپر قابو نہیں رہتا۔ آدمی کو قے آئے تو روکے نہیں رکتی، یہی حال سچ بولنے کا ہے۔ اگر آدمی مدتوں تک ایک ہی بات کہہ سکے تو اُس سے اپنی ذہنی صلاحیتوں پر بڑا اعتماد پیدا ہوتا ہے اور بڑا ذہنی سکون ملتا ہے۔ مگر جب ٹھوس تجربات اور احساسات دماغ میں کھلبلی مچا دیں تو پھر قے کر دینے کے سوا کیا چارہ ہے۔ یہ فعل اپنے لئے بھی تکلیف دہ ہے اور دوسرے بھی ایسی گندگی روا نہیں رکھ سکتے۔ مگر بدحتی بیچارگی کا معاملہ ہے۔

قے کرنے والوں سے یہ بھی پوچھا جا سکتا ہے کہ یہ حرکت ضروری سہی، مگر اس کے لئے موزوں جگہ تو گھر کا غسل خانہ ہے، ہمارے شہر کی سڑکوں کو کیوں گندہ کرتے ہو۔ یہ سوال شریف اور باعزت شہری پوچھ سکتے ہیں۔ حکومت پوچھ سکتی ہے اگور کی جیسے انسان دوست ادیب پوچھ سکتے ہیں۔ پھر اس کے بعد یہ مطالبہ بھی ہو سکتا ہے کہ یا تو اپنا علاج کرو۔ ورنہ ہمارے شہر سے نکلو۔ اپنے سماج میں قبول کئے جانے کی آرزو۔ عام انسانوں جیسی خوشیاں حاصل کرنے کی تمنا، یہ بالکل فطری چیزیں ہیں۔ جن سے بڑے بڑے ادیب بھی آزاد نہیں ہوتے۔ چنانچہ یہ بالکل ممکن ہے کہ شہر سے نکالے جانے کا خطرہ محسوس کرتے ہی آدمی بالکل تندرست ہو جاتے یا اپنے غسل خانے میں بند ہو کے بیٹھ جاتے۔ اور ضروری نہیں کہ یہ رویہ غلط ہی ہو جیسا ٹریڈ نے کہا ہے بعض حالات میں میدان سے بھاگنے کے لئے بڑی اخلاقی جرأت درکار ہوتی ہے۔ پھر انکسار، بلکہ اپنی صلاحیتوں سے انکار خود فن کی اہمیت سے انکار ہر معقول فن کار کی طبیعت کا جز ہوتا ہے۔ شیکسپیر تک نے کہہ دیا کہ آخر اچھی اور بری تخلیق میں ایسا فرق ہی کیا ہے، جو چیز اچھی لگے وہی بس اچھی ہے تو فن کار یہ بھی سوچ سکتا ہے کہ آخر میری ہستی ہی کیا ہے، میں نے لکھا تو کیا، نہ لکھا تو کیا، شکسپیر تو بننے سے رہا۔ اس سے تو بہتر یہی ہے کہ عام آدمیوں کی سی زندگی بسر کروں۔ اگر کسی میں عام آدمیوں کی زندگی کا حقیقی احترام پیدا ہو جائے تو یہ بھی ایک کارنامہ ہے جیسا ٹی، ایس، ایلیٹ نے اپنے تازہ ترین ڈرامے میں دکھایا ہے۔ بعض صورتوں میں پارٹی دینے کی بھی ایک مذہبی حیثیت بن جاتی ہے۔ اگر کوئی اس جذبہ کے ماتحت لکھنے لکھانے سے دست بردار ہو جائے تو کم سے کم میں تو اسے بھی مستحسن سمجھوں گا۔ لیکن بعض اوقات ذرا سی بات بڑی پیچیدہ بن جاتی ہے۔ انکسار، اپنے آپ سے انکار، اپنے آپ کو عام آدمیوں کی سطح پر لے آنا، یہ صفات کتنی ہی قابل احترام کیوں نہ ہوں، لیکن جب اپنے تجربے کی تشکیل میں شہر سے نکالے جانے کا خطرہ ہو تو انکسار اخلاقی بزدلی کا رنگ اختیار کر لیتا ہے بلکہ کچھ تعجب نہیں۔ ڈانٹے نے ایسے منکسر مزاج لوگوں کو اپنے جہنم میں دکھایا ہے۔ انکسار کی بات چھوڑیئے ادیبوں کے ساتھ تو یہ بھی ہوا ہے کہ دنیاوی کامیابی تو درکنار، تھوڑے سے دن میں ان کے تخلیقی سرچشمے ہی بالکل سوکھ گئے اور وہ ہر معنی میں برباد ہو کر رہ گئے لیکن انسانی روح کی کیمیا سازی بھی عجیب و غریب چیز ہے۔ اگر آدمی اپنی بربادی سے سچی محبت کرنے لگے تو انسانی سماج میں اس کی بھی ایک اہمیت ہو جاتی ہے۔ ایلیٹ نے کولرج کا ذکر کرتے ہوئے کہا ہے کہ بعض حالات میں برباد ہو کے رہ جانا بھی مذہبی فریضہ

بن جاتا ہے۔ معمہ بن جانے میں اور اس معمے کا کوئی حل نہ ڈھونڈنے میں جو تکلیف ہوتی ہے اسے برداشت کرنے کی ہمت بھی تو آخر ہر آدمی میں نہیں ہوتی۔ خصوصاً ایسے سماج میں رہتے ہوئے جو ادب سے (یعنی تجربات کی تشکیل بلکہ خود تجربات سے) منکر ہو، خواہ آدمی تخلیقی کام کر سکے یا نہ کر سکے چاہے اُس میں یہ صلاحیت واقعی ختم ہو گئی ہو اپنے آپ کو ادیب سمجھتے رہنا اور غیر تخلیقی طور پر ہی سہی مگر اپنے تجربات کے بارے میں کچھ نہ کچھ لکھتے رہنا بھی ان حالات کے خلاف احتجاج کی ایک شکل ہے بلکہ اثباتی طور پر انسانیت کی خدمت ہے۔ شیکسپیر تو روز پیدا نہیں ہوتا، مگر شیکسپیر کی روح کے مر جانے کا خطرہ وقتاً فوقتاً پیدا ہوتا رہتا ہے۔ یہ روح بعض اوقات انکسار کے ذریعے زندہ رکھی جا سکتی ہے، بعض اوقات ایسے غرور کے ذریعے جس کا جواز تک نہ ہو۔

پھر اس بار بار رائیں بدلتے رہنے میں کچھ قصور میری تربیت کا بھی ہے۔ ژید جیسے لوگوں نے مجھے سکھایا ہی یہ ہے کہ اپنا ملک چھوڑ دو، اپنا خاندان چھوڑ دو۔ اپنا کمرہ چھوڑ دو، اور کچھ نہ بن پڑے تو خیالات بھی چھوڑ دو۔ اگر آدمی میں زیادہ کی ہمت نہ ہو تو اب ایسی بھی کیا معذوری کہ رائے بھی نہ بدل جا سکے۔ اس کے علاوہ یہ ایسی بے مصرف چیز بھی نہیں۔ اگر آدمی پوری ہی ذمہ داری کے ساتھ ایک ہی خیال کو نبھائے چلا جائے تو انسانیت اڑیل بیل کی طرح ایک جگہ ٹھہری رہ جاتے۔ اگر حضرت ابراہیم ذمہ دار آدمی ہوتے تو بت تراشنے میں اپنے چچا کا ہاتھ بٹاتے، اور گھر کی دولت، عزت اور شہرت میں اضافہ کرتے۔ مگر انہوں نے دل لگی دل لگی میں بتوں کی ناکیں تراشنی شروع کر دیں۔ یہ میں ایک پیغمبر کی شان میں گستاخی نہیں کر رہا ہوں، بلکہ امر واقعہ ہے۔ یہ حضرت ابراہیم کا ایک تخلیقی مذاق تھا، وہ بت کی ناک کاٹ کر یہ دیکھنا چاہتے تھے کہ اب ہوتا کیا ہے، وہ ایک خیال کو آزما رہے تھے اور اس تجربے کی سزا بھی بھگتنے کو تیار تھے۔ حقیقت کیا ہے، اس کا پتا تو انہیں ایسے ایسے کئی اور تجربوں کے بعد چلا، تو مکمل غیر ذمہ داری کے ساتھ مسلمہ خیالات کی ناک کاٹتے رہنا تو سنت ابراہیمی میں داخل ہے، خواہ وہ خیالات اوروں کے نہیں، بلکہ اپنے ہی ہوں۔

اتنی لمبی چوڑی تمہید کی ضرورت اس وجہ سے پیش آئی کہ اس مضمون سے شاید یہ گمان ہو کہ اب میں پاکستانی ادب کی اہمیت یا ضرورت یا امکان کا قائل نہیں رہا، اور اب میں نے اپنی غلطی تسلیم کر لی ہے۔ اگر مجھے یہ محسوس ہو جاتے کہ میں نے پاکستانی ادب کی اہمیت پر اتنا زورِ قلم صرف کیا تھا تو میں صرف نئے نئے احساسِ قومیت کی رَو میں بہہ گیا تھا۔ اگر مجھے یہ محسوس ہونے لگے تو میں اپنی

غلطی تسلیم کرنے کو ہر وقت تیار ہوں۔ لیکن اگر کوئی ایسی اجتماعی وحدت موجود ہے جس کی مخصوص اور ممتاز تہذیبی صفات ہیں یا ایسی وحدت کے وجود میں آنے کا امکان ہے تو اس وحدت کا ادب بھی ممتاز خصوصیات کا حامل ہونا چاہیئے۔ اس لحاظ سے پاکستانی ادب کا نعرہ کوئی غیر فطری بات نہیں ہے۔ سوال صرف یہ رہ جاتا ہے کہ پاکستان اس قسم کی وحدت ہے بھی یا نہیں، اگر نہیں ہے تو ایسی وحدت بننے کا امکان کس حد تک ہے۔ اگر یہ امکان موجود ہے تو اسے حقیقت بننے میں کیوں دیر لگ رہی ہے؟

اس سوال کے میں نے کئی ٹکڑے کر لئے ہیں، لیکن اس وقت میرا تعلق صرف آخری جزو سے ہے۔ دو ایک باتیں میں بطور مسلّمات کے استعمال کروں گا۔ بعض لوگ (تنگ نظری، حماقت، بدنیتی یا بے ایمانی کی وجہ سے) کہتے ہیں کہ پاکستان نہ تو ایک تہذیبی وحدت ہے نہ بن سکتا ہے اس بات کے ثبوت میں جتنی دلیلیں پیش کی جا سکتی ہیں اتنی ہی اس کے خلاف پیش کی جا سکتی ہیں۔ یہ مسئلہ محض نظری باقی نہیں ہے۔ دیکھنے کی بات یہ ہے کہ پاکستان کے مختلف علاقوں میں جو لوگ بستے ہیں انہوں نے ماضی میں کبھی یگانگت محسوس کی ہے یا نہیں اور مستقبل میں ایک وحدت بن کر رہنا چاہتے ہیں یا نہیں۔ ان دونوں چیزوں کی سب سے بڑی شہادت تو خود پاکستان کا وجود ہے۔ ہم نے تو یہاں تک دیکھا ہے کہ جبر اور استحصال کے ذریعہ لوگ ان جیسے ملک روسی وحدت میں شامل ہو گئے اگر سرحدیوں، کشمیریوں، پنجابیوں، سندھیوں، بنگالیوں اور اقلیتی صوبوں سے آنے والوں کے دل میں ایک ساتھ رہنے کا جذبہ موجود ہو یا پیدا ہو جائے تو پاکستان کا ایک مکمل تہذیبی وحدت بن جانا کون سی انہونی بات ہے، بشرطیکہ حکومت اور دوسرے عناصر مل کر اس کے لئے کوشش کریں حالانکہ اب تک ہم نے اس سے پہلو بچایا ہے اور سب سے زیادہ حکومت نے۔ بہر صورت میرے مضمون کی بنیاد صرف ایک مفروضہ پر ہے کہ پاکستان میں ایک تہذیبی وحدت بن جانے کی پوری صلاحیتیں موجود ہیں خواہ یہ مفروضہ غلط ہی کیوں نہ ہو۔ لیکن چونکہ پاکستان میں کئی ایسی باتیں موجود ہیں جن کی مدد سے تہذیبی وحدت تشکیل پاتی ہے اس لئے ایسا مفروضہ قائم کرتے ہوئے مجھے ہچکچاہٹ بھی نہیں ہوتی۔ خواہ مختلف صوبوں کے باشندے مختلف نسلوں سے تعلق رکھتے ہوں، مختلف زبانیں بولتے ہوں، ان کا طرز معاشرت جدا گانہ ہو، مگر سب کے سب اپنی تاریخ ہندوستان میں اسلام کی آمد سے شروع کرتے ہیں۔ اس سے پہلے کی تاریخ کو وہ اپنی تاریخ ہی نہیں سمجھتے۔ پھر بہت سی تہذیبی علامتیں ایسی ہیں جنھیں سب

علامتیں اپنا سمجھتے ہیں یعنی اسلامی دور میں جو موسیقی [illegible]ری فنِ تعمیر پیدا ہوا ہے وہ سب کا مشترکہ
سرمایہ ہے' اور میں تو اردو ادب کو بھی اسی قبیل کی چیزوں میں شمار کروں گا۔ جو لوگ قومی اتحاد کے دشمن ہیں
وہ کہتے ہیں کہ حکومت ڈنڈے کے زور سے اردو کو قومی زبان بنا رہی ہے' یا اردو مغل شہنشاہیت کی نشانی
ہے۔ لیکن اردو نے پاکستان بننے سے سو ڈیڑھ سو سال پہلے برصغیر کے مسلمانوں میں ایسی علامت کی حیثیت
حاصل کر لی تھی جس کے ذریعے افراد یا بکھرے ہوئے چھوٹے چھوٹے گروہوں میں یگانگت کا احساس جڑ
پکڑتا ہے' اور ایک وسیع تر تہذیبی وحدت تشکیل پاتی ہے۔ اور یہ وہ زمانہ تھا کہ جب پاکستانی صوبے مغل سلطنت
سے آزاد ہو چکے تھے۔ آخر سندھ کے خودمختار امیروں کے سر پر کون ڈنڈا لئے کھڑا تھا اور ان سے اردو
میں غزلیں کہلوا رہا تھا؟ ان کے دل میں اس کے سوا اور کیا احساس تھا کہ بہت سے اختلافات کے باوجود
برصغیر کے باقی مسلمانوں سے ان کا مذہبی اور تہذیبی رشتہ ہے' اور اردو زبان اور شاعری اس رشتے
کی ایک نشانی ہے؟ تو پاکستانی مسلمانوں کی ایک مکمل تہذیبی وحدت بننے کے امکانات سے انکار نہیں
کیا جا سکتا' کیوں کہ یہ امکانات ہمیشہ موجود رہے ہیں' چاہے بہت ہی تھوڑے اور خفیف رہے
ہوں۔ بات صرف اتنی رہ جاتی ہے کہ ہم ان رجحانات کو تقویت پہنچاتے ہیں یا انہیں کمزور کرتے ہیں۔
مجھے شکایت صرف یہ ہے کہ اس چار سال کے عرصے میں ہم نے دونوں میں سے ایک بات بھی نہیں کی'
اور اب یہی پتہ نہیں چلتا کہ ہونا کیا ہے۔

اصل موضوع کی طرف آنے سے پہلے مجھے ایک اور اعتراض پر تھوڑا سا غور کرنا ہے۔ بعض لوگوں
کو اندیشہ ہے کہ اگر پاکستانی ادب کے خیال نے تقویت پائی تو ہم اردو ادب کی روایت سے کٹ کے
رہ جائیں گے۔ یہ شبہ دراصل ایسی ذہنیت کی پیداوار ہے جو ہر قسم کی تبدیلی اور نشوونما یعنی اپنے تجربات
کو وسعت دینے سے گھبراتی ہے۔ ادبی روایت کا مطلب یہ تو نہیں ہوتا کہ بس ایک دفعہ مکمل ہو گئی
تو ہو گئی' اب اس میں بڑھنے کی سکت نہیں رہی۔ اگر یہ روایت کسی زندہ قوم کی روایت ہے تو قوم
کی زندگی میں جتنی نئی تبدیلیاں اور نئے عناصر پیدا ہوں گے وہ سب اس روایت میں سمٹ کے
آئیں گے۔ ورنہ ایسی روایت کا فائدہ ہی کیا ہے جس میں قوم کی نئی زندگی نہ سما سکے۔ زندہ ادبی روایت
تو وہی ہے جو قوم کے ماضی کو اپنے اندر لئے ہوئے' مستقبل میں بیک وقت موجود ہو' جس میں قوم کی اگلی
پچھلی ساری زندگی ایک ساتھ جھلک سکے۔ اگر اردو ادب کی روایت واقعی ایسی مکمل ہو چکی ہے

کہ زندگی کی ذرا سی حرارت سے پگھل کے رہ جائے تو اب اسے عجائب خانے میں رکھ دینا ہی مناسب ہوگا تاکہ لوگ دور ہی سے دیکھ کے خوش ہو لیا کریں۔ اردو ادب اور پاکستانی ادب میں کوئی لازمی تناقض نہیں ہے۔ پاکستانی ادب صرف اردو ادب کی توسیع اور ایک نئی شاخ ہے۔ پاکستان ادب جتنا نشو و نما پاتے گا اب تک کے اردو ادب سے ممتاز بھی ہوتا جائے گا اور ساتھ ہی ساتھ اس سے اپنا رشتہ بھی برقرار رکھے گا۔ قوم کا حال اور مستقبل ماضی میں پنہاں ہوتا ہے۔ اگر اردو ادب واقعی اس برصغیر کے مسلمانوں کا قومی ادب ہے تو اگر ہم چاہیں بھی تو اپنے گزشتہ تجربات کے اس خزانے سے پیچھا نہیں چھڑا سکتے، اور نہ نئے تجربات کو اس میں شامل ہونے سے روک سکتے ہیں۔ بلکہ اردو ادب نے ڈیڑھ سو سال پہلے جس انداز سے بڑھنا پھیلنا شروع کیا تھا، اگر یہ عمل اسی طرح جاری رہتا اور انگریزوں کے تسلط نے اسے بیچ ہی میں کاٹ نہ دیا ہوتا تو پاکستانی ادب پاکستان بننے سے پہلے ہی وجود میں آجاتا۔ اور اب تو خیر پاکستانی ادب خود پاکستان کے وجود اور بقا کے لئے لازمی بن گیا ہے، کیوں کہ کوئی قوم ممتاز اور مخصوص تہذیبی علامتوں اور اداروں کے بغیر قوم کی حیثیت سے زندہ نہیں رہ سکتی، خواہ اسے اتحاد، یقین اور تنظیم کی کتنی ہی تلقین کیوں نہ کی جائے۔

فی الحال ہمارے سامنے سب سے اہم سوال یہی ہے کہ پاکستان میں یہ تہذیبی علامتیں جن کے ذریعے قومی شخصیت تشکیل پاتی ہے ابھی تک نمودار ہونی شروع کیوں نہیں ہوئیں۔ یہ ایسا مسئلہ ہے جس کی نزاکت کا احساس ہمارے ارباب اقتدار اور سیاسی لوگوں کو ذرا بھی نہیں ہے۔ حالانکہ سیاسی اعتبار سے بھی دیکھیں تو یہ سوال دفاع کے مسئلے سے بھی زیادہ اہم ہے۔ کیوں کہ دفاع بھی اُس وقت مستحکم ہوتا ہے۔ جب قوم کے پاس زیادہ سے زیادہ تعداد میں ایسی ٹھوس علامتیں ہوں جو قوم کی عمیق ترین زندگی کا مظہر ہوں، جو لوگوں کو جان سے زیادہ عزیز ہوں اور جن کی حفاظت اپنے بیوی بچوں کی سلامتی سے زیادہ مقدس نظر آئے۔ پاکستان کی جد و جہد کے سلسلے میں ہم دیکھ چکے ہیں کہ بعض لوگ مسجدوں اور دوسری اسلامی عمارتوں کے ذریعے غیر شعوری طور پر مسلمانوں کی انفرادی شخصیت کے قائل ہوتے، بعض لوگ اردو زبان اور ادب کی حفاظت کی خاطر مسلم لیگی بنے، بہت سے لوگوں کو اور کچھ نہیں تو اپنے گھر کے برتن ہی دیکھ دیکھ کر اپنے قومی وجود کا احساس ہوا۔ محض اصول اور محض نعرے بھی لوگوں کو گرما سکتے ہیں اور انہیں تھوڑی دیر کے لئے بلکہ کافی عرصے کے لئے قربانی پر آمادہ کر سکتے ہیں؛ لیکن اس جذبے میں گہرائی اور استحکام اسی

وقت آتا ہے کہ جب صرف میدانِ جنگ ہی میں نہیں ہمارے گھروں میں بھی ایسی چیزیں موجود ہوں جو ہماری روزمرہ زندگی کا جز ہوں اور اٹھتے بیٹھتے ہمیں اپنی شخصیت کا احساس دلا سکیں۔ جو ہمارے غیر شعوری افعال و اعمال خیالات اور جذبات و احساسات پر قابض ہو چکی ہوں۔ انہیں چیزوں کے ذریعے قوم میں یگانگت کا احساس پیدا ہوتا ہے جو دورانِ جنگ میں ہی نہیں بلکہ امن کے زمانے میں بھی کام کرتا رہتا ہے اور قومی شیرازے کو منتشر ہو جانے سے روکتا ہے۔ لیکن ویسے تو ہمارے دفاعی انتظامات کمی بہتر ہوتے جا رہے ہیں ہماری مالی حالت بھی تسلی بخش ہے' بس ایک استحکام نہیں ہے تو ہماری تہذیبی زندگی میں نئے قسم کا ادب یا کسی قسم کا بھی ادب فراوانی سے پیدا ہونے کے جو آثار اب سے تین سال پہلے نظر آتے تھے وہ بھی رفتہ رفتہ ختم ہوتے جا رہے ہیں۔ آخر ایسا کیوں ہو رہا ہے؟ غنیمت ہے کہ اس سوال نے کچھ نہیں تو ایک محدود طبقے کے دماغ کو تو پریشان کرنا شروع کر دیا ہے۔

انسانی فطرت کی ایک بہت بڑی کمزوری ہے۔ ہر فعل بلکہ شاید ہر احساس سے پہلے انسان یہ معلوم کرنا چاہتا ہے کہ آنے والے لمحوں سے اس کا کیا تعلق ہے' وہ اپنے افعال اور احساسات کا جواز حال میں نہیں بلکہ مستقبل میں ڈھونڈتا ہے۔ مستقبل کا اُسے ایسا جنون ہے کہ اس کے لئے وہ اپنے مال کو بڑی آسانی سے قربان کر دیتا ہے' بلکہ بعض اوقات ایک خیالی اور دور دراز کار مستقبل کے لئے اپنی جان دے دینے سے بھی دریغ نہیں کرتا۔ آدمی آج کے لئے روٹی نہیں کماتا بلکہ کل اور پرسوں کے لئے۔ اس سے بھی آگے بڑھ کر صرف اپنے لئے ہی نہیں بلکہ اپنے بیٹوں اور پوتوں کے لئے۔ پھر اُسے یہ فکر ہوتی ہے کہ جسمانی موت کے بعد بقا کی کوئی صورت ہے یا نہیں۔ بعض لوگ اسی بات میں خوش ہو لیتے ہیں کہ وہ فنا ہو جائیں گے مگر اُن کی جماعت باقی رہے گی اور وہ اس طرح کہ ان کے وجود کو توسیع مل جائے گی۔ بعض لوگوں کی ڈھارس یوں بندھتی ہے کہ ان کے عقیدے کی رو سے اس دنیا کے بعد ایک اور دنیا ہے جہاں وہ انفرادی حیثیت سے باقی رہ سکیں گے ورنہ کم سے کم ایک وسیع تر حقیقت میں جذب ہو جائیں گے۔ انسان کو یقین دلا دیجئے کہ اس کے سامنے ایک لامتناہی مستقبل ہے خواہ یہ مستقبل جہنم کے مسلسل عذاب کا ہی کیوں نہ ہو' اور وہ اس دنیا کے عیش و آرام سے دست بردار ہو جائے گا۔ انسان اپنے ماضی اور حال دونوں کی قدر اسی لئے کرتا ہے کہ اس کے سامنے مستقبل ہے' اور وہ ایک خاص قسم کے عمل کا انتخاب بھی اس لئے کرتا ہے کہ جب مستقبل سامنے آئے تو آن جانا اور ان دیکھا نہ معلوم ہو اور اسے یہ تسلی رہے کہ میرے ماضی اور میرے ارادے نے مستقبل کو یہ شکل دی ہے اور میں اسی طرح کے

مستقبل کا مستحق ہوں۔ چنانچہ آدمی کی قدر و قیمت کا اندازہ بھی مستقبل سے ہوتا ہے۔ آدمی کی قیمت کا انحصار اس بات پر نہیں کہ وہ کیا ہے' بلکہ اس سوال پر کہ وہ کیا بننے کی کوشش کر رہا ہے۔ انسان کی ہر بامعنی جدوجہد کا مرکز مستقبل ہے۔ جیسے ہی آدمی مستقبل سے مایوس یا بے نیاز ہوا' اس کی جدوجہد بھی کمزور پڑ جاتی ہے۔ مستقبل سے منہ موڑ کر حال میں مقید ہوتے ہی اُس کے افعال میں معنویت باقی نہیں رہتی' کیوں کہ ماضی اُس وقت بامعنی اور قابلِ قدر بنتا ہے جب اس کے آگے پیچھے اور لمحے ہوں۔ قدر مقابلے' موازنے' اور انتخاب سے پیدا ہوتی ہے جو لمحہ تن تنہا اور بجائے خود مکمل ہو وہ یا تو مطلق اہمیت کا مالک ہے یا پھر اس کی کوئی اہمیت نہیں' دونوں صورتوں میں یہ لمحہ انسانی اقدار کے دائرے سے باہر ہوگا۔ اپنے آپ کو ایک لامتناہی مستقبل کا یقین دلانے کے لئے انسان نے مذہب ایجاد کیا ہے تاکہ اس مستقبل کی روشنی میں ہر گزرتے ہوئے لمحے کی معنویت اور اہمیت صاف نظر آ سکے۔ گزرے ہوئے لمحوں کو مستقبل میں بھی زندہ رکھنے کے لئے ادب اور فن پیدا کیا ہے۔ تاکہ آئندہ بھی لطف حاصل کر سکنے کی امید میں گزرتے ہوئے لمحے سے اس وقت بھی لطف لیا جا سکے۔ ماضی اور حال دونوں کو جو چیز فنا ہو جانے سے بچاتی ہے وہ مستقبل ہے۔ ہمارا اٹھنا بیٹھنا کھانا پینا صرف اس وجہ سے پر لطف ہے کہ ہمیں یقین ہے کل اور پرسوں بھی ہم یہی کام کر سکیں گے' یہ ایک جانا بوجھا عمل ہے جس کی یہ نوعیت ہم آئندہ بھی برقرار رکھ سکیں گے۔ اور اس لئے ہمیں اس سے لطف لینے کا حق پہنچتا ہے' بلکہ لینا فرض ہو جاتا ہے۔ مستقبل نظروں سے اوجھل ہوا' اور ہم حال سے بے نیاز ہونے لگتے ہیں۔ بلکہ زندہ رہنے کی آرزو تک کمزور ہونی شروع ہو جاتی ہے۔

ہمارے ساتھ سب سے المناک حادثہ یہی ہوا ہے کہ ہمارے سامنے مستقبل نہیں رہا۔ قومی حیثیت سے بھی چونکہ مر نہیں سکتے' اس لئے جئے تو جا رہے ہیں۔ لیکن جیتے رہنے کی خواہش ہمارے اندر کس حد تک ہے یہ اسی سے ظاہر ہے کہ ہم یہ بات سوچتے ہی نہیں کہ جینا کس طرح چاہیئے' جینے کی کتنی شکلیں ہیں' اور ان میں سے کون سی اچھی ہیں اور کون سی بُری۔ جب پاکستان بنا ہی بنا ہے اس زمانے میں بے سر و سامانی کے باوجود ہمارے اندر تھوڑا سا بڑا بولا پن آ گیا تھا' اور ہم کہا کرتے تھے کہ ہم دنیا کی اہم ترین قوموں میں سے ہیں اور ایک دن سب سے اہم قوم بن کے دکھا دیں گے۔ یہ شیخی خوراہ جو ناکوئی اچھی بات نہیں' مگر اس سے اتنا تو معلوم ہوتا تھا کہ ہمیں حال کی اتنی فکر نہیں جتنی مستقبل کی ہے' اور ہمارے

سامنے مستقبل کی کوئی تصویر تھی اور جیسا ہم چاہتے ہیں ویسا بننے کے لئے محنت کی صلاحیت نہ بھی ہو جذبہ اور لگن تو موجود ہے۔ خیر یہ تو ہم کسی زمانے اور کسی ملک میں بھی توقع نہیں کر سکتے کہ ارباب سیاست یا ارباب اقتدار ذاتی فائدے سے بلند ہو کر کام کریں گے مگر کم سے کم سال ڈیڑھ سال تک پاکستان کے عام لوگ یہ ضرور چاہتے تھے کہ ہمارے سامنے مستقبل کا مبہم سا ہی لیکن درخشاں اور امید افزا خاکہ ضرور ہو۔ اس لئے سیاسی لوگ بھی مستقبل کے بارے میں ایک آدھ بات کہنا ضروری سمجھتے تھے۔ لیکن ایک طرف تو مستقبل کے اس تصور کو حقیقی بنانے کے لئے کوئی واضح قدم نہیں اٹھایا گیا؛ عام لوگوں کا تعمیری جذبہ اظہار کا موقع نہ پاکر آہستہ آہستہ سرد پڑنے لگا، اُدھر یہ ہوا کہ ایک قائد اعظم تھے جنہیں پاکستان کے حال سے زیادہ اُس کے مستقبل کی فکر تھی، وہ اُٹھ گئے۔ سیاسی لوگوں کو کھلی چھٹی مل گئی اور وہ اپنے دھندے میں لگ گئے۔ قوم کے دل میں جو عزائم اور ولولے تھے وہ ایک ایک کر کے رخصت ہونے لگے۔ اجتماعی مفاد سے بے نیازی بڑھتی گئی تو ہر آدمی کو اپنی جان بچانے کی فکر پڑ گئی۔ بہر صورت جہاں تک قومی مفاد کا تعلق ہے ہر آدمی یہی سوچتا ہے کہ جب کسی کو ملک کا خیال نہیں ہے تو مجھی کو کیوں ہو اور ہونے سے فائدہ بھی کیا؟ اکیلا چنا کیا بھاڑ پھوڑے گا۔؟

محمد احسن فاروقی

ناول میں معنی خیزی

ناول بھی شاعری وغیرہ کی طرح وہ فن ہے جس کا ذریعہ زبان یا الفاظ ہیں مگر اس میں طرزِ ادا یعنی الفاظ کے کھیل اور تراکیب سازی وغیرہ اتنی اہم نہیں ہے جتنی شاعری میں، کیونکہ زندگی کے جو معنے وہ لانا چاہتی ہے وہ الفاظ فقروں اور جملوں کے بجائے واقعات، کردار اور ان کی ترتیب اور آہنگ سے ادا ہوتے ہیں۔ ہمارے یہاں شاعری میں بھی اقبال سے پہلے الفاظ کے ذریعہ گہرے یعنی فلسفیانہ معنے کا میدان کھولنے کا فن شاذ و نادر ہی نظر آتا ہے اور جب ہمارے یہاں ناول وجود میں آئی تو کسی کو گمان بھی نہ گزرا کہ اس میں سنسنی پیدا کرنے والے واقعات کو تجسس پیدا کرنے کے طریقہ پر جوڑ دینے کے علاوہ بھی کچھ ہوتا ہے۔ ادبی ناول اور غیر ادبی ناول میں صرف یہ فرق ہوا کہ ادبی ناول کو شاعرانہ زبان میں لکھا گیا جیسی عبدالحلیم شرر کی ہے اور آج بھی پرانے قسم کے ناول نگاروں اور افسانہ نگاروں کے یہاں جیسے ابوالفضل صدیقی ۔ یا ایم۔ اسلم وغیرہ کے یہاں ایسی زبان ملتی ہے۔ عام طور پر اور تعلیمی اداروں میں بھی جو ناول پڑھی یا پڑھائی جاتی ہے اس کی زبان کی خوبی کے علاوہ کسی طرف نہ توجہ ہوتی ہے اور نہ توجہ دلانا علم کے بس کی بات ہے کم ہی لوگوں کو جیسے یہ معلوم نہیں کہ شاعر کو الفاظ کے پھیر کے سوا اور کچھ کرنا ہے ویسے یہ بھی معلوم نہیں کہ واقعات میں بھی گہرے معنے ہوتے ہیں۔ ان کا انتخاب' ان کا دوسرے واقعات سے آہنگ اور تضاد ان کا ایک ترتیبی مقام ایک نظریہ یا فلسفۂ حیات یا زندگی کے بے پناہ معنے سامنے لا سکتا ہے۔ ہمارے نقاد کو واقعات کی بلندی اور پستی میں تمیز کرنے کی صلاحیت نہیں ہے۔ وہی واقعہ اگر تعلقے داروں کی زبان میں بیان کر دیا جائے تو آپ کی نظر میں ادبی ہو جاتا ہے اور اگر سرسری زبان میں ہو تو غیر ادبی کہلاتا ہے۔ اسی طرح کردار نگاری کا فن ہمارے یہاں پریم چند سے پہلے بالکل ناپید ہی رہا۔ پھر لوگوں کو معلوم ہوا کہ جہاں جس مرد کا بھی ذکر نام کے ساتھ آ جائے وہ کردار ہو جاتا ہے اور انہوں نے مثنویوں اور مرثیوں میں بھی کردار بتائے اور ان ہی کو معیار مانتے ہوئے جو ناول بھی سامنے آ گئی اس میں کردار نگاری کا یا تو کمال دیکھا اور یا گھبرا کر چپ سادھ

گئے۔ ان کو یہ بھی نہیں معلوم تھا کہ کردار کی دُم کدھر ہوتی ہے تو بھلا یہ کیسے جان سکتے کہ کردار کس طرح زندگی کے اہم
معنے ہمارے سامنے لاتے ہیں۔ مجنوں گورکھپوری اور آل احمد سرور سے یہ امید ہو سکتی تھی کہ وہ کردار کو پہچان
سکنے کے اہل ہوں گے اور ان کی معنے خیزی کا بھی اندازہ لگا سکیں گے مگر اول الذکر کا "زہرِ عشق" میں کردار
اور ناکارنینا کا ہمسر کردار دیکھ لینا اور آخر الذکر کا شرر کی لیلیٰ میں اسی درجہ کی کردار نگاری بتا دینا ہمارے
نقادوں کی اس سلسلے میں کم فہمی پر تعجب پیدا کرتا ہے۔ آج کل جب ہر روز دو چار ناولیں ضرور چھپ جاتی ہیں
اور ان کو پڑھنے والے راتوں رات نپٹا لیتے ہیں یہ بتانا کہ واقعات کی اور کردار کی صورت اور صفات سے بھی
ایک معیار اور ایک ذوق اور گہرے معنے وابستہ ہیں ایسا ہوا جیسے انہیں زمین سے اٹھا کر ایسی جگہ لے جایا
جائے جہاں وہ چکرا کر رہ جائیں اور کچھ نہ سمجھ سکیں۔

اقبالؒ کہتے ہیں ؎

مری صدائے دو زنگی کو شاعری نہ سمجھ — کہ میں ہوں محرمِ رازِ درونِ مے خانہ

اور ان کے الفاظ فقرے اور جملے ہمیں لطف دینے کے علاوہ ایک تفکر کے عالم میں لے جاتے ہیں جہاں
ہمیں رازِ درونِ مے خانہ سے آگاہی ہوتی ہے۔ اسی طرح مفکر ناول نگار بھی کہہ سکتا ہے کہ اس کا قصہ محض
دلچسپ چیز نہیں ہے بلکہ اس کا ہر واقعہ اور اس سے وابستہ ہر کردار ایک عالمِ فکر سے تعلق رکھتا ہے اور دلچسپ
قصے کے ذریعہ ان لوگوں کے لئے جو زندگی کے معنے سمجھنے کے اہل ہوں ایک فلسفہ بہم پہنچاتا ہے۔ اس سلسلے
میں بھی ایک غلط راہ اور ایک صحیح راہ ہے اور یہ ضروری ہے کہ ہم ان میں تمیز کر سکیں۔ انیسویں صدی
کے آخری دس سال میں یورپ میں ایک قسم کی ناول ابھری جسے سوشل ناول کہا جاتا ہے اور اس کی
پیروی ہمارے یہاں پریم چند نے کی اور پھر اسے ترقی پسند اشتالینی پروپیگنڈے کے لئے لے اڑے۔
اس قسم کی ناول میں قدم قدم پر وعظ ہوتے ہیں۔ مکالموں میں بحثیں ہوتی ہے۔ واقعات ایسے گڑھے ہوئے
ہوتے ہیں جو مقصد کی طرف ضرور لاتے ہیں مگر قرین قیاس نہیں ہوتے۔ کردار زندگی سے اٹھائے ہوئے
ہونے کے بجائے کسی خاص کارخانہ سے ڈھال کر نکلے ہوئے معلوم ہوتے ہیں۔ لہٰذا ان میں مقصد تو
ہوتا ہے مگر زندگی نہیں ہوتی اور اس لئے دلچسپی نہیں ہوتی۔ دوسری طرف صحیح راہ پر وہ ناول ہوتی ہے
جسے ظاہری مقصد سے کوئی سروکار نہ ہو مگر غور سے دیکھنے والوں کے لئے ہر واقعہ اور ہر کردار زندگی کی گہرائی
میں لے جانے والا ہو۔ سوال زندگی پر کوئی ٹکے بندھے فلسفہ کو ٹھونسنے کا نہیں ہے بلکہ ناول سے یہ معلوم

ہو کر زندگی کو خود سے دیکھنے والے کے سامنے ایک فکر کی دنیا بھی ابھر رہی ہے۔ ناول نگار کہیں سے لائے ہوئے معنے نہیں بتا رہا ہے بلکہ زندگی خود ایک معنے دے رہی ہے جس کو ناول نگار رقم کرتا جا رہا ہے۔ یہ معنے بڑے پہلو دار ہوتے ہیں اور ہر پڑھنے والا اپنے ذہن کی رسائی کے حساب سے اپنے موافق انہیں ڈھال بھی سکتا ہے۔ یہ بھی امکان ہے کہ مفکر پڑھنے والا اس سے اختلاف بھی کرے اور اسے اپنے تجربے سے مختلف پائے مگر اس کا یہ محسوس کرنا ضروری ہے کہ کوئی چیز اس پر ٹھونسی نہیں جا رہی ہے۔ مفکر ناول نگار اصل میں اپنے تجربے کے اندر ایک معنے تلاش کرتا ہوا نظر آتا ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ وہ کوئی سائنسی تجربہ کر رہا ہے اور پڑھنے والا اس کے ساتھ اس تجربے کے مدارج طے کرتا ہوا ایک گہرائی تک پہونچ جاتا ہے۔ سوشل ناول لکھنے والے کچھ بھی تخلیق کرتے ہوئے نہیں نظر آتے 'لٹھ مارتے چلے جاتے ہیں۔ صحیح معنے خیز ناول لکھنے والے گہرائی کی تلاش میں گم نظر آتے ہیں اور قاری کو بھی اپنے ساتھ دلچسپی کی ڈوری میں باندھے ہوئے لے جاتے ہیں۔ گوئٹے کہ جو ادب کی ہر صنف میں معنے خیزی کا سب سے بڑا بادشاہ ہے اور دو بڑی معنے خیز ناولوں کا بھی مصنف ہے یہ بتاتا ہے کہ ادب میں فلسفہ بالکل غائب ہو جانا چاہیئے اور اگر وہ ملے تو اسی کو جو زندگی میں بھی فلسفہ ڈھونڈھنے کا اہل ہو۔ اس کی ناول "ولہم میسٹر" (WEHLEM MEISTER) کا ہیرو زندگی کے اندر داخل ہو کر ایک قسم کی بصیرت حاصل کرتا چلا جاتا ہے اور یہ بصیرت پڑھنے والے کو بھی حاصل ہوتی رہتی ہے۔ جرمنوں نے معنے خیز ناول کا نام BILDUNGS ROMAN رکھا ہے۔ یہ نام ہی اس خاص ترکیب کے ساتھ جو جرمن زبان کا حصہ ہے' واقعات اور کردار کی اسی معنے خیزی کی طرف اشارہ کرتا ہے جو اہم ادبی ناول کا طرۂ امتیاز ہے۔ مقصد یہ ہے کہ قصہ اپنے پھیروں سے اور کردار اپنے ارتقا سے ان لوگوں کو جو اس کے اہل ہوں ایک فکری عالم میں پہونچا دے۔ یہ فن بڑا مشکل ہے کیونکہ یہ سعادت زورِ بازو سے نہیں ہے۔ جو لوگ شعوری طور پر اس راہ پر چلنے کی کوشش کرتے ہیں وہ ترقی پسند ناول نگاروں کی طرح پھوہڑپنے کا شکار ہو جاتے ہیں جس کی مثال اردو میں پریم چند اور ان کے پیرو ہیں۔

اصل میں سوال ناول نگار کی ہستی کا ہے۔ فرانسیسی ڈرامہ نگار کہتا ہے (TEL ARBRE TEL FRUIT) ۔ جیسا پیڑ ویسا پھل ۔ اور یہ عقیدہ یونانیوں سے چلا آرہا ہے کہ ہر عظیم نظم لکھنے والے کو عظیم آدمی ہونا چاہیئے۔ ہمارے رشید احمد صدیقی بھی کہتے ہیں کہ نامعقول آدمی معقول کتاب نہیں لکھ سکتا۔ بات یہ ہے کہ ناول نگار کے ذہن کی فطری سطح کو بلند ہونا چاہیئے۔ یہ بلندی شرافت نفس، پیدائشی ذہانت اور قوتِ تخیل' بچپن کے ماحول اور اس کی تہذیبی بلندی اور تعلیم (جس کے معنے محض ڈگریاں حاصل کر لینا نہیں

بلکہ ہر قسم کا علم نہایت خلوص سے اپنے دل کی تسلی کے لئے اور اپنے شوق کو پورا کرنے کے لئے حاصل کرنا ہے اور مخصوص فکری رجحان سے حاصل ہوتی ہے۔ اس سطح پر آیا ہوا شخص وہ نہیں ہو سکتا جو جہاں کسی علمی یا فکری موضوع پر بات ہو وہاں چُپ رہے یا وہاں سے بھاگ لے۔ وہ صاحب رائے اور دانشور ہوتا ہے اور اگر اس سطح کا آدمی قصہ گوئی کی طرف وہ مخصوص رجحان رکھتا ہے جو ہم ناول نگاری کے لئے بنیادی قرار دیں تو جو قصہ وہ بیان کرے گا اور جو کردار وہ سامنے لائے گا اُن میں دلچسپی کے علاوہ بڑے معنے چھپے ہوئے ہوں گے۔ روز ہی ہماری ایسے آدمیوں سے بات ہوتی ہے جن کے منہ سے الفاظ نکلتے ہی ہمیں ان کی ذہنی سطح معلوم ہو جاتی ہے۔ اسی طرح مجھے ناول کے دو صفحے پڑھتے ہی یہ معلوم ہو جاتا ہے کہ ناول نگار کی سطح کیا ہے۔ ایک ناول نگار جن کی ناول کا ایک پیراگراف بھی مجھ سے اس لئے نہیں پڑھا گیا کہ اس میں ہر جملے میں دو چار فقرے ایسے تھے جن کی وجہ سے یہ معلوم ہی نہ ہوا کہ وہ کیا کہنا چاہتے ہیں مجھ سے تخلیہ میں کہنے لگے۔ "یہاں کوئی نہیں ہے سچ سچ بتاؤ کہ اب بھی پڑھتے ہو؟" میں انہیں دیکھ کر دنگ رہ گیا۔ ان کے اس سوال سے ان کی فطرت کے بابت دو باتیں صاف سامنے آگئیں ایک یہ کہ وہ جاہل ہیں اور دوسروں کو بھی جاہل سمجھتے ہیں۔ انہوں نے کبھی کچھ پڑھا ہوگا تو زبردستی اور اب اس سے بھی سبکدوش ہو گئے اور مجھ کو بھی جس کا ہر وقت اوڑھنا بچھونا کتاب ہے ایسا ہی سمجھتے ہیں۔ دوسرے یہ کہ وہ ریاکاری اور تخلیہ میں سچی بات کہلوانا چاہتے ہیں جبکہ عام طور پر وہ یہ سمجھتے ہیں کہ ہر شخص کو کچھ نہ کچھ بلکہ زیادہ تر ڈینگ کی لینا چاہئے۔ اس ذہنی اور اخلاقی سطح کا آدمی اگر ناول لکھتا ہے تو اس کی ناول میں کسی گہرائی کا سوال نہیں اور طرز کی بے معنے بناوٹ کے سوا اور کچھ ہونے کا امکان نہیں۔ جیسے ان سے ایک بات کرنے پر ویسے ہی ان کی ناول کے ایک پیراگراف پڑھنے پر ان کے ذہنی اور ان کے اخلاق کی سطح معلوم ہو جاتی ہے۔ برخلاف اس کے قرۃ العین سے جب بات چیت ہوئی تو یہ واضح ہو گیا کہ وہ کیا سوچ رہی ہیں اور ان کی ناول یا طویل افسانہ کس فکر کو سامنے لاتا ہے۔ میں ان کی ناولوں سے اور ان کے افسانوں کے مخصوص نتائج سے بالکل اتفاق نہیں کرتا مگر میں یہ نہیں کہہ سکتا کہ ان کی فکر پست ہے۔ وہ کوئی خاص قصہ نہیں بناتیں مگر جو واقعات وہ سامنے لاتی ہیں اور جن کرداروں کو ابھارتی ہیں وہ محض دلچسپ ہونے کے علاوہ ان کی مخصوص نظر کی ترجمانی کرتے ہیں۔ ریکس وارنر (REX WARNER) کہتا ہے کہ ناول ایک عقیدہ کا اظہار ہے۔ عقیدہ قدروں سے تعلق رکھتا ہے۔ عام آدمی کے پاس کوئی قدریا نہیں ہوتیں۔ وہ بالکل اٹکل پچو اڑاتا ہے۔ اس کی باتوں سے معلوم ہو جاتا ہے کہ وہ کچھ نہیں کہہ رہا ہے۔

دانش ور جو بات کہتا ہے اس میں دانش صاف جھلکتی ہے۔ دانشور ناول نگار جو قصہ بیان کرتا ہے اس میں ہر ہر سطر پر ظاہرہ چمک کے پیچھے ایک عالم فکر چھپا ہوا نظر آتا ہے۔ یہ ضروری نہیں کہ ہے کہ ناول نگار بڑا عالم فاضل بڑا صاحب رائے ہو یا بڑا متقی پرہیز گار ہو مگر اس کے قصے سے ایک عالمانہ گہرائی اور ایک اخلاقی سطح کا وجود ظاہر ہونا ضروری ہے۔ خدیجہ مستور کو کسی طرح دانشور یا عالم فاضل نہیں کہا جا سکتا مگر ان کی ناول "آنگن" اس چھوٹے سے گھر کی فلسفیانہ گہرائیاں اور اخلاقی قدریں سامنے لاتی ہے جس کا اس ناول میں حال بیان ہوا ہے۔ یہاں کوئی ٹکا بندھا فلسفہ یا درسی اخلاق نہیں ہے بلکہ اگر غور سے دیکھا جائے تو چھمی کی ایسی لڑکی کو بد اخلاق اور پست نظر کہا جا سکتا ہے مگر اس کے اور اس کے گھر کے تمام لوگوں کو ناول نگار نے اونچی سطح سے دیکھا ہے اور یہ سطح پڑھنے والے کے سامنے آجاتی ہے۔ قابلِ وقعت ناول نگار پست سے پست اور معمولی سے معمولی زندگی میں بھی اپنی نظر کا معیار اس طرح شامل کر دیتا ہے کہ اس کے بیانات کا ہر جملہ اور اس کے مکالموں کی ہر بات ایک شعر کی طرح معنے خیز ہو جاتی ہے اور پورے حالات، واقعات اور محض چلتی پھرتی چیزوں کے علاوہ معنوں کا مبداء ہو جاتے ہیں۔ برخلاف اس کے شوکت صدیقی کی "خدا کی بستی" کے تین صفحے پڑھنے کے بعد ہی معلوم ہو گیا کہ وہ بڑے لغو طبقے کی زندگی کو بڑے لغو نقطۂ نظر سے دیکھ رہے ہیں اور مجھے محسوس ہو گیا کہ یہ ناول بڑے پست درجہ کی ہے۔ خدا کی بستی کے بجائے اگر اس کا نام خدا کی پستی ہو تو بہتر ہے کیونکہ جس خدا نے اس ناول کی دنیا بنائی ہے وہ پست درجہ کا ہے۔

شاعری کے سلسلے میں یہ کہا جاتا ہے کہ ایک زبان کی شاعری کا دوسری زبان میں ترجمہ ناممکن ہے مگر ناول کے لئے یہ مسلم ہو چکا ہے کہ اس کا ترجمہ ہو سکتا ہے اور دنیا کی بہترین ناولیں یعنی ٹولسٹوے اور دوستوفسکی کی ناولیں دنیا میں انگریزی ترجموں کی وجہ سے مقبول ہوئیں اور عظیم مانی گئیں۔ ان کا ترجمہ کرنے والے انگریزی کے کوئی بڑے مصنف نہ تھے اور ظاہر ہے کہ ان ناول نگاروں کا مخصوص طرز ترجموں میں نہیں آ سکا۔ ان کی بڑائی ان واقعات میں ہے جو کسی زبان میں بھی بیان کئے جا سکتے ہیں اور جو انسانی زندگی کا ایک بڑا وسیع اور عمیق منظر دکھاتے ہیں۔ مثلاً ٹولسٹوئے کی "انا کارنینا" کا وہ واقعہ جب انا کے یہاں رونسکی کا بچہ پیدا ہو رہا ہے

اس کو میاں بھی موجود ہے اور رونسکی بھی اناّ کی بے قراری کا عالم بڑھے گہرے نفسیات اور ضمیر کی بڑی تیز زور آواز
سامنے لا رہی ہے۔ وہ اس زنا سے توبہ کر رہی ہے جس کے نتیجے میں یہ بچہ اس کے پیٹ میں رہا۔ اس کا میاں
اس کی غلطی کو ایک سچے عیسائی کی طرح معاف کر دیتا ہے۔ رونسکی اپنی زیادتی کا احساس کر کے اپنے گولی مار لیتا ہے مگر
گولی اس کے بازو میں ایسی جگہ لگتی ہے کہ وہ مرتا نہیں اور بعد میں علاج سے ٹھیک ہو جاتا ہے کچھ عرصے کے بعد اناّ
کی توبہ آپ سے آپ ٹوٹ جاتی ہے اور وہ میاں کو چھوڑ کر پھر رونسکی کے ساتھ ہو جاتی ہے۔ یہ تمام واقعہ جس
تفصیل سے سامنے لایا گیا ہے وہ عام ناولوں کے واقعات کی طرح محض سنسنی خیز بھی ہو سکتا تھا مگر اس میں
سنسنی کے ساتھ انسانی فطرت، عشق کی نوعیت اور نیکی اور بدی کی کشمکش کے تاثرات اس طرح شامل ہیں کہ
قصہ قصہ نہیں رہ جاتا بلکہ زندگی کی آفاقی درجہ پر ترجمانی ہو جاتا ہے۔ ٹولسٹوئے زبردست مصلح تھا اور
ظاہر ہے کہ اس نے اناّ کو عورت کے جنسی اخلاق کے گر جانے کا نمونہ بنا کر پیش کرنا چاہا تھا اور اسی لئے اس نے
اس کے قصہ کے متوازی ایک با اخلاق زندگی کے حالات بھی پیش کئے ہیں مگر لوئینا کی اپنے شوہر کے ساتھ
کامیاب زندگی ویسی دلکش نہیں ہوتی جیسی اناّ اور رونسکی کی غیر قانونی زندگی۔ وجہ یہ ہے کہ اناّ کے اس رجحان
میں جسے بدکاری کہا جائے ایسے ایسے پیچ ہیں اور ان پیچوں سے انسانی فطرت پر اور خاص طور سے نسائی فطرت
پر وہ روشنی پڑتی رہتی ہے کہ اناّ مکمل طور پر نہ صرف روسی عورت یا یورپین عورت بلکہ تمام عالم کی عورت کا
نمونہ ہو جاتی ہے۔ نسائیت اپنی تمام خوبیوں اور خامیوں کے ساتھ سامنے آکر ایک آفاقی چیز ہو جاتی ہے۔ وہ
تمام فلسفہ اور اخلاق جس کا درس دینا ٹولسٹوئے کا مقصد تھا ہماری نظر سے محو ہو جاتا ہے اور ہم نسائیت
کے کائناتی مظہر میں گم ہو جاتے ہیں۔ قدیم دیو مالاؤں میں دیویوں کو ایسا دکھایا گیا ہے کہ ان میں اخلاقی بلندیوں
کے ساتھ اخلاقی پستیاں ہیں مگر وہ دیویاں ہی رہتی ہیں جن کی کسی بات پر ہم حرف نہیں لا سکتے۔ اناّ بھی نسائیت
کا عظیم اور حسین بت ہے کہ اس میں ذہنی، جذباتی اور جسمانی خوبیاں ایک سماجی غلطی کی وجہ سے مٹ کر رہ جاتی
ہیں۔ ہم محسوس کرتے ہیں کہ وہ غلط نہیں ہے بلکہ سماج غلط ہے۔ اس کی ایسی خوبصورت اور عظیم چیز کے لئے
زیادہ خوبصورت اور عظیم سماج کی ضرورت ہے۔ اس کے کردار کا یہ تاثر لفظوں، فقروں اور جملوں کا محتاج نہیں
ہے۔ واقعات کا پھیر اس کا ہر پہلو سامنے لاتا ہے اور وہ زیادہ سے زیادہ معنے خیز ہوتی جاتی ہے۔ وہ ہمارے ذہن کا
ایک خاص حصہ ہو جاتی ہے اور جب بھی ہم نسائیت کے بابت سوچنے لگتے ہیں تو وہ مجسم ہمارے سامنے آکر کھڑی ہو
جاتی ہے اور ہمارے تمام خیالات کو اور تمام قدروں کو منتشر کر دیتی ہے۔ ناول کی معنے خیزی کی یہ حد ہے

اس حد تک کم ہی ناول نگار پہونچتے ہیں مگر ناول کی ادبی قیمت اسی راہ پر چلنے میں ہے اور ناول کو شروع کرتے ہی یہ محسوس ہو جاتا ہے کہ وہ اس راہ پر جا رہی ہے کہ نہیں۔ مثلاً جین آسٹن کی ناول "پرائڈ اینڈ پریجوڈس" اٹھا لیجئے۔ شروع کرتے ہی محسوس ہوتا ہے کہ ایک اوسط طبقہ کے گھر میں ایک ماں اور باپ پڑوس میں آکر بسنے والے ایک شریف جوان کے بابت بات کر رہے ہیں کیونکہ ماں کو اپنی پانچ جوان لڑکیوں کی شادی کی فکر ہے۔ باتوں باتوں میں پانچوں لڑکیوں کے کردار بھی آجاتے ہیں اور دوسری لڑکی الزبتھ اپنی ذہانت کی بنا پر سب سے زیادہ نمایاں ہو جاتی ہے معلوم ہوتا ہے کہ جو کچھ ہونے والا ہے وہ سب ایک فلیش میں سامنے آگیا۔ عشق اور شادی کا مسئلہ سات اور نوے ایک چھوٹے سے واقعہ سے ابھر آیا۔ ایک طرح تو کوئی بات ہوتی ہی نہیں مگر غور سے دیکھنے والے کے لئے جوان لڑکیوں کے تعلق پر بالکل نئے انکشافات ہونے لگے امید ہو گئی کہ آگے واقعات کے ساتھ ساتھ یہ موضوع بھی سامنے آتا جائے گا۔ ناول پڑھنے میں یہ محسوس ہوتا ہے کہ ماں کے لئے الگ، باپ کے لئے الگ اور ہر لڑکی کے لئے الگ محبت اور شادی معنے رکھتی ہیں اور یہ معنے اول تو اس ماحول سے تعلق رکھتے ہیں جو ناول کا ہے مگر ساتھ ہی ساتھ دنیا کے کسی ماحول پر بھی عائد ہو سکتے ہیں۔ یہ ہر شخص کہے گا کہ ناول زندگی کی ترجمانی کرتی ہے۔ غور سے دیکھا جائے تو ہر شخص کی ہر بات زندگی کی ترجمانی ہوتی ہے جیسے ہر موزوں کلام شعر ہو سکتا ہے سوال سطح کا ہے۔ دیکھنا یہ ہے کہ ترجمانی کس عالم میں لے جاتی ہے۔ ترجمان کس بلندی پر پہنچا ہوا ہے اور کس گہرائی تک اس کی نظر جا رہی ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ دیکھنے کے لئے پڑھنے والے کی بھی نظر ضروری ہے۔ جین آسٹن کی جس ناول کا میں نے اوپر ذکر کیا وہ بھی دنیا کی عظیم ترین ناولوں میں ہے اور اس پر اردو میں بھی طویل مضمون لکھ چکا ہوں جو میری کتاب " ادبی تخلیق اور ناول" میں شامل ہے مگر میں نے اس کے پہلے باب کو کئی اردو نقاد اور ناول نگاروں کے سامنے رکھا۔ ان لوگوں کو اس میں کچھ بھی نہ نظر آیا اور زیادہ تر طالب علموں کو تو میں نے اسے "بڑا بور" کہتے ہوئے سنا۔ اسی عالم کو دیکھ کر علی عباس حسینی مرحوم نے اپنی کتاب " اردو ناول کی تاریخ اور تنقید" میں ایک جگہ کہا کہ اگر اردو میں کوئی صحیح معنوں میں ادبی ناول لکھ بھی دے تو اسے کون چھاپے گا اور کون پڑھے گا۔ حقیقت یہ ہے کہ ناشر چلتی ہوئی ناولیں مانگتے ہیں۔ پروفیسر ایسی ہی ناولوں کو نصاب میں رکھتے ہیں اور انعام دلواتے ہیں۔ ناول لکھنا ذلیل کام ہے اور ناول پڑھنے والے وقت کاٹنے کے سوا اور اس کا کوئی مصرف نہیں جانتے۔ نیاز فتحپوری کے بارے میں بھی کئی جگہ لکھ چکا ہوں کہ وہ شاعری کا ذوق ضرور رکھتے تھے مگر ناول کے معاملے میں بالکل کورے

تھے ۱۹۳۶ء کے بعد جو نقاد اُبھرے ان سے زیادہ امید ہو سکتی تھی مگر انہوں نے اگر ان سے کسی ناول کے بابت بات ہوئی تو اُول فول بک دیا اور اگر لکھا تو اس وقت جب اِدھر اُدھر کی کچھ رائیں دیکھ لیں تو ان میں سے اپنی رائے بھی بنالی۔ بہرحال ہمارے تمام نقاد شاعری ہی شاعری پڑھے ہونے کی وجہ سے نہ ناول کی معنے خیزی سے واقف ہیں نہ اپنے طالب علموں اور عام پڑھنے والوں کو اس سے واقف کرانے کے اہل ہیں۔

خیر اس بدمذاقی کا کہاں تک ذکر ہوگا۔ بات یہ ہے کہ ناول، ڈرامہ اور ایپک کے ملا دینے سے وجود میں آئی اور اس کی معنے خیزی تک پہونچنے کے لئے ڈراموں اور ایپک نظموں کا مطالعہ ضروری ہے۔ یہ دونوں اصناف یونانیوں کی ایجاد ہیں جن کے لئے سعدی نے بھی کہا ؎

عقل و دانائی و فرہنگ بہ یونان دادند

ڈرامے میں پہلا نام ایسکیلس کا ہے۔ اس کے تین ڈراموں کا مجموعہ جس کو "اوریسٹین ٹرلوجی" کہا جاتا ہے بادشاہ اگامنن اور اس کے لڑکے اوریسٹیس سے وابستہ قصوں پر مبنی ہے۔ پہلے ڈرامے کا اہم واقعہ یہ ہے کہ اگامنن کو اس کی بیوی کلیٹا منسٹرا قتل کر ڈالتی ہے۔ دوسرے ڈرامے میں مرکزی واقعہ اوریسٹیس کا باپ کا بدلہ لینے کے لئے ماں کو قتل کر دینا ہے۔ تیسرا ڈرامہ دیوتاؤں کی عدالت دکھاتا ہے جہاں انتقام کی دیویاں اوریسٹیس کے خلاف مقدمہ پیش کرتی ہے۔ اس مقدمہ میں اوریسٹیس کو معاف کر دیا جاتا ہے اور انتقام کی دیویاں کو رحم کی دیویوں میں تبدیل کر دیا جاتا ہے۔ ہم شروع ہی سے اس قصہ کے دہشت ناک واقعات کے ساتھ ساتھ یہ محسوس کرتے ہیں کہ انصاف اس کا موضوع ہے۔ ایک معاشرہ ہے جو انتقام کو انصاف سمجھتا ہے مگر بعد میں انتقام رحم سے بدل دیا جاتا ہے اور یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ انصاف میں رحم کا پہلو غالب رہنا چاہیئے ورنہ انسانی سوسائٹی امن تک نہ پہونچ سکے گی۔ اس طرح اخلاق کے بابت سب سے اہم نظریہ ہمارے سامنے آتا ہے اور ان اخلاقیات کی طرف لے جاتا ہے جن کو ارسطو نے اصولوں میں تبدیل کیا اور جو آج بھی تمام اخلاقیات کی بنیاد ہیں۔ اس طرح آپ فرانس اور انگلستان اور جرمنی کے ڈرامے لیجئے یا آج کل ابسن، شاؔ اور سارتر تک آجایئے آپ کو محسوس ہوگا کہ ڈرامے ظاہرہ تو تماشے ہیں مگر بنیادی طور پر فلسفے کے انکشاف ہیں۔ فلسفہ ذہنی چیز ہے جس کو عقلی الفاظ یا بحثوں کے ذریعہ پیش کیا جاتا ہے ڈرامہ نگار کا کام یہ ہے کہ وہ اسے تخیلی صورت دے۔ اس کی کامیابی اس میں ہے کہ تخیلی تصویروں میں فلسفہ اس طرح چھپ جائے کہ عام آدمی کو دکھائی نہ دے۔ اس کی مثال گوئٹے کے ڈرامہ "فاوسٹ" سے یوں لے لیجئے کہ بدی کے

بابت جو نظریۂ فلسفہ اس کے زمانے کے فلسفوں میں عام تھا اسے اس نے میفسٹوفلیس کے کردار میں پیش کر دیا۔ یہ کردار اتنا زور دار جیتا جاگتا ہے کہ آج اسے شیطان یا شیطانیت کا سب سے زیادہ تشفی بخش نقشہ مانا جاتا ہے۔ پھر اگر آپ فاؤسٹ کے قصہ کو دیکھئے تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ میفسٹوفلیس جو بھی کوشش فاؤسٹ کو بدی میں پھنسانے کی کرتا ہے اس میں سے نیکی نکل آتی ہے اور اسی طرح وہ واقعات جن کو عام ڈرامہ دیکھنے والے نے محض دلچسپ سمجھ کر قبول کیا غور سے دیکھنے والے کے لئے خیر و شر کی کشمکش کے نمونے ہیں اور یہ ثابت کرتے رہتے ہیں کہ آخری فتح خیر کی ہے۔ ڈرامے کا خاتمہ یہ ہے کہ فاؤسٹ کی محبوبہ مارگریٹا اپنا گناہ مان لیتی ہے اور اس طرح خدا کے سامنے سر جھکا دیتی ہے اور مر جاتی ہے۔ فاؤسٹ جواب تک بدی کے پھندے میں تھا یہ محسوس کرتا ہے کہ نیکی کی بنیاد ایثار یا شہادت ہے۔ اب آسمان سے آواز آتی ہے جو اسے اپنی طرف بلاتی ہے۔ یہ ڈرامہ جو عام طور سے مقبول ہوا اصل میں نیکی پر ایک مقالہ ہے مگر مقالے سے وہ مختلف یوں ہے کہ وہ بالکل تخیلی چیز ہے۔ واقعات اور کردار موضوع کو بتاتے نہیں بلکہ اس کو محسوس کرا دیتے ہیں۔ اسی طرح ہم ایپک نظموں میں ہومر کی تصانیف سے شروع کر کے ملٹن کی "پیراڈائز لاسٹ" تک کا جائزہ لے سکتے ہیں اور یہ دکھا سکتے ہیں کہ ان کا جسم تو قصہ اور کردار ہیں مگر ان کی ریڑھ کی ہڈی فلسفہ ہے جو دکھائی نہیں دیتا مگر جو جسم کی قوت کی بنیاد ہے۔ ناول کے موجد فیلڈنگ نے اس صنف کو ڈرامے اور ایپک کا امتزاج بتایا اور چاہے ہم اس کے دیباچوں کو دیکھیں یا اس کے شاہکار "ٹوم جونس" کو ہم کو برابر محسوس ہوتا ہے کہ واقعاتی قصہ سنجیدہ و مزاحیہ کردار ہر قدم پر ایک نئے نظریۂ نفسیات اور نظریۂ اخلاق کی طرف لے جا رہے ہیں۔ انیسویں صدی میں جب تجارتی ذہنیت ایک طرف اور تعلیم دوسری طرف عام ہوئی تو ایسی ناولیں آنا شروع ہوئیں جو بالکل سطحی تھیں اور اب ان کی تعداد نوّے فی صد سے زیادہ ہو گئی ہے۔ ہمارے یہاں بھی دوسرے قسم کی ناولوں کا رواج ہوا اور اب یہ عالم ہے کہ زیادہ تر لوگ اسی قسم کی ناولوں کو سمجھتے ہیں اور یہ جانتے بھی نہیں کہ معنے خیز ناول بھی کوئی چیز ہوتی ہے۔ اوسط میں کم از کم دو ناول تو روز ضرور پریس سے نکل کر ملک میں پھیل جاتے ہیں۔ قصہ میں دلچسپی رکھنے والے چاہے وہ معمولی تعلیم یافتہ ہوں یا عالم اور نقاد ہوں ان ہی کو پڑھتے ہیں اور ان کا ناول کے سلسلے میں ذوق اس سے آگے نہیں جاتا۔ جمہوریت بدمذاق ہونے کی آزادی دیتی ہے۔ عوام میں عقیدہ حامیانہ مذاق کو بڑھاتا ہے۔ اسکول بچوں تعلیم بدمذاقی کو ہی اعلےٰ ذوق گنواتی ہے اور ناول میں معنے خیزی "بوریت" کے مترادف سمجھی جاتی ہے۔

اس عالم میں سوال ہوتا ہے کہ کیا ہمارے یہاں ناول اب درجہ پر نہ آ جائے گی کہ وہ بھی ہر اعلیٰ ادب کی طرح معنے خیز ہو اور اس معنے خیزی کی طرف جائے جو دنیا کی عظیم ترین ناولوں میں ملتی ہے؟ نہیں یہ بات نہیں ہے۔ اس وقت اردو میں ناول لکھنے والوں کی تعداد گنی جائے تو دس ہزار سے کم نہ نکلے گی مگر ان میں دس ضرور ایسے ہیں جن کی ناولیں معنے خیز ضرور ہیں۔ یہ تعداد بہت ہے۔ میر کے زمانے کے مشاعروں میں ہزاروں نہیں تو سینکڑوں شاعر تو ضرور اپنا کلام سناتے ہوں گے مگر آج ان میں سے میر۔ سودا۔ درد۔ میر حسن ہی کے نام جانے جاتے ہیں۔ اگر ایک صدی تک ہمارے دس ناول نگاروں میں سے تین بھی باقی رہ جائیں تو ہمارے ادب میں بھی معنے خیز ناول کی روایت قائم ہو جائے گی۔ ہماری کلاسیکی ناولوں میں اگر کوئی ایک معنے خیزی کے دائرے میں آتی ہے تو وہ "امراؤ جان ادا" ہے۔ اس میں امراؤ جان خود کا ایک شعر ہے ؎

ہم نہیں ان میں جو پڑھ لیتے ہیں لڑکوں کی طرح

مکتبِ عشق و وفا تجربہ آموز بھی تھا

اس شعر میں "تجربہ آموز" کا فقرہ بڑی دور لے جاتا ہے۔ ناول کی معنے خیزی (جس کو مقصدیت کہہ کر ترقی پسندوں نے ذلیل کر دیا) اصل میں تجربہ آموزی ہے۔ اس میں جو قصہ ہوتا ہے وہ واقعات ہی سے بنتا ہے مگر یہ واقعات سنسنی پیدا کرنے کے لئے بنائے ہوئے نہیں ہوتے بلکہ ایک مفکر کے تجربے ہوتے ہیں۔ صاحبِ ذوق پڑھنے والے میں یہ تمیز ہونا چاہیئے کہ واقعہ کسی حد تک تجربہ کی چیز ہے اور زندگی کے کیا معنے یا گہرے تاثر کو سامنے لاتا ہے۔ اگر وہ ایسا نہیں کرتا تو بالکل سپاٹ تک بندی کی طرح اس کو بھی رد کرنا لازم ہے۔ پھر ناول میں مختصر افسانے کے خلاف واقعات پر واقعات ایک سلسلے میں بندھے ہوئے آتے ہیں؛ یہ سب مل کر ایک بڑا اور مربوط تجربہ پیش کرتے ہیں یا ایک پوری سوسائٹی کا ایک خاص نقطۂ نظر سے پیش کیا ہوا سارا عمل سامنے آ جاتا ہے۔ کچھ لوگ کہتے ہیں کہ ناول میں قصہ کوئی چیز نہیں کردار خاص چیز ہے اور ادبی ناول اسے کہتے ہیں جو قصہ بیان کرنے سے زیادہ کردار ابھارنے کا کام کرتی نظر آئے۔ یہ رائے اس کرداری ناول کی وجہ سے قائم ہوئی جو ہفتہ وار اخباروں میں سیریل کی طرح چھپا کرتی تھی اور جس میں قصہ بیان کرنے کے بجائے ایک یا چند کرداروں کو مختلف اور ہر مرتبہ الگ واقعہ میں پھنسا ہوا دکھانا مقصود ہوتا تھا۔ مگر اس وقت بھی اور آج بھی مکمل ناول میں کردار واقعات کے ساتھ چلتے ہیں اور ہر واقعہ ان کا نیا پہلو دکھاتا ہے اور ارتقاء کرتا ہوا قصہ ان کا بھی ارتقاء سامنے لاتا ہے۔ ناول کے مکمل تجربے میں دونوں کا مقام برابر ہی کا ہے اور چند ناول نگار تو دونوں میں توازن اور آہنگ کو وصف گنتے ہیں۔ پروفیسر احمد علی

کے سامنے اگر ان کی ناول "دلی کی شام" کے کردار ہی کا ذکر کیا جائے تو وہ بجا طور پر کہتے ہیں "کردار نگاری کوئی چیز ہے۔ یہاں ایک معاشرے کا ایک وقت میں مکمل نقشہ پیش کیا گیا ہے۔" اصل بات یہی ہے کہ ایک مکمل تجربہ جس کے تانے بانے قصہ اور کردار میں ناول نگار کے تخیل میں آتا ہے، ناول نگار کی فکر اور فنی شعور کا اسے ملک دینا لازمی ہے۔ جیسے فوٹو گراف کی پلیٹ پر ایک ہی منظر کی تصویر لینے کی قوت اور پلیٹ کے مسالے کی خوبی کے حساب پر مبنی ہوتی ہے ویسے ہی ناول کی تصویر کی حقیقت کا نقشہ ناول نگار کی ایک طرف فکر اور دوسری طرف تخیل کی پستی اور علویت کے مطابق ہوتی ہے۔ فٹ پاتھ پر چوکی میں تصویر کھینچنے والوں کے بنائے ہوئے فوٹو ان لوگوں کی نگاہ پر نہیں چڑھتے جو اونچے فوٹو گرافوں کے یہاں فوٹو کھنچوانے کے عادی ہیں اسی طرح پست نظر اور پست اخلاق لوگوں کی ناولیں بھی اعلےٰ ذہنی سطح کے لوگ دیکھتے ہی الگ کر دیتے ہیں۔ ڈاکٹر عبد السلام نے جو ناول نگاری کے اہم نقاد ہیں اپنے ایک مضمون میں "انسپریشن" کا ذکر کیا اور فن کے سلسلے میں اس کی اہمیت جتائی۔ میں بھی اس ناول کو اہم قرار دیتا ہوں جو "انسپریشن" کا نتیجہ ہو مگر اس بات پر زور دینا چاہتا ہوں کہ ایک ایسے شخص کے جو ذہنی اور تخیلی درجہ میں پست اور ایسے شخص کے جو ہر قسم کی فکر سے واقف ہو اور ہر طرح کے فن کا احساس رکھتا ہو "انسپریشن" میں فرق ہے۔ انسپریشن ناول نگار کو کام میں محویت کے ساتھ مصروف کر دیتا ہے مگر اس کی صلاحیتوں میں کوئی فرق نہیں پیدا کرتا۔ ہمارے یہاں "آمد" اور "آورد" کی اصطلاحیں تنقید کے رائج سکے ہیں ایک کو کھرا اور دوسرے کو کھوٹا سمجھا جاتا ہے۔ مگر غور کی بات یہ ہے کہ جیسے سچا سکہ بیسہ بھی ہو سکتا ہے اور اشرفی بھی ویسے ہی آمد چھوٹے درجہ کے مصنف میں بھی ہو سکتی ہے اور بڑے درجہ کے مصنف میں بھی۔ یہ ضروری نہیں ہے کہ آمد سے معنے خیزی پیدا ہو جائے۔ آمد ایک قوت ہے جو فنکار کے اندر بھری ہوئی چیز کو اک دم سے یا زور کے ساتھ نکال دیتی ہے۔ اصل میں وقعت کے قابل اس چیز کی "کوالٹی" ہے جو نکل کر صفحۂ کاغذ پر نقش ہو جاتی ہے۔ کوالٹی کا تعین "انسپریشن" سے نہیں بلکہ تجربہ آموزی کی قوت سے ہونا چاہیئے۔ ناول تجربہ کی جتنی تہیں کھولتی جائے گی اور اسے جتنی اونچی قدروں سے وابستہ کرتی جائے گی اتنی ہی معنے خیز ہوتی جائے گی۔ عظیم ترین ناولوں میں ایک مقام کا واقعاتی تجربہ آفاقی اور دوامی معنے تک پہنچ جاتا ہے۔

جمال پانی پتی

حق و باطل کا معانقہ

"معاصر" لاہور کے پہلے شمارہ میں سلیم احمد کے دو مضامین محمد حسن عسکری پر شائع ہوئے تھے۔ ان میں سے ایک عسکری صاحب کے تصورِ روایت پر تھا اور دوسرا مشرق و مغرب کی آویزش پر۔ یہ دونوں مضامین اب ان کی کتاب "محمد حسن عسکری۔ آدمی یا انسان؟" میں شامل ہیں۔ پروفیسر محمد عثمان فنون کے شمارہ نمبر ۱۴ میں "معاصر" پر تبصرہ کرتے ہوئے سلیم احمد کے ان مضامین کو غلط نگاہی، مفروضہ پسندی اور شخصیت پرستی کا شاہکار قرار دیتے ہیں اور روایت کے سلسلے میں ان کے موقف کو مضحکہ خیز بتاتے ہیں۔ اور اسی کے ساتھ ساتھ وہ اسی تبصرہ میں "عسکریت" کے بارے محمد علی صدیقی کی رائے سے بھی اتفاق کرتے ہیں۔ عسکری صاحب کے تصورِ روایت پر محمد علی صدیقی کے خیالات کا جائزہ حال ہی میں ہم اپنے مضمون "جدیدیت ــ اور جدیدیت کی ابلیسیت"[1] میں تفصیل سے لے کر دکھا چکے ہیں کہ ان کا رویہ روایت کی طرف کتنا متعصبانہ، غیر دیانتدارانہ، غیر متوازن، غیر علمی اور سطحی ہے۔ اور کس طرح وہ اپنی روایت دشمنی کے سبب روایت اور روایتی تصورات میں تحریف کے مرتکب ہوئے ہیں۔ روایتی نقطۂ نظر کے خلاف ان کے اعتراضات کا اندرونی تضاد اور کھوکھلا پن نمایاں کرنے کے علاوہ ہم نے اس روایت دشمن ذہنیت کے چہرے سے بھی نقاب اٹھا کر دکھایا ہے جو روایتی اور دینی تصورات کو مسخ کرنے کے لئے جدیدیت کے مخصوص طریقِ ابلیسی کے ساتھ اپنی اصلیت کو چھپانے کی کوشش کرتی ہے۔ خیر جہاں تک محمد علی صدیقی کا تعلق ہے تو چونکہ وہ نظریاتی اعتبار سے ترقی پسند ہیں اس لئے ان کا روایتی نقطۂ نظر کے خلاف ہونا ان کے

---

[1] سالنامہ فنون جلد دوم سنہ ۱۹۸۱-۸۰ء (شمارہ ۱۶)

نظریاتی مسلک کے تقاضوں کے عین مطابق ہے۔ لیکن ان کی روایت دشمنی سے پروفیسر محمد عثمان کا اتفاق ہمارے لئے باعث حیرت ہے۔ اس لئے کہ پروفیسر موصوف کے نظریاتی اور دینی مسلک کا ترقی پسندی یا مذہب دشمنی سے کوئی تعلق نہیں۔ ان کے بارے میں سب جانتے ہیں کہ وہ مسلمان ہیں اور مارکس اور لینن کی بجائے سر سید، علامہ اقبال اور قائد اعظم کے ماننے والے ہیں۔ یہ الگ بات ہے کہ ان کا اسلام ایک جدید اسلام ہے۔ روایتی اسلام نہیں۔ اور جہاں تک جدید اسلام کا تعلق ہے تو ہم اس کی ہر شکل کو قادیانیت، چکڑالویت اور پرویزیت کی طرح ایک پُر فریب اور گمراہ کن صورت سمجھتے ہیں۔ بہر حال وہ روایت اور جدیدیت کے مسئلہ پر سلیم احمد اور عسکری کے نقطۂ نظر کو رد کرتے ہوئے ایک اصولی بات یہ کہتے ہیں کہ قدیم و جدید اور مشرق و مغرب کو خانوں میں بانٹنے کی بجائے ہر چیز کو کھلی آنکھ سے بغیر کسی تعصب اور جانبداری کے دیکھنا چاہئے۔ جہاں حق ہو اس کا اعتراف کرنا چاہئے اور جہاں باطل ہو اس سے نبرد آزما ہونا چاہئے۔ ہم سمجھتے ہیں کہ پروفیسر محمد عثمان کا یہ اصول بالکل صحیح ہے اور ہم اس سے پورا پورا اتفاق کرتے ہیں۔ لیکن ہمیں دیکھ کر حیرت ہوتی ہے کہ خود اپنے ہی قول کے مطابق کسی تعصب اور جانبداری کے بغیر کھلی آنکھ سے دیکھنے پر انہیں اگر کہیں جلوۂ حق نظر آتا ہے تو محمد علی صدیقی کی روایت دشمنی اور ترقی پسندی میں نظر آتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ روایت کے مسئلہ پر رینے گینوں اور ان کے نقطۂ نظر کے خلاف محمد علی صدیقی کے متعصبانہ اور غیر دیانتدارانہ ردعمل پر خوشی کا اظہار کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ:

> "مجھے یہ جان کر خوشی ہوئی کہ 'عسکریت' کے بارے میں اس
> ممتاز نقاد کا ردعمل مجھ سے مختلف نہیں"

جدیدیت اپنے گمراہ کن تصورات کا پیوند اسلام میں لگاتی ہے تو حق و باطل آپس میں کس طرح معانقہ کرتے ہیں۔ یہ اس کی دلچسپ مثال ہے۔

پروفیسر محمد عثمان اپنے تبصرہ میں عسکری صاحب کے بارے میں لکھتے ہیں کہ وہ تصوف کی بھول بھلیوں اور لذت کوشیوں میں کھو کر چند ایسے فرانسیسی نو مسلموں اور صوفیوں کی ارادت میں جا پھنسے جنہوں نے عمر بھر مغرب میں رہ کر تو دیکھا بھالا تھا اور۔ پھر بغاوتاً اسلام بھی قبول کر لیا تھا مگر وہ پاکستان جیسے ترقی پذیر اسلامی ملک کے مسائل و مشکلات اور تاریخی پس منظر

سے قطعاً بے خبر اور لاعلم تھے۔ اب جہاں تک صوفیوں کا تعلق ہے تو عسکری صاحب کا ان سے ارادت رکھنا
پروفیسر محمد عثمان کو اس لئے گوارا نہیں کہ وہ تصوف کو نہیں مانتے۔ لیکن فرانسیسی نومسلموں پر انہیں کیا
اعتراض ہے۔ یہ بات واضح نہیں۔ یعنی یہ پتہ نہیں چلتا کہ انہیں ان کے فرانسیسی ہونے پر اعتراض ہے یا نومسلم
ہونے پر یا دونوں ہی باتوں پر۔ اگر وہ نومسلموں کے اسلام کو اسلام نہیں مانتے تو سوال یہ ہے کہ اقبال
کی خاک برہمن زاد کے بارے میں ان کا کیا خیال ہے۔ اور اگر وہ نومسلموں کے اسلام پر ان کے نومسلم
ہونے کی بنا پر نہیں بلکہ ان کے فرانسیسی ہونے کی بنا پر معترض ہیں تو فرانس سے ان کا تعصب اسلام کی
رُو سے کہاں تک جائز ہے۔ کیا ان کے نزدیک اسلام کے دروازے فرانس یا مغرب کے ممالک پر
بند ہیں۔ اگر اسلام، فرانس یا کسی بھی ملک کو تعصب کی نظر سے دیکھنے کی اجازت نہیں دیتا تو سوال
یہ ہے کہ وہ خود اپنے ہی قول کے مطابق فرانس کے بارے میں حق کو کسی تعصب اور جانبداری کے بغیر
کھلی آنکھ سے دیکھنے کے اصول پر کہاں تک کاربند ہیں۔ لیکن اگر یہ دونوں باتیں نہیں تو پھر تیسری
اور آخری بات باقی رہ جاتی ہے کہ یہ فرانسیسی نومسلم جنہوں نے عمر بھر مغرب کو اچھی طرح دیکھ بھال کر
بالآخر اسلام قبول کر لیا، پروفیسر محمد عثمان ان کے قبولِ اسلام کو درخورِ اعتنا نہیں سمجھتے۔ محض
اس لئے کہ وہ پاکستان جیسے ترقی پذیر اسلامی ملک کے مسائل و مشکلات اور تاریخی پس منظر سے قطعاً
بے خبر اور لاعلم تھے۔ گویا ان کے نزدیک قبولِ اسلام کے لئے محض توحید و رسالت کا اقرار ہی کافی
نہیں بلکہ اس کے ساتھ پاکستان کے مسائل و مشکلات اور تاریخی پس منظر سے واقفیت کی شرط بھی
لازمی ہے۔ بات قاعدے کی ہے کیونکہ پروفیسر محمد عثمان روایتی اسلام کو نہیں مانتے تو ان کے جدید
اسلام کی شرائط بھی جدید ہی ہونی چاہئیں۔ غالباً اسلام کے اسی جدید ایڈیشن کی رو سے
وہ سلیم احمد کے روایتی نقطۂ نظر کو غلط نگاہی، مفروضہ پسندی اور شخصیت پرستی کا شاہکار قرار
دیتے ہیں اور ان کے خلاف عسکری اور گینوں کی سند پر ایک مضحکہ خیز موقف اختیار کرنے کا فتویٰ
صادر کرتے ہیں۔ اب سلیم احمد چونکہ روایتی اسلام کے ماننے والے ہیں جو توحید، رسالت، آخرت،
قرآن، حدیث، فقہ، کلام اور تصوف، سب پر محیط ہے۔ اس لئے ان کے روایتی نقطۂ نظر کے بارے
میں پروفیسر عثمان کی رائے اس سے مختلف نہ ہو تو کوئی تعجب کی بات نہیں۔ البتہ ہمیں یہ دیکھ کر ضرور
تعجب ہوا کہ وہ سلیم احمد پر تو شخصیت پرستی کا الزام لگاتے ہیں لیکن خود اپنی شخصیت پرستی کو

یہ کہہ کر چھپانے کی کوشش کرتے ہیں کہ میں سرسید وغیرہم کو اپنا گرو مانتا ہوں اور جو لوگ تحقیق و دانشوری کے نام پر یا دین و مذہب کے حوالے سے ان حضرات کے تاریخی کارناموں کے بارے میں غلط فہمی کا شکار ہوتے ہیں یا غلط فہمیاں پھیلاتے ہیں ان سے کسی رو رعایت کا قائل نہیں۔ اس بات کا سیدھا سادا مطلب یہ ہے کہ وہ سرسید وغیرہم کے بارے میں کسی بھی قسم کی تنقید کی اجازت دینے یا اسے برداشت کرنے کے لئے تیار نہیں۔ نہ تاریخ و تحقیق کے حوالے سے، نہ دین و مذہب کے حوالے سے۔ اس لئے کہ وہ ان کے خیالات کے حق و باطل سے قطع نظر ان کی شخصیت ہی کو بجائے خود حق و باطل کا معیار سمجھتے ہیں۔ یہ شخصیت پرستی نہیں تو اور کیا ہے۔

رہی حق و باطل کو علاقوں خطوں اور تہذیبوں میں بند کرنے اور قدیم و جدید اور مشرق و مغرب کے خانوں میں بانٹنے کی بات، تو ہمارے نزدیک یہ بھی پروفیسر عثمان کا محض وہم باطل ہے کیونکہ اگر مشرق کو مشرق اور مغرب کو مغرب یا قدیم کو قدیم اور جدید کو جدید کہنا انہیں خانوں میں بانٹنے کے مترادف ہے تو ع این گناہیست کہ در شہر شما نیز کنند۔ خود پروفیسر عثمان بھی دورِ حاضر کی تہذیب کو مغربی تہذیب اور جدید تہذیب ہی کہتے ہیں اور علامہ اقبال بھی جدید مغربی تہذیب کو نئی تہذیب، تہذیب نوی، مغربی تہذیب، فرنگی تہذیب اور تہذیبِ حاضر وغیرہ کے نام سے پکارتے ہیں۔ اور اس تہذیب پر تنقید کرتے ہوئے اس کے بارے میں یہاں تک کہتے ہیں کہ ؎

یہی وحدت سے ہے اندیشۂ غرب ۔۔۔ کہ تہذیبِ فرنگی بے حرم ہے

لیکن پروفیسر محمد عثمان کا کہنا یہ ہے کہ اقبال نے مغربی تہذیب کی بہت سی باتوں کی برائی کرنے کے ساتھ ساتھ اس کے صحتمند پہلوؤں کا اعتراف بھی کیا ہے۔ بقول ان کے انہوں نے یہاں تک کہا ہے کہ جدید تہذیب کے بعض بنیادی عناصر اسلام سے ماخوذ ہیں، لہٰذا وہ ہمارے اپنے ہیں ۔۔۔۔ لیکن واقعہ یہ ہے کہ علامہ اقبال کا رویہ جدید مغربی تہذیب کے بارے میں اتنا صاف اور سیدھا سادا ہرگز نہیں جیسا کہ پروفیسر محمد عثمان کے بیان سے ظاہر ہوتا ہے۔ کیونکہ وہ دورِ حاضر کی مغربی تہذیب کو "فسادِ قلب و نظر" سے تعبیر کرتے ہیں، اس کے خلاف کھلم کھلا جنگ کرتے ہیں، اس تہذیب کے گندے انڈوں کو اٹھا کر باہر پھینک دینے کا مشورہ دیتے ہیں، اس کی موت کی پیشین گوئی کرتے ہیں، حتیٰ کہ اسے صریحاً خلافِ اسلام قرار دیتے ہوئے کہتے ہیں کہ ؎

لبالب شیشۂ تہذیبِ حاضر ہے مئے لا سے ۔۔۔ مگر ساقی کے ہاتھوں میں نہیں پیمانۂ الّا

یہ محض مغربی تہذیب کی بعض باتوں یا بہت سی باتوں کی برائی نہیں بلکہ واضح طور پر پوری تہذیب کی نفی ہے۔ پھر سلیم احمد اور عسکری اس تہذیب کے بارے میں اس کے سوا اور کیا کہتے ہیں کہ پروفیسر عثمان ان کے موقف کو تو مضحکہ خیز قرار دیتے ہیں اور علامہ اقبال کو اپنا گرو ماننے کے باوجود مغربی تہذیب کے بارے میں ان کے اِن صاف اور صریح ارشادات کو نہیں مانتے۔ رہی یہ بات کہ ہمیں جدید مغربی تہذیب کو اس لئے قبول کر لینا چاہئے کہ اس کے بعض بنیادی عناصر اسلام سے ماخوذ ہیں اور ان معنوں میں یہ تہذیب دراصل اسلام ہی کے بعض پہلوؤں کی ترقی یافتہ صورت ہے تو ہمیں اس پر بھی کوئی اعتراض نہیں لیکن بقول سلیم احمد سوال یہ ہے کہ پھر اسلامی تہذیب کی اس ترقی یافتہ صورت یعنی مغربی تہذیب ہی کو کلیتہً قبول کر لینے کے بعد اس کی ایک غیر ترقی یافتہ شکل یعنی اسلامی تہذیب کو باقی رکھنے کی کیا ضرورت ہے۔ پتا نہیں پروفیسر محمد عثمان کے پاس اس سوال کا کیا جواب ہے

بہرحال جہاں تک سلیم احمد، عسکری یا گینوں کا تعلق ہے تو جدید مغربی تہذیب پر ان کی تنقید اس کے مغربی ہونے یا جدید ہونے کی بنا پر نہیں بلکہ اس تہذیب کی اس لادینی روح پر ہے جس نے اس کے شیشہ کو مئے لا سے لبالب اس طرح پُر کر دیا ہے کہ اس میں اِلّا کی کوئی گنجائش ہی باقی نہیں چھوڑی۔ یہ لوگ انہی معنوں میں اسے ایک باطل تہذیب کہتے ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ پروفیسر محمد عثمان نے عسکری اور گینوں وغیرہ کو پڑھے بغیر ہی ان کے حق و باطل کو علاقوں اور خطوں میں بند کرنے کا فتویٰ صادر کر دیا۔ ورنہ انہیں کم سے کم یہ تو معلوم ہوتا کہ یہ لوگ نہ تو مشرق سے مشرق ہونے کی بنا پر کوئی خاص محبت رکھتے ہیں، اور نہ مغرب سے مغرب ہونے کی بنا پر انہیں کوئی خاص عداوت ہے۔ اسی طرح ان کا تعلق جدید یا قدیم سے بھی کوئی ایسا نہیں کہ یہ ایک کے موافق اور دوسرے کے مخالف ہوں۔ مغربی تہذیب پر سلیم احمد اور عسکری کو یہ اعتراض نہیں کہ چونکہ یہ تہذیب مغرب سے تعلق رکھتی ہے اور ہم مشرق سے تعلق رکھتے ہیں لہٰذا ہم مغربی تہذیب کو رد کرتے ہیں۔ ان کا اعتراض دراصل اس تہذیب کی لادینی اور روایت دشمن ذہنیت پر ہے نہ کہ اس کے مغربی یا جدید ہونے پر۔ چنانچہ ان کے نزدیک روایتی اور غیر روایتی تہذیبوں کے درمیان فرق و امتیاز کی حقیقی بنیاد کسی جغرافیائی حد بندی یا خطّے پر نہیں بلکہ دو مختلف اور متضاد ذہنیتوں پر ہے۔ یہی وجہ ہے کہ یہ لوگ مشرق و مغرب کے علاقوں کی جغرافیائی حد بندی کو حق و باطل کا معیار نہیں بناتے بلکہ حق و باطل کے معیار پر ہر چیز کو کھلی آنکھ سے پرکھ کر دیکھتے ہیں۔ اور اسی بنیاد پر قرون وسطیٰ کے مغرب کو حق پر

قائم کہتے ہیں کیونکہ مغرب کی دوسری روایتی تہذیبوں کی طرح قرون وسطی کی مغربی تہذیب بھی التوحید واحدٌ کے مابعد الطبعیاتی تصور حقیقت پر قائم تھی۔ اس کے برعکس آج مشرق میں جدید تہذیب کے لئے کا خمار جتنا بڑھتا جاتا ہے اتنا ہی باطل اس میں در آتا ہے۔ حاصل کلام یہ کہ عسکری اور گینوں وغیرہ کے نزدیک جدید مغربی تہذیب اپنی روح کے اعتبار سے ایک باطل تہذیب ہے اس لئے کہ اس کی لادینی ذہنیت روایت کے مابعد الطبعیاتی تصور حقیقت کی دشمن ہے، اور مشرق ہو یا مغرب دنیا میں جہاں کہیں اس تہذیب کا اثر و نفوذ بڑھتا اور پھیلتا جاتا ہے وہاں جدیدیت کے نام پر یہی باطل اور لادینی ذہنیت عام ہوتی جاتی ہے۔

لیکن پروفیسر محمد عثمان یہ جانے بغیر کہ عسکری اور گینوں وغیرہ کے نزدیک روایت کا حقیقی مفہوم کیا ہے' ان کے موقف کو مضحکہ خیز قرار دیتے ہوئے کہتے ہیں کہ پاکستان میں اسلام کا مستقبل اور عالمی برادری میں خود پاکستان کا مستقبل محی الدین ابن عربی اور رینے گینوں کی مابعد الطبعیات سے نہیں ڈاکٹر عبد السلام کی طبعیات سے وابستہ ہے۔ اب چونکہ ڈاکٹر عبد السلام کی طبعیات آئن اسٹائن کی طبعیات اور محی الدین ابن عربی، گینوں اور ہر مسلمان کی مابعد الطبعیات، قرآن کی مابعد الطبعیات ہے، اس لئے پروفیسر محمد عثمان دراصل کہنا یہ چاہتے ہیں کہ پاکستان میں اسلام کا مستقبل قرآن کی مابعد الطبعیات سے نہیں بلکہ آئن اسٹائن کی طبعیات سے وابستہ ہے۔ لیکن چونکہ دل میں ایک چور ہے اس لئے یہ بات کھل کر کہنے کی بجائے وہ قرآن کی جگہ ابن عربی اور گینوں کا اور آئن اسٹائن کی بجائے ڈاکٹر عبد السلام کا نام لیتے ہیں۔ اس لئے کہ وہ روایتی اور مابعد الطبعیاتی اسلام کو نہیں بلکہ جدید طبعیاتی اسلام کو مانتے ہیں اور عسکری صاحب کی ساری تنقید ان کے اسی جدید طبعیاتی اسلام کے خلاف ہے جو پاکستان کے مستقبل کو قرآن کی مابعد الطبعیات کی بجائے آئن اسٹائن کی طبعیات سے وابستہ دیکھنا چاہتا ہے۔ لیکن ہمارے نزدیک اگر پاکستان میں اسلام کا مستقبل قرآن اور اس کی مابعد الطبعیات ہی سے وابستہ نہ رہا تو پھر عالمی برادری میں پاکستان کا مستقبل آئن اسٹائن کی طبعیات سے وابستہ ہوا تو کیا اور نہ ہوا تو کیا، ہمیں اس سے کوئی بحث نہیں۔

شان الحق حقّی

کہہ مُکرنیاں

"کہہ مُکرنی" ایک ایسی اچھوتی صنف ہے جو اُردو کے ساتھ مخصوص ہے اور حضرت امیر خسرو کے بعد بہت کم برتی گئی ہے۔ کہہ مکرنی میں عورتوں کی زبان سے ذو معنی بات بیان کی جاتی ہے جس میں ایک سے 'محبوب' مراد ہوتا ہے اور دوسرے معنی کچھ اور۔ تین مصرعوں کو سن کر ذہن ساجن یا محبوب کی طرف جاتا ہے لیکن جب چوتھا مصرع آتا ہے تو بات کا رُخ یکایک بدل جاتا ہے اور محسوس ہوتا ہے کہ کہنے والی بات کہہ کر مُکر گئی ہے۔ اس صنف کو کہہ مُکرنیاں کے علاوہ مُکرنیاں بھی کہتے ہیں۔ مغل شہزادیاں اور بیگماتِ قلعۂ معلیٰ انہیں "سکھیاں" کے نام سے بھی موسوم کرتی تھیں۔ شان الحق حقی صاحب نے صدیوں بعد اس صنفِ سخن کو برتا ہے اور اس خوبی سے برتا ہے کہ آج بھی، جب رنگِ زمانہ بدل گیا ہے، ہم ان سے پوری طرح لطف اندوز ہو سکتے ہیں۔ (ادارہ)

۱

ہاتھ سے جب چھیڑا تھرّائی — پیر سے جب دابا غُرّائی
ناپے سڑکیں اور بازار — کیا سکھی ناری؟ نا سکھی کار

۲

چال ٹھمکتی، پاؤں میں چکّر — چڑھ جاؤ تو لے لے اندر
کتنوں ہی سے رکھے میل — کیا سکھی یاتر؟ نا سکھی ریل

۳

آپ ہی آپ لپٹتا جائے — پچھلی باتیں رٹتا جائے
جو بولوں سو لوٹ دے نٹ کھٹ — اے سکھی ساجن؟ نا سکھی کیسٹ

۴

پہروں بیٹھا سبھا سجائے — سانگ بھرے اور کتھا سنائے
تاکنے آئے پڑوس کی بیوی — اے سکھی ساجن، نا سکھی ٹی وی

۵

جب وہ ملاوے نین سے نین — تب سُدھ پاؤں، آوے چین
ناک کان سب اسکے بندھک — اے سکھی ساجن؟ نا سکھی عینک

۶

دونوں ہاتھ سے سر کو گھیرے — نینوں سے وہ نین ملاوے
کان چھوئے اور چومے مستک — اے سکھی ساجن ؟ نا سکھی عینک

۷

رہوے ہر دم ہاتھ پسارے — اوٹ میں بھی وہ ساتھ پدھارے
پانی پیوے بھر بھر لوٹا — اے سکھی ساجن، نا سکھی لوٹا

۸

ٹٹو دوڑاتا جب آئے — مجھ کو ساتھ بھگا لے جائے
جھٹکے دے، پر بندھن پکّا — اے سکھی ساجن نا سکھی یکّہ

۹

اُنگلی پکڑے پہنچا جکڑے — پہنچا چھوڑ گلے تک لپٹے
کھینچے کان جو نکلوں سج کر — اے سکھی ساجن نا سکھی زیور

۱۰

اُس کے سنگ چلوں میں تن کر — چھب دکھلاؤں سہاگن بن کر
ہاتھ دھرا نت سلجے سر پر — اے سکھی ساجن! نا سکھی جھومر

۱۱

پہروں ڈال رہے گل بیّاں — جیسے وہ ہی مورا سیّاں
جب دیکھو چھاتی پہ سوار — اے سکھی ساجن نا سکھی ہار

۱۲

آتا دیکھ کے تھامے ڈنڈے
ساتھ لیے دو دو مسٹنڈے
پردا چھوڑ میں اوٹ میں ہو لی
اے سکھی ساجن؟ نا سکھی ڈولی

۱۳

چوڑا چکلا سرخ سفید
چھاتی میں ہے جس کا بھید[1]
پانہ سکوں تو ہڑبڑے جان
اے سکھی ساجن؟ نا سکھی پان

۱۴

بانکی[4] چھب پر جی للچائے
منہ کھولے تو رس ٹپکائے
شیام کے سنگ لوں اُس کا نام
اے سکھی ساجن! نا سکھی آم

۱۵

آپ ہی میں نے سر پہ چڑھایا
کانپ[5] رہی تھی جب لپٹایا
دور سے آیا میرے دیس
اے سکھی ساجن؟ نا سکھی کھیس

۱۶

پھر دل مجھ کو گود بٹھائے
چھوڑ[6] چلاؤں تو بل بھر لائے
سب وہ بھلا دے چکی چولہا
اے سکھی ساجن؟ نا سکھی جھولا

۱۷

ہر دم آگا پیچھا گھیرے
گلے گلے ہوں بس میں اُس کے
گھٹنوں گھٹنوں آتے سرتا[8]
اے سکھی ساجن؟ نا سکھی کرتا

۱۸

نیچے سے اوپر لے جائے
گھٹنے موڑے پیر اُٹھوائے
سانس چڑھے اور پھولے سینہ
اے سکھی ساجن! نا سکھی زینہ

---

[1] دل کی شکل سے ملتا جلتا [2،3] "پانہ سکوں" میں پان اور شیام میں آم پوشیدہ ہے۔ [4] آم کی شکل میں ایک بانکی وضع نکلتی ہے [5] سردی کے سبب جسم میں کپکپی تھی [6] خالی جھولے میں بل پڑ جاتے ہیں۔ [7] محاورۃً خفا ہونا۔ [8] سرتا۔ چالاک۔ گھٹنوں گھٹنوں آئے: چپکے چپکے گھٹنوں پر چل کے آئے، نیز گھٹنوں تک لمبان پہنچے۔

پرتو روہیلہ

دوہے

(برہا)

جب تک تیل جلے میں گاؤں ساجن تیرے گیت
میں مٹی کا باسن میری جوت سے کیسی پریت

۲

بوند سماں میں ٹپکوں یا چنگاری سماں اُڑ جاؤں
من چاہے ہے ساجن تیرے انگ سے انگ مِلاؤں

۳

تیرے کارن یوں ہی اکارت اُٹھ اُٹھ رات کو روئے
من کا دیپک بُل نہ پایا نیناں دیپ بھی کھوئے

۴

کس پیارے کو چیخ بلاؤں کِت جاؤں میں بھاگ
میری بیت کو رہ رہ لپٹے برہ کا کالا ناگ

۵

میرے کان میں ایسی ساجن تیری آہٹ آئے
سپنوں کی ڈوری بھی مورکھ ہاتھوں سے چھٹ جائے

۶

ایک گھڑی کو کھولوں ساجن دُوجی موندوں نین
رشتہ تکتے یونہی کاٹوں سگری جیون رین

۷

میرا سندیسہ دیدے کوئی دور کے ساجن جائے
من کا پپیہا بولت بولت چُپ نا ہو جائے

۸

برہ کی ڈاچی بھاگی جائے تم کو لئے مہراج
میں دکھیاری کس کو پکاروں میری پڑی آواج

۹

سوچ رہی ہیں کب سے یہ بدھ دکھیا کی آشائیں
میت ملے تو پیار کے آنگن سکھ کے منگل گائیں

۱۰

دور پرے کا دیپک بن کر چمکے اُس کا پیار
بیچ میں میرے تن کی ندیا کیسے لانگھوں پار

۱۱

ڈیوڑھی اندر بیٹھا ساجن دروا جا کھڑکاتے
سواگت کرنے جب میں جاؤں جانے کہاں چھپ جاتے

۱۲

برہا میں سنجوگ ہو جس سے برہا اندر پریت
سکھیو کیسا ساجن ہوگا کیسا ہوگا میت

۱۳

کس کارن ترسائے ساجن کس کارن للچائے
تیرے پاؤں کی آہٹ ہر پل میرے کان میں آئے

۱۴

مجھ سی ابھاگن سکھیو کس کو اور کہیں مل پائے
دور پرے سے آیا پیتم ڈیوڑھی سے مڑ جائے

۱۵

ساجن تیرے چرنوں کو جو اپنے ماتھے سجاتے
مجھ سے اچھی وہ پگڈنڈی جو تیرے گھر کو جاتے

ڈاکٹر وزیر آغا

سائیسی علم دریاؤ

لحاف کا موسم ہے۔ باہر ٹھنڈی یخ ہوائیں بلانے ہر شئے میں اپنے پنجے گاڑ دیئے ہیں شجر، حجر، پرندے، حتیٰ کہ کیڑے مکوڑے تک برف کی چھوٹی بڑی قاشوں میں تبدیل ہو گئے ہیں۔ کمرے کے اندر کی اشیا برف تو نہیں ہوئیں مگر سردی کے ہاتھوں تھر تھر کانپ رہی ہیں۔ میں اپنے لحاف میں قلعہ بند، اندر سے تمام دروازے اور کھڑکیاں مقفل کئے ایک گہری میٹھی نیند سو رہا ہوں۔ یوں لگتا ہے جیسے زمہریر کے ٹھنڈے مُردہ بدن میں فقط میں ہی ایک زندہ دھڑکن ہوں۔ اچانک میرے اندر سے کوئی شے مجھے جاگنے کے لئے کہتی ہے۔ جب میں نہیں جاگتا تو وہ مجھے ہلکے ہلکے کچوکے لگاتی ہے۔ جب میں پھر بھی بیدار نہیں ہوتا تو اپنے وحشی پنجوں سے مجھے اس بری طرح جھنجوڑتی ہے کہ میں ہڑبڑا کر اُٹھ بیٹھتا ہوں۔ تب "وہ" مجھے اپنی بے آواز صدا میں حکم دیتی ہے کہ اسے غسل خانے تک لے جاؤں اور میں اپنے گرم و گداز بستر سے چھلانگ لگا کر سیدھا غسل خانے کی طرف لپکتا ہوں۔ چند لمحوں کے بعد وہ مجھے واپس بستر کی طرف بھاگنے کا حکم دیتی ہے کیونکہ غسل خانے کی سرد فضا نے اُسے کپکپی کے سپرد کر دیا ہے۔ جب میں دوبارہ لحاف میں قلعہ بند ہو جاتا ہوں تو وہ پلک جھپکنے میں نیند کی وادیوں میں اتر جاتی ہے۔ اب میں دیکھتا ہوں کہ وہ تیز تیز سانس لے رہی ہے اور کبھی خراٹے بھی لینے لگتی ہے۔ مگر میں جاگ رہا ہوں اور شاید اب باقی رات آنکھوں ہی میں کاٹ دوں گا۔ اچانک مجھے اس سے خوف محسوس ہونے لگتا ہے۔ میں خود سے پوچھتا ہوں کہ یہ میں کس "چیز" کے ساتھ رہ رہا ہوں؟ پیدائش سے لے کر اب تک اس نے مجھے ایک لمحے کے لئے بھی خود سے الگ ہونے کی اجازت نہیں دی۔ کہنے کو تو یہ میرا بدن کہلاتی ہے مگر کیا یہ واقعی میری ہے؟ میرا اس کے ساتھ کیا رشتہ ہے؟ شاید یہ رشتہ اس کے سوا اور کچھ نہیں کہ میں آنکھیں میچے اس کے ہر حکم کو بجا لاتا چلا جاؤں۔

میں اس "عجوبۂ روزگار" کو غور سے دیکھتا ہوں ــــ گول مٹول ہڈیوں اور گوشت کا بنا ہوا ایک گیند اس کا سر پُر غرور دکھلاتا ہے ۔ اس گیند پر چاروں طرف بال ہی بال ہیں ۔ فقط آنکھوں کے اوپر ایک چھوٹی سی پیشانی اور آنکھوں کے نیچے دو ابھرے ہوتے رخسار بالوں کی یلغار سے محفوظ ہیں ورنہ ہر طرف جنگل ہی جنگل ہے پھر میں دیکھتا ہوں کہ اس گیند کو چار شاخوں والے ایک دھڑ پر گویا بٹھا دیا گیا ہے۔ ہر شاخ کے سرے پر پانچ پانچ مخروطی ہڈیاں ہیں جن کے کناروں پر لمبے لمبے تیز اور نوکدار کانٹے لگے ہوئے ہیں۔ "وہ" جب ان شاخوں میں سے ایک سونڈ نما شاخ کے ذریعے کھانے کی اشیا اٹھا کر گیند کے سب سے بڑے سوراخ کے حوالے کرتا ہے تو تیز اور لانبے دانت ان پر جھپٹتے ہیں اور لمحہ بھر میں انہیں کوٹ پیس کر دھڑ کے اندر اتار دیتے ہیں اور تمام عرصہ یہ عجوبۂ روزگار کھا جانے والی نظروں سے چاروں طرف گھورتا رہتا ہے۔ کیا یہ ڈرا ہوا ہے یا ڈرا رہا ہے؟ آج تک مجھے اس سوال کا جواب نہیں مل سکا۔ جب میں صبح اٹھتے ہی آئینے میں جھانکتا ہوں تو اس عفریت کی آنکھیں مجھے انتہائی نفرت یا شاید خوف سے دیکھتی ہیں جیسے میری "آگاہی" کو بالکل ناپسند کر رہی ہوں۔

لیکن میرے اور اس کے درمیان خوف کا یہ رشتہ ابتدا میں بالکل نہیں تھا۔ یہ میں اپنے بچپن کی بات کر رہا ہوں۔ اُس وقت میں تو جیسے تھا ہی نہیں۔ صرف وہ ہی تھا۔ اور میں؟ ....میں تو زیادہ سے زیادہ اس کا محض ایک عضو تھا۔ اس سمے وہ پوری طرح بیدار، پوری طرح چاق و چوبند تھا، وہ سرتاپا جبلت تھا۔ اندھا، بہرہ، گونگا لیکن ایک مجسم اضطراب ایک مجسم کرب! شوپنہار کی خواہش (۱۷۷) کی طرح اس کا کوئی فلسفیانہ رُخ ابھی سامنے نہیں آیا تھا اور نہ یہ بدھیا رتھ کی خواہش کی طرح دکھ کی علامت ہی بنا تھا۔ اس وقت تو یہ از سرتاپا ایک جسم تھا جس کی ساری حسیات پوری طرح بیدار تھیں۔ اس وقت میرا یہ ساتھی، ہمزاد، میرا یہ بدن، ایک تپتی، ہونکتی، کھولتی ہوئی "خواہش" کے سوا کچھ نہیں تھا۔ وہ ایک صبا رفتار، تندخو گھوڑا تھا جو زین کے لمس تک سے آشنا نہیں تھا اور نہ جس کی زبان نے کبھی کسی کانٹے دار چمڑے کی جیب ہی کو چکھا تھا۔ خدا کا شکر ہے کہ "میں" اس وقت سویا پڑا تھا ورنہ اُسے اس کی ننگی حالت میں دیکھ کر میں شاید خوف سے بے حال ہو جاتا۔

پھر نہ جانے کب اور کیسے لیکن اچانک ایک روز میں نے محسوس کیا کہ کسی نادیدہ ہاتھ نے مجھے اس کی پیٹھ پر سوار کر دیا ہے۔ آپ نے دیکھا ہوگا کہ جب کسی اَن گھڑ جنگلی گھوڑے کی پشت پر زین کس دی جاتی ہے اور اسے

ایک سوار بٹھا دیا جاتا ہے اور پھر یکایک "ارگرا" ہٹا کر گھوڑے کو آزاد کر دیتے ہیں تو کس طرح یہ گھوڑا اپنی پشت پر ایک نامانوس سے بارِ گراں کو محسوس کر کے کودتا، دولتیاں مارتا، ہنہناتا اور بے تحاشہ بھاگتا ہے۔ اتنی تندی اور وحشت کے ساتھ کہ بالآخر سوار زمین پر آ رہتا ہے۔ بالکل اسی طرح اپنی پیٹھ پر ایسے نامانوس بوجھ کو محسوس کر کے لڑکپن کے اس وحشی گھوڑے نے جو تماشا دکھایا وہ مجھے آج تک یاد ہے۔ یہ نہیں کہ خونخوار گھوڑا کودتا اور ہنہناتا رہا اور میں زین کے قلعے میں محفوظ بیٹھا رہا۔ میں تو کئی بار اوندھے منہ زمین پر گرا۔ مگر میں بھی بہت ضدی تھا۔ ہر بار گرنے کے بعد لپک کر دوبارہ گھوڑے پر سوار ہو جاتا تھا۔

لڑکپن کے بعد جوانی آئی تو اسپ تیز گام نے مزید پر پرزے نکال لئے مگر اب سوار بھی زیادہ تجربہ کار ہو چکا تھا۔ شدہ شدہ گھوڑے نے زین اور سوار دونوں کو برداشت کر لیا۔ پھر وقت کو جیسے پر سے لگ گئے اور زمانہ کسی افعی کی طرح کروٹوں پر کروٹیں لیتا چلا گیا تا آنکہ آہستہ آہستہ سوار کے قوائے نفسانی مضمحل ہونے لگے اور زین بھی پرانی ہو گئی۔ تب اس خونخوار گھوڑے نے بھی اپنا چولا بدلا۔ اس کی تو گویا کایا پلٹ ہو گئی۔ پہلے وہ تندخو ضرور تھا لیکن کم از کم اس کا مزاج اور رویہ تو متعین تھا اور یہ اندازہ لگانا کچھ ایسا مشکل نہیں تھا کہ ایک خاص صورتِ حال میں وہ کس قسم کے ردِعمل کا مظاہرہ کرے گا۔ مگر اب صورتِ حال بالکل تبدیل ہو گئی۔ اب یہ گھوڑا نہیں تھا بلکہ گھوڑے کی بدروح تھا۔ ایک آسیب جو زیادہ تر گھر کی بالائی منزل میں رہتا اور اس منزل کی دونوں کھڑکیوں میں سے اکثر و بیشتر اپنی سرخ انگارہ آنکھوں سے مجھے گھورتا اور پھر لفظوں سے ناآشنا ایک بے نام اور بے آواز زبان میں احکامات نشر کرنے لگتا۔

اور اب میں ہمہ وقت اس آسیب کے ساتھ رہتا ہوں۔ اٹھتے بیٹھتے چلتے پھرتے سوتے جاگتے وہ پیر تسمہ پا کی طرح مجھ پر سوار ہے۔ پہلے میں اس کا راکب تھا اب وہ میرا راکب ہے شاید راکب میں ہی ہوں لیکن باگ اب میرے بجائے اس کے ہاتھ میں ہے اور میری حیثیت ایک "اعزازی سوار" کے سوا کچھ نہیں رہی۔ لیکن کیا واقعی؟ ..... کیوں کہ آج رات جب اس نے مجھے جگایا کہ اسے غسل خانے تک لے جاؤں تو اچانک مجھ پر یہ انکشاف ہوا کہ یہ "ذات شریف" تو میرا محتاج ہے اور میرے بغیر ایک قدم اٹھانے پر بھی قادر نہیں۔ تب میں نے بڑے فخر کے ساتھ، ایک پر اعتماد لہجے میں قدرے تنک کر اس سے پوچھا۔

"بولو! کیا میرے بغیر تم رہ سکتے ہو؟؟"

میری بات سُن کر وہ بے اختیار ہنہنایا اور دیر تک ہنہناتا رہا اور پھر معلوم ہے اس نے مجھے کیا جواب دیا... بولا:

"نہیں! میں اپنے سائیس کے بغیر کیسے رہ سکتا ہوں!"

سو بات ختم ہو گئی۔ اب میری اس کی بول چال بند ہے۔ میں سر جھکائے، ہونٹوں پر چُپ کی مہر سجائے، دن رات اس کے احکامات بجا لاتا ہوں اور جب ذرا سا سانس لینے کی فرصت ملتی ہے تو سوچتا ہوں کہ میری عمرِ عزیز تا حال تین واضح ادوار سے گزری ہے۔ پہلا دور جب وہ میرا ہم زاد تھا یا شاید میں اس کا ہم زاد تھا۔ ہم گویا یک جان یک قالب تھے اور یہ قالب ایک بدمست، خونخوار، تیز و طرار گھوڑے کا تھا۔ دوسرا دور طلوع ہوا تو میں قالب سے باہر آ کر گھوڑے پر سوار ہو چکا تھا۔ اب وہ میرا گھوڑا تھا اور میں ہاتھ کی جنبش اور ایڑی کے ٹھوکے اور چابک کی ضرب سے اسے مستقیم راستے پر چلانے کی کوشش میں مصروف تھا اور اب آخری دور میں، میں اس کا سائیس ہوں۔ دن رات اس کے ناز اٹھاتا ہوں، ہمہ وقت اس کی خدمت پر مامور رہوں، اسے نہلاتا اور نہاری کھلاتا ہوں۔ اس کے تھان کو صاف کرتا ہوں، اس کی بیماریوں پر کڑھتا ہوں۔ اس سے خوف کھاتا ہوں، اس کے جاں بحق ہونے کا منتظر ہوں!!

اُردو گیت — ایک مطالعہ

شمیم احمد
نگار صہبائی
آرزو لکھنوی
فخری بھوپالی
روپ متی
تاج سعید
احمد شریف

شمیم احمد

اُردو گیت کا معاملہ

اردو کے ادیب و شاعر اور تنقید، گیتوں کے بارے میں کبھی سنجیدہ نہیں رہے اور اگر ایک آدھ فرد کچھ سنجیدہ ہوا بھی تو اس نے گیتوں کے پیچھے ہندو فلسفہ کی تلاش کی ابھار ابھر کوشش کو سب کچھ سمجھا اور اس کے تحت جو گیت لکھے وہ گیت کم اپنے نمائش علم کی سعی زیادہ تھی۔ شاید اس "بقراطیت" میں اُن کے مزاج کا کھوس پن اتنا کام کر رہا تھا کہ انھوں نے جو گیت بھی تخلیق کئے وہ بھی ٹھس ہو کر رہ گئے۔ یہاں پہلے گروہ میں اردو کے عمومی نقّاد اور شاعر شامل ہیں اور دوسری مثال جناب مظفر علی سید کی ہے۔

جہاں تک پہلے گروہ کا تعلق ہے۔ اس کے رویّے میں برصغیر کی تخلیقی روایت سے وابستگی اور اس کا شعور بہت کم یا اس کی بے شعوری زیادہ جھلکتی تھی۔ شاید اسی بناء پر گیتوں کے بارے ان کے اپنے ذاتی تاثر یا رویّے سے الگ کسی اور چیز کی نشاندہی ممکن نہیں تھی جس میں سارا زور فلمی گیتوں کے زیرِ اثر زیادہ تر برصغیر کی اجتماعی زندگی کے بعض مظاہر، بالخصوص دیہی زندگی کے ایک رومانی جذباتی رویّے پر دیا گیا تھا یا اگر کسی نے بہت تیر مارا تھا تو تصوّف اور بھگتی تحریک کے حوالے سے اپنی تحریر کو بامعنی بنانے اور ایک فکری سطح قائم کرنے کی ناکام کوشش کر دیکھی تھی۔ اس ذہنی عمل کا اگر تجزیہ کیا جائے تو اس کے بظاہر دو[۲] وجوہ نظر آتے ہیں۔ پہلے تو یہ کہ قیامِ پاکستان کے بعد ہندوؤں کے تہذیبی مظاہر اور عوامل سے محرومی کی بناء پہ پاکستان کی اجتماعی زندگی میں ایک ایسا رنگ کم ہو گیا تھا جو ہمیں برصغیر کے ایک بنیادی تہذیبی عمل سے وابستہ رکھتا تھا۔ اس رنگ سے محرومی کے احساس نے ہندی الفاظ، رسوم اور تہواروں کے بارے میں ایک رومانی سا ہالہ قائم کر دیا ہے جس میں ہندی الفاظ استعمال کرنے گیت اور دوہے لکھنا ایسے شاعروں کو بھی شوق رہا ہے جنھیں ہندی مزاج اور تہذیبی رویّے سے کوئی واسطہ نہیں تھا اور وہ ہندی اور فارسی الفاظ کی ستھرگی کے ابتذال سے بھی کام چلانے میں کوئی تکلف محسوس نہیں کرتے تھے مگر اس

عمل سے جذباتی سطح پر اس محرومی کے احساس کی نشان دہی ضرور ہوتی ہے جس کا اوپر ذکر کیا گیا ہے۔ اس
۔جہان سے جہاں بعض شاعر اپنے اسلوب میں ایک تازگی اور نیا پن پیدا کر کے خوش ہو لیتے تھے وہاں
ان کی رومانی افتادِ طبع بھی آسودہ ہو جاتی تھی۔ لیکن اس سب کچھ کے باوجود گیتوں اور دوہوں میں
کوئی سنجیدہ تخلیقی عمل نظر نہیں آتا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ یہ وسیلۂ اظہار کسی معتبر وسیلۂ اظہار کا اعتبار
حاصل نہیں کر سکا۔ ہم ان کاوشوں کو زیادہ سے زیادہ ایک تنوع کی تلاش اور ایک رومانی آسودگی کا خام
تجربہ کہہ سکتے ہیں۔ البتہ ان شاعروں میں وہ شاعر زیادہ نمایاں نظر آتے ہیں، جنھوں نے نقلِ مکانی
کی ہے یا جنھوں نے ہندوستان کے ہندو اکثریت کے علاقوں کو ترک کر کے پاکستان کو اپنا وطن بنا لیا ہے۔
ان شاعروں کے گیتوں اور دوہوں میں خلوص بھی پایا جاتا ہے اور اگر گیتوں کی معنویت کی جستجو نہ بھی ہو مگر اُن کی
بازیافت کی ابتدائی کوشش ضرور ملتی ہے۔ اس کی بظاہر ایک وجہ تو یہ ہے کہ وہ جن علاقوں سے آئے
تھے وہاں اپنی تہذیبی برتری کے باوجود معاشرے کے اجتماعی رنگوں میں وہ اس روایت کا گہرا عمل
دخل محسوس کرتے تھے۔ دوسرے برصغیر کی ہند مسلم تہذیب کی معنویت اور ارتفاع اُن ہی علاقوں میں
اپنے عروج کو پہنچا تھا جو مرکزی اقتدار کے حامل رہے تھے۔ چنانچہ ان علاقوں میں برصغیر کی ملی جلی ہند مسلم
تہذیب اپنے پورے حسن، رچاؤ اور امکانات کے ساتھ ظہور میں آ چکی تھی جس میں گہرائی، تنوع، وسعت
اور حسن سب کچھ موجود تھا۔ صرف یہی نہیں بلکہ یہ دونوں الگ الگ سمتوں میں بھی اپنے گہرے شعور کی بنیاد
پر برصغیر میں اپنی الگ اور جدا پہچان بھی رکھتی تھیں۔ چنانچہ پاکستان میں ایسے افراد کے ساتھ اس ملی جلی
تہذیب کے ایک رنگ سے محرومی کا احساس اور شعور فطری طور پر موجود تھا جس کو انھوں نے اپنے گیتوں
اور دوہوں کو موضوع بنانے کی کوشش کی۔ لیکن بڑی بدنصیبی ان شعراء کے ساتھ یہ رہی کہ انھوں نے اس
کو ایک بھرپور تہذیب کے وسیلۂ اظہار کی جگہ صرف ایک مخصوص طرزِ احساس پر مبنی صنف اور موضوع سمجھ
کر اختیار کیا۔ چنانچہ اُن کا تخلیقی عمل بھی سنجیدہ سرگرمی کے بجائے رومانی بن کر ابھرا۔ اس طرزِ عمل کی دو
جہتیں تھیں۔ ایک تو یہ کہ اُن کے گیت اور دوہے ماضی کی یادوں اور ایک چھوٹی ہوئی تہذیبی رنگارنگی سے
محرومی کا اظہار بن گئے۔ دوسرے اُن کا اسلوب ایک شادماں اور رومانی احساس یا علامتوں کے واسطے سے
ظہور میں آیا جس کو اُن کے بنیادی وسیلۂ اظہار کی حیثیت بھی حاصل نہیں تھی۔ ایسے شاعروں کی غزلوں، نظموں
اور منظوم تمثیلوں کو اُن کے گیتوں اور دوہوں کے مقابل رکھیے تو اس کا احساس شدید ہوتا ہے کہ اُن کی یہ

صنف ایک رومانی طرزِ احساس اور تیکھے جذبۂ شادمانی کے علاوہ ان کی شخصیت کا بنیادی وسیلہ نہیں بن سکی۔
اس میں جمیل الدین عالی کے دوہے، در گیتوں سے لے کر اسد محمد خان کے گیتوں تک سب کاوشیں آجاتی ہیں۔
دوسری وجہ ان شاعروں اور نقادوں کے رویّے میں واضح طور پر نظر آتی ہے جنھوں نے گیتوں یا دوہوں کے
تعلق سے مضامین یا مقالے لکھے ہیں۔ بڑی عجیب بات ہے کہ ان تحریروں میں بھی گیت اور دوہوں کی
اصل روایت اور برصغیر کی ایک بنیادی صنف پر غور و فکر کرنے کی کوئی سنجیدہ کاوش نہیں ملتی۔ نہ ان مضامین
میں اس صنف کے تخلیقی عوامل کا سراغ لگانے کی کوئی کوشش ملتی ہے۔ ایسے تمام مضامین میں ان کے
خالقوں نے محض اپنے پسندیدہ گیت یا دوہا نویس کو محض اپنے ذاتی تاثرات کی بنا پر دیکھا اور پرکھا ہے
اور گیتوں کے بارے میں ایسے نقادوں کی رسائی یا تو فلمی گیتوں کی فضا تک پہنچ رکھتی ہے یا برصغیر کے
بعض علاقوں کے عوامی گیتوں یا ساون، کھیتوں اور شادی بیاہ کے گیتوں کے بارے میں ان کی رائے بچپن
کے تاثرات پر مبنی ہوتی ہے جو خود ایک رومانی کاوش بن جاتی ہے جس کا ثبوت ایسے مضامین کا اسلوب
مہیا کرتا ہے جس میں اس فضا کو پیدا کرنے، ہندی الفاظ اور تراکیب کے مصنوعی اظہار اور بچپن کی رنگین
یادوں کے حوالے سے اپنے شخصی تاثر کو بھی سامنے لانے کی کوشش کی جاتی ہے۔ جو ایک غیر معتبر اور رومانی
شخصی اپروچ کا مظہر ہوتی ہے۔ اگر کوئی نقاد اسے تھوڑا سا سنجیدہ بنانے کی کوشش بھی کرتا ہے تو وہ عظمت
اللہ خان، آرزو لکھنوی اور میرا جی یا زیادہ سے زیادہ امیر خسرو کی زبان دہلوی کے ابتدائی نمونوں کے حوالے
سے دیکھنے کی کوشش پر ختم ہو جاتی ہے۔ اگر کوئی بہت زیادہ شانکوپل ہوا تو کبھی تصوف یا بھگتی تحریک کے
مبہم اشارے سے اپنی تحریر کو بامعنی بنانے کی سعی سے زیادہ کچھ نظر نہیں آتا بلکہ ان حوالوں میں بھی ان کے
ماضی کے ذاتی تاثرات یا بعض تاریخی واقعات کے ایسے اشارے ملتے ہیں جس کے بارے میں برصغیر کا ہر فرد
ذاتی طور پر کچھ نہ کچھ تاثر رکھتا ہے۔ کیا یہ اس بات کا ثبوت نہیں کہ یہ کام ہمارے یہاں کس قدر غیر سنجیدہ،
محدود اور کسی نہ کسی طور پر لغو کسی نہ کسی گیت کہنے والے کے ذاتی تعلقات سے ظہور میں آیا ہے۔

سوال یہ ہے کہ گیت کے بارے میں ہم پاکستانیوں کا طرزِ عمل آخر ایسا کیوں رہا ہے؟ اس کا ایک
جواز تو آپ نے اوپر پڑھ لیا۔ دوسری بات یہ ہے کہ پاکستان کے گیت لکھنے والوں کو عموماً یہ نہیں معلوم
کہ صرف جنگل کی اصنامی علامتوں یا دیو مالائی کرداروں کے ذکر سے نہ کوئی گیت تخلیق ہوتا ہے نہ اس
میں کوئی انوکھا پن یا جدیدیت آتی ہے۔ یہاں تک کہ اپنے چھوٹے موٹے حسی تجربے کو بھی اپنی ذات میں سمونے

بغیر کسی گیت کی تخلیق نہیں ہو سکتی۔ اس کے لئے شاعر کو ہندو تہذیب سے ہزاروں سالہ ذائقہ کو اپنے باطن میں محسوس کرنا پڑتا ہے۔ کم از کم کسی گیت کار کے لئے میرا جی کی طرح اس سے ابتدائی آگہی اور مناسبت تلاش کئے بغیر کسی قسم کے گیت کی تخلیق ممکن نہیں۔

اگر ہم اس پورے رویے کی گہرائی میں جا کر دیکھیں تو یہ معاملہ دراصل صرف پاکستان کے شاعروں ہی تک محدود نہیں رہتا بلکہ اس میں برصغیر کے تمام مسلمان شاعروں کے مجموعی طرزِ عمل کا گہرا لاشعوری عمل اور بنیادی طرزِ احساس ہی اصلاً کام کرتا رہا ہے۔ مثلاً ایک موٹی سی بات تو یہ ہے کہ برصغیر کے مسلمان شاعروں اور ادیبوں نے گیت کو کبھی وہ اہمیت نہیں دی جو ایک بہت بڑے ادبی سرمائے کی بنیادی صنف کو اس بنا پر ملنی چاہیئے تھی۔ ہماری اکثریت گیتوں اور دوہوں کو تخلیقی سطح پر کم سواد اور سطحی وسیلۂ اظہارِ خیال کرتی رہی ہے اور مجموعی طور پر اسے غیر سنجیدہ اسلوب سمجھتی ہے بلکہ فارسی اور عربی شعری لہجہ کی تیزی، کاٹ اور تیزیٔ ادراک کے احساسِ برتری کی بنیاد پر اسے ایک حقیر، غیر معتبر اور مبتذل صنفِ شاعری خیال کرتی ہے۔ چنانچہ یہ ان ہی مسلمان شعرا کے طرزِ عمل کا نتیجہ ہے کہ اردو میں گیت اور دوہوں کی روایت کے باوجود اس صنف کو نہ کبھی دوسری شعری اصناف کے برابر سمجھا گیا اور نہ اسے اردو کے بنیادی شعری نظام کا باقاعدہ حصہ خیال کیا گیا۔ جیسا کہ اوپر ثابت کیا جا چکا ہے کہ اسے زیادہ سے زیادہ ایک نوع کے جذباتی اور سطحی محسوسات کا ترجمان سمجھا جاتا رہا ہے۔ جیسے کچھ شہری لوگ جب شہروں کے ہنگاموں سے بیزار ہو کر سکون کی تلاش میں دیہاتوں کا رُخ کرتے ہیں تو وہاں ایک رومانی احساس، فرار کا نیا ذائقہ محسوس کرتے ہیں جو صرف حسی ہوتا ہے۔ گویا اس کو اردو فلموں کی دین سمجھتے۔ کچھ لوگ اسے ایک مخصوص پتلے جنسی تقاضے کی آسودگی کا ذریعہ بنا لیتے ہیں جس میں میلے ٹھیلوں کی رومانی فضا، ایک ستارومانی اور چھیڑ کی کوشش اور ہندو سماج میں عورتوں کی آزادی کے حوالے سے ان سے منسوب کچھ مذہبی ذائقے شامل کر کے اسی کو گیت سمجھ لیتے ہیں۔ اس پورے رویے سے جو بات سامنے آتی ہے وہ یہ ہے کہ مسلمان شاعروں نے گیت اور دوہوں کو کبھی تخلیقی شخصیت کے اظہار کا سنجیدہ وسیلہ نہیں سمجھا بلکہ وہ اس کو جذبے کی گہرائی، فکر کی اعلیٰ سطح اور انسانی طرزِ عمل کے اعتبار سے تخلیقی اظہار کے لئے ناموزوں خیال کرتے رہے۔ اس اجتماعی اور مسلسل طرزِ عمل کو ہم خواہ مخواہ ٹامک ٹوئیاں مار کر نہیں سمجھ سکتے بلکہ اس کے اسباب اور عوامل مسلمانوں کے طرزِ عمل میں بہت دور تک اور گہرے چلے گئے ہیں۔ جب تک

ہم ایک بار اس کو شعور میں نہیں لے آتے تک گیتوں سے اپنے طرز تعلق کا تعین ہی نہیں کر سکیں گے

گیت صرف برصغیر کی جدید ہندی بولیاں اور مقامی زبانوں کی صنف ہی نہیں ہے بلکہ اس کا باقاعدہ تعلق اور تسلسل سنسکرت سے ہوتا ہوا ویدک زبان سے مل جاتا ہے۔ اس سلسلے میں پہلی بات تو یہ سمجھ لیجئے کہ گیت، دوہے اور منظوم ناٹکوں سے قطع نظر خواہ بھجنوں کی صورت میں ہوں خواہ اشلوکوں اور دیو مالائی منظومات کی صورت میں بنیادی طور پر گیت ہی ہوتے ہیں اور اس طرح یہ ہند تہذیب اور ادبیات کی سب سے بنیادی اور اہم صنف قرار پاتی ہے جس کے ذریعے ہند تہذیب اور طرز احساس کا بنیادی تخلیقی جوہر اظہار میں آیا ہے۔ اس کی ایک جہت رگ وید کے ان لافانی گیتوں تک پہنچتی ہے جو پانچ ہزار سال قبل سے تخلیق ہونا شروع ہوئے تھے اور جو دنیا کی قدیم ترین "ریکارڈیڈ" شاعری کے اولین نمونے سمجھے جاتے ہیں۔ یہ اتنا عظیم، گہرا، متنوع، وسیع اور سنجیدہ سرمایۂ ادب ہے جو تخلیقی سطح پر دنیا کی ہر بڑی شاعری کے سامنے بلا جھجک پیش کیا جا سکتا ہے اور پھر رگ وید سے لے کر برصغیر میں مسلمانوں کی آمد سے قبل تک یہ صنف برصغیر کے تخلیقی سرمایہ کی بنیادی صنف رہی ہے۔ جس میں ایک طرف اعلیٰ ترین سطح پر مہابھارت سے رامائن تک اور خالص ادبی سطح پر پرانوں کے زمانے سے لے کر اس تخلیقی شاعری کا اظہار کالی داس، سور داس، چنڈی داس، بھوبھوتی اور بھرتری ہری جیسے شاعروں کے یہاں اسی وسیلۂ اظہار میں ہوا ہے۔ اور یقیناً اس میں جو شاعری تخلیق ہوتی ہے اسے دنیا کے قدیم اور بہترین سرمائے شاعری کی بہترین صف میں رکھا جا سکتا ہے۔

لیکن مسلمانوں کی آمد سے کچھ زمانہ قبل یہ ہزاروں سالہ گیتوں کا سفر مختلف صدیوں کے تضادات، زوال اور رد عمل کا شکار ہوتا ہوا ایک نئے موڑ تک آ گیا تھا جب تک برصغیر میں ہندو تہذیب اور سماج ایک مرکزی نظام حیات اور شعوری قوت سے جڑا رہا جس میں ان کا سماجی نظام مقتدر رہا اور اس پر برہمنوں اور چھتریوں کی گرفت مضبوط رہی اس کے تہذیبی اور ادبی آثار اور عوامل بھی قائم رہے۔ اور اس میں مرکزیت اور توانائی موجود رہی جس کو ان کے طرز فکر اور طرز احساس کا اعلیٰ ترین تخلیقی عمل کہا جا سکتا ہے۔ لیکن جب اس مرکزیت اور اس کی غیر انسانی جبریت کے خلاف ہندوستان گیر تحریکیں اٹھیں اور کامیاب ہوئیں تو پھر ہندو ادبیات میں طویل زمانوں پر مشتمل آثار چڑھاؤ آتے رہے جس میں اس تہذیب کی مرکزیت ختم ہو گئی۔ چنانچہ جس وقت مسلمان برصغیر

میں داخل ہو رہے تھے تو ہندو سماج کا مرکزی شعور تقریباً بکھر چکا تھا۔ اس کا ایک عمومی اور سامنے کا ثبوت یہ ہے کہ برصغیر کی لسانی تبدیلیوں نے کسی مرکزی زبان اور ادب کے تسلسل کو باقی نہیں رہنے دیا تھا۔ ان کی کوئی ایسی مرکزی زبان موجود نہیں جس کو ان کے تہذیبی ورثے کی حیثیت حاصل ہو۔ پورے طول و عرض میں پراکرتیں تک ٹوٹ پھوٹ کر اپ بھرنشوں کی مسخ شدہ شکلیں اختیار کر چکی تھیں، اور مرکزی تہذیبی شعور کی جگہ علاقائی اور مقامی عوامل لے چکے تھے۔ اور یہی وہ موڑ تھا جب گیت اپنی مرکزی تہذیب سے ٹوٹ کر مختلف علاقائی اور لوک گیتوں میں تقسیم ہو رہے تھے جن کی تخلیقی سطح میں مشترک فکر اور جذبے کی مختلف علاقوں کے دیہی، مقامی اور عوامی طرز احساس نے اپنی شروع کر دی تھی۔ اس عمل کو مسلمانوں کے غلبے نے اور بھی سنگین بنا دیا۔ ایک طرف اس نے برصغیر کی جدید زبانوں کے ٹوٹ پھوٹ کے عمل کو اور تیز کر دیا اور دوسری طرف مسلمانوں کے اثرات ان کی تعمیر اور تشکیل نو میں تعمیری کردار ادا کرنے لگے۔ جس کی وجہ سے برصغیر کی جدید زبانیں مسلمانوں کے اثرات اور ادبیات کے زیر اثر ایک نئے دور میں داخل ہو گئیں۔ مجھے اثرات کے بارے میں یہ مختصر اشارے اس لئے کرنے پڑے کہ اس کے بغیر ہم گیتوں کے تناظر کو سمجھ نہیں سکتے تھے۔ اب آیئے اس حوالے سے برصغیر کے نئے ادبی منظر کے بارے میں کچھ اشارے۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ برصغیر کی اس صورت حال میں مسلمانوں کی آمد ایک بہت بڑی اور دور رس تبدیلی اور معاشرتی انقلاب کا ذریعہ بنی کیوں کہ مسلمانوں نے ایک نئی قوم کی حیثیت میں یہاں مستقل قیام کا ارادہ کر لیا تھا۔ ایک طرف تو وہ اپنے بالکل مختلف مذہبی تناظر کی بنا پر برصغیر کے طبقاتی نظام اور جبریت کے مقابلے پر ایک بہت بڑے انسانی انقلاب کے تصور کو عام کرنے کا سبب بنے تو دوسری طرف ان کے تمدنی نظام اور تہذیبی شعور نے ہندو سماج کو ایک جدید طرز حیات دیا جس کے پیچھے جدید وسائل کی قوت بھی کام کر رہی تھی جس نے برصغیر کے ہر علاقے پر اپنے گہرے اثرات مرتب کرنا شروع کر دیے اور تیسری جہت اس میں یہ کام کر رہی تھی کہ ان کی زبانیں اور ادبیات برصغیر کی زبانوں کے مقابلے پر زیادہ مہذب شعور، زیادہ فکری گہرائی اور زیادہ وسیع انسانی تجربات کے نہایت ترقی یافتہ اور "شائستہ" اسلوب کی بنا پر مقامی ادبیات کی مرہون منت نہیں تھیں۔ غرض کہ مسلمانوں کی آمد نے برصغیر کی سماجی اور تہذیبی زندگی پر ہر جہت سے بڑا گہرا اثر ڈالا۔ مسلمانوں کے طرز عمل میں فطری طور پر تہذیبی غلبے کے علاوہ سیاسی

اقتدار اور حکومت کی وجہ سے ایک احساسِ برتری شروع سے موجود تھا لیکن اس احساس کو شعور کی منزل تک آنے میں برصغیر کے مختلف علاقوں میں برسہا برس تک مسلمانوں کے اثرات نے متعدد شکلیں تبدیل کیں مثلاً جس وقت مسلمانوں کی ابتدائی حکومتیں برصغیر کے مختلف علاقوں میں قائم ہوئیں تو ہم یہ دیکھتے ہیں کہ برصغیر کی علاقائی زبانوں میں مقامی کلچر اور بولیوں کے اثرات غالب نظر آتے ہیں۔ لیکن اس بظاہر غلبے کے باوجود مسلمان ادیبوں اور شاعروں کا تہذیبی شعور اور فکری سمتیں الگ اور صاف پہچانی جاتی ہیں۔ گویا مسلمان ان مقامی زبانوں کی ادبیات میں بھی موضوعات' اصناف' تہذیبی شعور' طرز فکر و احساس سے ایک نئی سمت پیدا کر رہے تھے۔ اگر اس کا اندازہ کرنا ہو تو شمالی ہند میں امیر خسرو اور قدیم دکنی میں مسلمانوں کی ابتدائی کاوشوں کے حوالے سے اس بدلی ہوئی صورت کا اندازہ بخوبی کیا جا سکتا ہے یہ عمل تقریباً مغلیہ سلطنت کے آغاز تک مقامی اثرات کے غلبے کے باوجود دیکھا جا سکتا ہے۔ گویا اس ارتقائی عمل کے مطالعے سے جو بات سامنے آتی ہے وہ یہ ہے کہ مقامی زبانوں اور کلچر کے بظاہر اثرات کے باوجود یہ سارا ادب ہندو طرز احساس سے مل کر مسلم طرزِ فکر کی بنیاد پر تخلیق ہو رہا تھا۔ اس کی ایک سامنے کی مثال سب رس ہی کی ہے جو اس دور کے آخری مراحل میں نہایت اہم ادبی کارنامے کی حیثیت رکھتی ہے۔ اس میں مسلمانوں کی زبانوں کے اثرات تو مقامی غلبے سے برسرِ پیکار ہیں مگر سب رس کا موضوع اسلامی تصوف کے حوالے سے نئی علامتوں اور گہری تبدیلیوں کا غماز بنا ہوا ہے۔ تقریباً یہی صورت اس دور کے منظوم ادب میں بھی نظر آتی ہے چنانچہ اس طویل عمل کا نتیجہ یہ ہوا کہ گیتوں سے اکتساب اور تحصیل کا عمل بالکل بند ہو گیا۔ ایک تو اس وقت ہم عصر گیت خود علاقائی اور مذہبی اثرات کے تحت مکمل طور پر آ چکے تھے اور قدیم گیت چونکہ ہندو کلچر کی روح کے ترجمان تھے جس سے مسلمانوں نے کوئی دلچسپی نہیں لی۔

اس عمل کا دوسرا روپ خود ہندو سماج اور ہندو ادبیات میں ایک دوسری شکل میں ظاہر ہوا۔ مسلم جدید شعور کا نتیجہ یہ نکلا کہ گیتوں کی رہی سہی اہمیت ختم ہو گئی اور ان کی جگہ بڑی تیزی سے دوہوں کی صنف نے لے لی۔ یہ عمل اس لئے ہوا کہ ایک طرف تو دوہوں میں فکری عنصر کی گنجائش گیت کے مقابلے میں زیادہ تھی اور دوسری وجہ غزل کے وہ اثرات تھے جس نے برصغیر کے شہروں کے کلچر پر بڑا اثر ڈالا تھا۔ غزل کی خصوصیت یہ تھی کہ اس میں فکر اور احساس کا ایک پیچیدہ اور نازک امتزاج صرف ایک شعر میں تکمیل

پایا جاتا تھا۔ مغلیہ درباروں میں فارسی غزل کی پذیرائی اور ایران سے اہم غزل گو شعرا کی آمد نے ان درباروں سے متعلق ہندو شاعروں کو جس طرح متاثر کیا اس کا ایک اہم ثبوت دوہوں کا عروج تھا۔ اور اس اثر کی سب سے قابلِ توجہ مثال خود عبدالرحیم خانخاناں کے دوہے ہیں۔ برصغیر کی ادبیات کا مطالعہ بتاتا ہے کہ برصغیر میں دوہوں کی صنف میں بہترین شاعری مسلمانوں کی برصغیر میں آمد کے بعد عروج کو پہنچی ہے بلکہ اس عہد کے ممتاز ترین ہندو شعرا اور شاعرات اسی عہد سے تعلق رکھتے ہیں جنھوں نے دوہوں کو گیتوں کی طرح ایک بنیادی وسیلۂ اظہار بنا دیا۔

اس عمل کا ثبوت دوسری طرف آپ کو ہندو فکر پر ان اثرات سے مل جاتا ہے جو مسلم شعور اور فکر کی بنیاد پر مرتب ہوتے تھے۔ جس سے نہ صرف نئی نئی ہندو تہذیبی تحریکیں وجود میں آئیں بلکہ تصوف کے زیر اثر بھگتی تحریک کا ظہور ہوا اور یہ اسی کا نتیجہ ہے کہ ہندوستان کے بعض نئے مذاہب اسی دور میں پیدا ہوئے۔ اس تناظر سے یہ اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ مسلم اقتدار نے ہندوستان کی پوری معاشرتی زندگی کو کس حد تک متاثر کیا۔

جب مسلم اثرات نے برصغیر میں اپنے قدم جما لئے تو وہ انقلاب رونما ہوا جس کو ہم ہند مسلم تہذیب سے تعبیر کرتے ہیں۔ ایک تو اس کا سب سے نمایاں اثر اس زبان کی صورت میں ظاہر ہوا جسے ہم اردو کہتے ہیں جو مقامی اثرات پر مسلم شعور کے غلبے کا ثبوت فراہم کرتی ہے۔ اس زبان کا بنیادی ڈھانچہ مقامی اثرات کے مشترک عناصر پر قائم تھا مگر اس پر مسلمانوں کے تہذیبی شعور اور فکری برتری کی چھاپ لگی ہوئی تھی۔ فارسی عربی الفاظ تراکیب، اصناف ادب، تاریخی عوامل، طرز احساس اور طرز فکر سب میں مسلمانوں کے ورثہ کا غلبہ صاف نظر آسکتا ہے۔ اس آمیزے کی سب سے بہترین مثال اردو کی باقاعدہ ابتدائی شاعری نظر آتی ہے۔ ولی کے کلام سے یہ اثر اتنا نمایاں ہونا شروع ہوتا ہے کہ اردو شاعری کو بھی مسلمانوں کے تہذیبی مظاہر میں شمار کیا جانے لگا۔ مقامی اثرات اور مسلم تہذیبی شعور کے امتزاج کے امکانات میر کی شاعری میں اپنے بہترین توام کی صورت اختیار کر لیتے ہیں جو اپنے طرز احساس میں برصغیر کی ملی جلی تہذیب کی آواز ہے اور جس میں مسلم ادبیات کی اصناف نے ایک ایسا تہذیبی تناظر پیدا کر دیا تھا جو اسے فارسی اور عربی ادبیات سے ممیز کر کے خالص ہند مسلم تہذیب کی آواز بنا دیتا ہے اور ان ہندی علاقائی اثرات سے بھی پاک کر دیتا ہے جو دکنی ادب تک اردو پر غالب نظر آرہے تھے۔ میر کی غزل سے جب یہ سفر آگے

بڑھتا ہے تو اس پر مسلم شعور اور ادبیات کی چھاپ اور زیادہ گہری اور نمایاں ہونے لگتی ہے۔

اب ذرا اس پورے تناظر پر غور کیجئے تو یہ حقیقت سامنے آتی ہے کہ مسلم شعور کی برتری اور غلبے نے ہندو ادبیات کو بہت پیچھے چھوڑ دیا تھا اور خالص ہندی گیت اور دیگر اصناف صرف یہی زندگی کی ترجمان ہو کر رہ گئی تھیں جنھیں مسلمانوں نے فطری طور پر نظر انداز کیا۔ یہی وہ چیز ہے جب کبھی کبھی فراق صاحب ہندوستان کے کوی سمیلنوں میں ہندی شاعروں سے طعنے کے طور پر کہتے ہیں کہ صاحب ہندی زبان اور ہندی شاعری فارسی کے لہجے کے بغیر گنوار اور دیہاتی معلوم ہوتی ہے تو پھر خوب جوتم پیزار ہوتی ہے۔ صدیوں کے تاریخی عمل کے اس تناظر کو میں نے محض اشاروں میں اس لئے بیان کرنے کی کوشش کی ہے کہ اس سوال کا جواب تلاش کیا جا سکے جس کا حوالہ میں نے اس مضمون کی ابتدا میں دیا ہے۔

اب آیئے اس پس منظر سے ہٹ کر اردو میں گیتوں کی روایت کا سرا پھر سے پکڑیں۔ اردو کے جدید ادب میں گیتوں کی طرف جو توجہ ہوتی وہ دراصل عظمت اللہ خان اور آرزو لکھنوی سے شروع ہوتی ہے۔ عظمت اللہ خان کے گیت ہی مسلمان شاعروں کے اس طرز عمل کو متعین کر دیتے ہیں جو آج تک جاری ہے۔ عظمت اللہ خان کے گیتوں کا اُن گیتوں سے کیا تعلق ہے جو برصغیر کے تخلیقی جوہر کا سب سے نمایاں اظہار رہے ہیں اور جو رگ وید سے اپنا رشتہ جوڑتے ہیں؟ عظمت اللہ خان کے گیت ایک دیہاتی عورت کے اس فراقیہ احساس پر مبنی ہیں جو شوہر سے جدائی اور دوری کی وجہ سے برپا الاپ رہی ہے اور یہ موضوع ہندو سماج اور برصغیر کے ادبیات میں ایک عمومی موضوع بھی رہا ہے۔ لیکن عظمت اللہ خاں نے اسے ہندی گیتوں کی عظیم روایت اور تناظر کے مقابل نہیں سوچا ہے بلکہ کچھ اصلاحی سے جذبے اور کچھ ہندوستانی عورت کی اپنے شوہر سے روایتی وابستگی کی رومانی مظلومیت اور اس میں حسن محسوس کر کے ذاتی تاثر کے ایک ملاقاتی روپ میں بیان کر دیا ہے۔ پھر یہ اتنے محدود طور پر ہوا ہے کہ اسے سوائے ذائقہ کی تبدیلی کے اور کچھ قرار نہیں دیا جا سکتا کیوں کہ یہ صنف اُن کے یہاں مستقل وسیلۂ اظہار بھی نہیں بن سکی ہے جسکو میں ایک بسورتی ہوئی رومانیت سے تعبیر کرتا ہوں۔

اسی طرح آرزو لکھنوی کے گیت سب کو معلوم ہیں کہ ان کی پیشہ ورانہ سرگرمیوں کے تحت اظہار میں آئے تھے۔ جو زیادہ تر تھیٹر کی فلموں کے لئے لکھے گئے تھے۔ یہ الگ بات ہے کہ فلمی گیتوں کو ابتدا ہی میں اتنا بڑا شاعر

میسر آگیا جس نے فلمی گیتوں میں بھی اپنے خلوصِ فن کی وجہ سے واقعی حقیقی گیتوں کا تجربہ کیا اور پہلی بار اردو گیتوں کو ہندی مزاج اور ہند تہذیب کے بنیادی طرزِ احساس سے ملانے کی بھی کوشش کی۔ اگر اردو میں واقعی کچھ گیت، گیت کی روایت میں لکھے گئے ہیں تو وہ آرزو ہی کے گیت ہیں مگر ہماری بدنصیبی سے گیت کی صنف آرزو کے یہاں بنیادی وسیلۂ اظہار نہیں بن سکی اور وہ اُن کی معتبر تخلیقی سرگرمیوں میں کبھی نہیں آئی بلکہ ایک کمرشیل ضرورت ہی کے نتیجہ میں سامنے آئی ہے۔ لیکن آرزو کے ان فلمی گیتوں کا کوئی مقابلہ ان کے لبعد کے فلمی گیتوں کی اُس مبتذل صنف سے نہیں ہے جس نے گیتوں کے ہر تصور کو مسخ کیے اور بھی بے اعتبار کر دیا۔

ان دونوں حضرات کے علاوہ کسی اور شاعر نے اگر واقعی گیتوں کی طرف خلوص سے توجہ دی ہے تو وہ میرا جی ہیں۔ نہ صرف اس لئے کہ گیت ان کے ذرائعِ اظہار میں سنجیدہ سرگرمی کا درجہ رکھتے ہیں بلکہ اس لئے بھی کہ انہوں نے شعوری طور پر گیتوں کی بنیادی روایت کا سراغ نکالنے کی کوشش کی اور اپنے مزاج میں ہند تہذیب کے ذائقہ کو شامل کرنے کی مختصر مگر ابتدائی پُرخلوص کوشش کی تھی۔ اگر وہ کچھ عرصہ اور اپنی آخری زمانے کی وارفتگی سے محفوظ رہتے اور زندہ رہتے تو شاید یہ صنف اردو میں بھی کچھ اعتبار حاصل کر لیتی۔ مگر ایک طرف ان کی جواں مرگی اور دوسرے گیتوں کی بازیافت کے ادھورے عمل نے ان گیتوں کو بھی اردو کی تخلیقی اصناف میں کوئی جگہ دلانے میں قابلِ ذکر کامیابی حاصل نہیں کی۔

یہ ہے وہ مکمل صورتِ حال جس میں ہمارے نئے گیت کہنے والے کام کر رہے ہیں۔ وہ متذکرۂ بالا تینوں دائروں کے اسیر بھی ہیں اور شکار بھی۔ ان میں سے کوئی بھی ان دائروں سے آگے نکل سکا اور نہ انہیں توڑ کر اپنا نیا دائرہ بنا سکا۔ چنانچہ آج بھی آرزو، میرا جی اور عظمت اللہ خاں اردو میں گیت کے سب سے معتبر نام ہیں اور اُن کے نام لیوا، آرزو کے فلمی گیتوں، میرا جی کے ادھورے ادبی تجربوں اور عظمت اللہ خاں کی رومانیت کے علاوہ کسی اور تصور سے واقف نہیں۔ بڑی بدنصیبی یہ ہے کہ ان کو گیتوں کی اصل روایت سے دلچسپی اور اس کے بارے میں جاننے کی جستجو بھی نہیں۔ لہٰذا ایک کھوکھلی رومانیت، چھچھلی جذباتیت اور فلمی ابتذال کے سوا اردو میں کوئی ایسی صنف موجود نہیں جس کو گیت کا نام دیا جا سکے۔

یہ سب کچھ کہہ دینے کے باوجود بنیادی سوال اب بھی باقی ہے کہ اس تمام تاریخی، تہذیبی، نفسیاتی اور سماجی پس منظر کے باوجود پاکستان میں گیتوں سے ایک حقیقی دلچسپی کیوں پائی جاتی ہے؟ اور اردو کے تمام

نقادوں کے مزید شاندار اور بعض شاعروں کے فلمی پیشے کے باوجود پاکستان میں ہمیشہ دو ایک ایسے شاعر ضرور موجود رہے ہیں کہ انہوں نے خواہ گیت کو کچھ دیا ہو یا نہ دیا ہو مگر وہ اسے اپنے سنجیدہ شخصی ابلاغ کا مسئلہ ضرور سمجھتے رہے ہیں۔ میں نے عالی اور اسد محمد خاں کے حوالے سے جو بات کی تھی اب اس کی مستثنیات کا بھی ذکر کردوں جس کی وجہ سے مجھے اس موضوع پر اتنی لمبی تمہید باندھنی پڑی ہے۔

اس سلسلے میں سب سے پہلے مختار صدیقی کے ان گیتوں کا حوالہ دوں گا جو انہوں نے گیت کے بنیادی جوہر یعنی موسیقی کے اصولوں پر تخلیق کئے تھے۔ یہ یقیناً ایک نہایت سنجیدہ کاوش تھی جس کو اگر وہ اپنا بنیادی اور مستقل وسیلۂ اظہار بنا لیتے تو گیتوں کی روایت اردو میں اتنی لنڈوری نظر نہ آتی جتنی اب نظر آتی ہے۔ مختار صدیقی نے یہ کام میراجی کے زیر اثر کیا تھا جو پاکستان میں میراجی اسکول کے سب سے معتبر شاعر تھے (دوسرے ہندوستان میں اختر الایمان ہیں) لیکن مختار صدیقی نے جہاں میراجی کے کام کو آگے بڑھانے کی کوشش کی تھی وہاں اُن کے تتبع میں اسے ادھورا بھی چھوڑا اور رختِ سفر بھی جلد باندھ لیا۔ لہٰذا ان کی یہ کاوشیں بھی ادھوری اور بے اعتبار رہ گئیں مختار صدیقی کو چھوڑ کر اگر کسی اور شاعر نے گیتوں کو سنجیدہ تخلیقی عمل سمجھا ہے تو وہ نگار صہبائی ہے جس کے گیتوں کے دو مجموعے جیون درپن اور من گاگر شائع ہو چکے ہیں۔ میرے سامنے اس کا آخر الذکر مجموعہ ہے جس کے حوالے سے یہ بات کر رہا ہوں۔ اگر نگار اس کا بُرا نہ مانے تو میں یہ کہہ سکنے میں حق بجانب ہوں گا کہ اس کے ابتدائی گیتوں کے تعارف میں کسی حد تک میرا بھی ہاتھ رہا ہے اور یہ کہنے کی ضرورت اس لئے پیش آئی کہ میں یہ بتا سکوں کہ نگار کے گیتوں سے میری واقفیت اور تعلق ابتدا ہی سے رہا ہے۔ نگار نے مجھے من گاگر پر چند جملے لکھ کر ایک پرانی بات یاد دلا دی ہے۔ یہ جملے آپ بھی پڑھیئے :

"شمیم احمد کے لئے۔ ایک دن ۱۹۵۸ء میں ہم دونوں تین ہٹی کے پل پر جا رہے تھے۔ تم نے مجھ سے کہا تھا، نگار خاں گیت تو بہت اچھے ہیں۔ لیکن شاعری پتلی ہے۔ بیس سال بعد اپنے پیر و مرشد سلیم احمد کی تربیت کا قوام ملا کر گاڑھی شاعری پیش کر رہا ہوں۔"

شاید نگار نے میری بات کا مفہوم صحیح نہیں سمجھا تھا۔ بات نہ پتلی شاعری کی تھی نہ گاڑھی کی۔ دراصل اس وقت نگار کی شاعری بھی اسی عارضے کی شکار تھی جس کا ذکر میں اوپر کر چکا ہوں۔ گو کہ اس وقت بھی وہ پاکستان کے تمام گیت لکھنے والوں میں اس لئے ممتاز تھا کہ ایک تو اس کے یہاں عجزِ بیان یا صرف چند خوبصورت ہندی الفاظ لکھ دینے کا شوق نظر نہیں آتا تھا جو اسے ہندی اور فارسی کی نہایت بھدی کھچڑی سے بچائے

ہوا تھا۔ دوسرے اس کے گیتوں کا موضوع حقیقی دیہی زندگی کا پس منظر تھا جو وہ پیچھے چھوڑ آیا تھا اور جس کو اظہار میں لانے کے لئے اس نے گیتوں کو بنیادی وسیلہ بنا لیا تھا۔ تیسری بات جو اس کو واقعی اس کام کا اہل بناتی تھی اس کے گیتوں کا ترنم خیز آہنگ تھا جس سے برصغیر کے گیتوں کا خمیر اُٹھا تھا۔ گیتوں، پنگھٹوں اور ساون کے گیت سب اُس کی آواز کا ایک بنیادی رنگ بن گئے تھے۔ اگر اس میں کسی چیز کی کمی تھی تو اس فکری سطح، تہذیبی شعور اور انسانی جذبوں کی گہرائی کی جو گیتوں کو گیت بناتی ہے۔ لیکن نگار نہ اس محرومی سے ہراساں ہوا اور نہ گیتوں سے مایوس بلکہ اس نے اس صنف کو شخصی اور ذاتی تجربوں کے حوالوں سے اپنی شخصی وارداتوں کے اظہار کا ذریعہ بنا لیا اور شاید اس کے ساتھ ہی اس نے اپنی پہلی شاعری کو گاڑھا بنانے کے لئے اپنے ذاتی تجربوں کو کبھی آرزو کے گیتوں کے طرز احساس سے ملا کر اور کبھی ہندو دیومالا کے ناموں کے وسیلے سے اپنے ذاتی تجربوں کو اجتماعی انسانی المیوں کے حوالے سے دیکھنے کی ایک مسلسل اور قابلِ قدر کوشش جاری رکھی۔ حالانکہ اگر وہ چاہتا تو گیتوں کے اصل سرمائے تک اس کی رسائی ہو سکتی تھی اور وہ یقیناً ایک بہت بڑی روایت کو اردو میں برتنے کی اہلیت بھی رکھتا تھا مگر چونکہ اس کے ذہن میں اصل گیتوں کا کوئی تناظر موجود نہیں تھا۔ اس لئے وہ اسے شخصی حوالے ہی سے برتتا رہا۔ البتہ اس نے دیومالائی کرداروں اور ہندو تہذیبی علامتوں کو اس کے اپنے تہذیبی ذائقہ کے ساتھ پیش کرنے کی کوئی کوشش نہیں کی۔ ہر چیز اس کے ذاتی غم، دکھ اور جذباتی ردِ عمل کا روپ بن کر گیت میں ڈھل گئی۔ اس کا ایک فائدہ اسے پہنچا کہ اس کے گیت کبھی پھیکے، تکرار اور بے اثری کے شکار نہیں ہوئے اس کا پہلا مجموعہ جیون درپن اِن ہی خصوصیات کی وجہ سے اردو میں گیتوں کے سفر کی ایک اہم منزل تھی جس میں اس کے ابتدائی رنگ کے گیتوں میں اس کی ذات بھی شامل ہو گئی تھی۔ لیکن جب وہ اس منزل سے آگے بڑھا تو ایک طرف تو گیت پر اس کی تخلیقی گرفت موجود تھی اور دوسری طرف فن کار کے وجود کو اس کی اپنی ذاتی واردات سے الگ دیکھنے والی تخلیقی آنکھ نے اسے گیت کی اس سرحد پر پہنچا دیا جہاں وہ علامتیں ڈھال سکتا تھا۔ نئی بنائی اور ڈھلی ڈھلائی علامتیں نہیں بلکہ اپنے تہذیبی شعور اور تاریخی صداقتوں کی علامتیں۔ یہی گیت کی وہ سطح ہے، جہاں گیت، گیت بن جاتے ہیں۔ عظمت اللہ خاں اور علاقائی تناظر کے گیت نہیں بلکہ مرکزی شعور والے گیت۔

'من نگاگر' کے گیت ایک اردو شاعر کا بنیادی وسیلہ بن کر ابھرے ہیں اور یہ وسیلۂ اظہار

جدید ادب میں یہ کام کرنے والے کسی شاعر کو میسّر نہیں ہوا ہے۔ اب میں خود سے یہ پوچھنا چاہتا ہوں کہ کیا نگار کے یہ گیت بحیثیت صنف اور وسیلۂ اظہار ہندو ادبیات کے ان گیتوں کی کڑی شمار ہو سکتے ہیں جس کے ایک طرف رگ وید کے گیت اور دوسری طرف چنڈی داس کے گیت ہیں؟ تو میں پوری ذمہ داری سے یہ بات کہہ سکتا ہوں یہ گیت وہ گیت نہیں ہیں کیوں کہ ان گیتوں کو جس سماجی جس تہذیبی شعور، تاریخی عمل اور زمین نے پیدا کیا تھا نگار اسے چھو کر بھی نہیں گزرا ہے۔ لیکن اردو گیتوں میں جو سطح کوئی پیدا نہیں کر سکا وہ نگار نے پیدا کر دکھائی ہے۔ اس لیے کہ من گاگر تک پہنچتے پہنچتے وہ گیت کہنے والا نہیں رہا بلکہ ایک ایسے حقیقی شاعر کی حیثیت میں سامنے آیا ہے جو جھوٹی روایت اور اوڑھی ہوئی "صنفی صداقت" سے مطمئن نہیں تھا۔ اس نے جب گیتوں کے روپ میں اپنے تہذیبی شعور اور تاریخی صداقتوں سے رشتہ جوڑا تو اس کے گیتوں میں وہی سچائی، وہی خلوص اور گہرائی پیدا ہو گئی جو ان اصل گیتوں میں موجود تھی جو اپنے جداگانہ تہذیبی شعور اور تاریخی عمل سے پیدا ہوئے تھے۔ وہ بہت بڑی روایت تھی، اس کے پیچھے صدیوں کے انسانی سفر کی کہانی پوشیدہ تھی مگر نگار کے پیچھے کچھ نہ تھا، سوائے اپنے تہذیبی شعور کے۔ سو اس نے اپنے گیتوں میں بالکل ہی نئی سمت کو سمو دیا اور اردو گیت واقعی ایک سنجیدہ اور سچی صنفِ ادب معلوم ہونے لگے۔ اردو کا ایک نیا وسیلۂ اظہار۔

لیکن من گاگر کے مطالعہ سے میں جس نتیجہ پر پہنچا ہوں اس میں ایک چیز مجھے کھٹکتی ہے۔ کیا ہندی صنف شاعری کی یہ شاخ یعنی گیت اردو اصناف ادب کا حقیقی جزو بن سکتے ہیں؟ میرا جواب آپ کو بھی مایوس کرے گا اور خود مجھے تو مایوس کر ہی چکا ہے۔ میرا خیال ہے کہ کوئی ناپسندیدہ غذا جزو بدن کبھی نہیں ہو سکتی۔ گیت بھی اردو کے تہذیبی بدن کا جزو نہیں ہو سکتے۔ آپ کا کیا خیال ہے کہ برصغیر میں مسلمانوں کی آمد سے ایک ہزار سالہ تاریخ میں مسلمانوں نے گیتوں کو یوں ہی نظر انداز کر دیا تھا؟ کیا یہ صرف قومی عصبیت کا نتیجہ تھا؟؟ جی نہیں بڑی تہذیبوں میں یہ تنگ نظری نہیں ہوا کرتی اور جس فکر نے ہندو تہذیب کو ایک نئی جہت اور معنویت دی ہے وہ تو کبھی بھی تنگ نظر نہیں رہی ہے۔ دراصل مسلم تہذیب کی روح گیت کی ہندو روح سے کبھی ہم آہنگ نہیں ہو سکتی تھی چنانچہ نگار کے بہترین گیتوں کی اعلیٰ ترین سطح وہ سطح ہے جہاں اس نے اپنے عقیدے اور اپنے تہذیبی شعور کی علامتوں کو گیتوں میں گھلا ملا دیا ہے۔ مگر سچ بتائیے کہ کیا وہ ادب سے نہیں کٹتے؟ کیا ان

واقعات کی تہذیبی صداقتیں اور ان علامتوں کی بنیادی روح گیت کے روپ میں اَن میل اور بے جوڑ محسوس نہیں ہوتیں۔ دراصل یہی وہ بنیادی سچائی ہے کہ ان گیتوں میں مجھے وہ روحانی حظ حاصل نہیں ہو پایا۔ جو بھجنوں میں ہند طرز احساس کی وجہ سے ایک دوسری سطح پر محسوس ہوتا ہے۔ میں نے ان گیتوں کو یہ کہہ کر خوب داد دی ہے کہ گیتوں میں اسلامی روایت اور شعور کس حسن سے بیان ہو سکتا ہے اسے ان گیتوں میں دیکھئے اور اس سے گیتوں کی صنف میں ایک بالکل نئی جہت اور سمت بھی نگار کی وجہ سے ظہور میں آگئی ہے مگر جناب والا اس کارنامے کے باوجود اس سے میرے تہذیبی اور تخلیقی وجود کو کوئی تسکین حاصل نہیں ہو سکی ہے۔ شاید ایک طرز احساس دوسرے طرز احساس سے مل ہی نہیں سکتا۔

تو کیوں نہ ہم نگار کے گیتوں کو اردو نظم کا ایک تجربہ قرار دیدیں۔ نگار نے یقیناً اسے ایک نیا اسلوب دیدیا ہے مگر جناب یہ تو گیت ہیں؟ ہاں گیت تو ہیں۔ اچھا تو نگار یہ کرو ۵۰ ایسے گیت اور کہو اور پھر انہیں ہندی اسکرپٹ میں لکھ کر ہندوستان کے ہندی رسالوں میں شائع کرادو اور اپنے اس مجموعہ کا ایک ہندی ایڈیشن بھی شائع کردو۔ اگر ہندی ادبیات اور نقادوں نے ان گیتوں کو اپنے اندر جذب کر لیا تو پھر ہم بھی گیتوں کو اردو کی ایک مستقل صنف تسلیم کرلیں گے۔ دیکھا آپ نے اس سوال سے کتنی نازک حقیقت برآمد ہوتی ہے؟ مگر یہ طے ہے کہ اس صداقت کے باوجود نگار کے یہ گیت اردو میں گیت کی روایت کی سب سے نمایاں اور گہری آواز ہیں، جو سچی بھی ہے اور معتبر بھی۔

اب رہا آخر میں یہ سوال کہ یہ گیت اردو کی مجموعی تخلیقی سطح پر کس مقام کے حامل ہیں تو تخلیقی عمل کا معاملہ یہ ہے کہ شاعر کا جیسا اور جس سطح کا جوہر ہوگا ویسا ہی اس کا تخلیقی معیار مقرر ہوگا۔ مجھے یہ کہنے میں کوئی باک نہیں ہے کہ باوجود اس کے کہ ہندی شاعری کی روایت میں گیت عورتوں کی زبان سے اس کی تہذیبی اور روحانی جہت کا اظہار ہیں مگر نگار کے یہاں یہ جہت اکثر اس جگہ ٹوٹی ہے جب شاعر نے اپنے ذاتی تجربے کے حوالے سے کوئی زندہ احساس نظم کر دیا ہے۔ لیکن نگار کے یہاں پچھلے دنوں جو بنیادی تبدیلی اپنے تہذیبی شعور کے حوالے سے آئی ہے اس کے لئے کم از کم آرزو لکھنوی کی سطح کے شاعر کی ضرورت تھی مگر نگار کے ساتھ اصل دشواری یہ ہے کہ اس کے نئے گیتوں کے تمام قابل تعریف پہلوؤں کا اعتراف کرنے کے باوجود یعنی گیتوں کی صنف میں پہلی بار مسلم شعور کی علامتوں سے منفرد کام لینے کے باوجود اس کے گیتوں کو محسن کا قصیدۂ لامیہ تو بڑی چیز ہے، آرزو لکھنوی کے گیتوں کے سامنے بھی نہیں رکھا جا سکتا۔

وجہ یہ ہے کہ وہ میراجیؔ کے گیتوں کی تخلیقی قدر و قیمت کے مقابلے پر بھی رہتی چھوٹی ہی شاعری ہے۔ بات یہ
ہے کہ تخلیقی جوہر دراصل وہ بھاری پتھر ہے جس کو چومنے سے ہمارے دور کے تمام چھوٹے بڑے شاعر
گھبراتے ہیں اور یہ اسی کا نتیجہ ہے کہ ذاتی پبلسٹی کرانے کا ہوکا بڑھتا ہی چلا جاتا ہے۔ خدا کا شکر ہے کہ نگار
کو یہ ہوکا نہیں ہے بلکہ وہ اپنا اتنا ہی حق طلب کرتا ہے جو اسے بلاشبہ اردو میں حاصل ہے اور حق
یہ ہے کہ مسلم طرز اور طرزِ احساس کے ساتھ عربی، فارسی اور اردو کا تہذیبی شعور گیتوں کو اس سے
زیادہ اہمیت اور معنویت دے بھی نہیں سکتا۔ اللہ بس باقی ہوس۔

نگار صہبائی

اُردو گیت کی پرکھ

اردو شاعری میں گیت کی صنف کا احیاء در اصل بیسویں صدی میں ہوا لیکن اس کے ڈانڈے ہندی زبان کے دوہوں سے ملے ہوئے ہیں۔ مثلاً کبیر کا یہ مشہور دوہا پڑھئیے:

کبیر سر پر سر لئے ہے کیوں سوئے سکھ چین
کوچ نگارا سانس کا باجت ہے دن رین

جب آپ آرزو لکھنوی کے گیت کا یہ شعر پڑھتے ہیں:

بجنے کو ہے کوچ نگارا
ہونا ہے سب سے چھٹکارا

تو ان دونوں میں اسلوب، الفاظ اور لہجے کے اعتبار سے آپ گہری مماثلت محسوس کرتے ہیں۔ یہی وہ اثرات ہیں جو اردو گیت نے قبول کئے۔ امیر خسرو نے جو گیت لکھے وہ حتمی طور پر اردو شاعری میں گیت کہلاتے ہیں اور ان کا ایک مخصوص مزاج ہے جو بیسویں صدی کے گیتوں میں کہیں نظر نہیں آتا۔ تاہم امیر خسرو کے ان گیتوں کو اردو شاعری میں گیت کا نقشِ اولین کہہ سکتے ہیں۔ لیکن یہ نقش اولین محض نقشِ اول اور نقشِ آخر بن کر رہ گیا۔ بیسویں صدی سے قبل کسی نے اس صنف کی طرف توجہ نہ کی، جس کے نتیجے میں اردو شاعری کی زرخیز زمین میں خسرو کے ہاتھوں لگایا ہوا گیت کا ہفت رنگ پودا آنے والے شعرا کی عدم توجہی کی ٹھنڈک میں ٹھٹھر کر رہ گیا۔ گویا امیر خسرو کی شاعری کا یہ حصہ اردو کی کلاسیکی شاعری کے عجائب گھر میں رکھی ہوئی قدیم اشیا میں شمار کیا جانے لگا۔

امیر خسرو کے بعد جو دوسرا بڑا نام ہمارے سامنے آیا وہ آرزو لکھنوی کا ہے۔ امیر خسرو اور آرزو لکھنوی کے درمیان نظیر اکبر آبادی کی نظمیں مثلاً ہولی، برسات کی بہاریں وغیرہ پڑھ کر گیت کی بو باس تو ملتی ہے

مگر انھیں گیت نہیں کہا جاسکتا۔ کم و بیش یہی بات عظمت اللہ خاں کے مجموعۂ کلام "سریلے بول" کے بارے میں بھی کہی جاسکتی ہے۔ عظمت اللہ خاں اگرچہ ہندی بحور کے علم سے بخوبی واقف تھے مگر سریلے بول کی موضوعاتی نظ کسی اعتبار سے بھی گیت کہلانے کی مستحق نہیں ہیں۔ ان کے بعد جو نام اردو شاعری میں گیت کے ناتے سے بہت مشہور ہوا اس کو میراجی کہتے ہیں۔ اس میں شاید حلقۂ ارباب ذوق کے پروپیگنڈے کو بہت زیادہ دخل ہے کہ میراجی نے ایک گیت کار کی حیثیت سے بہت شہرت پائی۔ چنڈی داس وغیرہ کے گیتوں کے اردو تراجم یقیناً ایک قابل قدر کارنامہ ہیں مگر میراجی کے طبع زاد گیتوں سے یہ پتا چلتا ہے کہ میراجی بھی عظمت اللہ خاں کی طرح گیت کے مزاج سے پوری طرح واقف نہیں تھے۔ میراجی کا صرف یہ ایک ٹکڑا بلاشبہ اردو گیت میں ایک اہم مقام رکھتا ہے:

کبھی آپ ہنسیں کبھی نین ہنسیں

کبھی نین کے بیچ ہنسے کجرا

شاید میراجی گیت کے بنیادی مزاج سے صرف اس ٹکڑے کی حد تک واقف تھے۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اردو گیت کے مزاج کی وضاحت کس طرح کی جائے؟ میراجی نے اپنے مضمون "گیت کیسے بنتے ہیں؟" میں لکھا ہے کہ "گیت چمپا کی کلیاں نہیں لاجونتی کے پھول ہیں۔ ہاتھ لگے اور مرجھائے۔ گیت کی چھاؤں بھٹک رس کی بیرن ہے۔ اگر آپ چاہتے ہیں کہ اس کا مزہ لیتے رہیں تو بات کو یہیں تک رہنے دیں۔ گیت سنیے، گیت گائیے"

میراجی کی مذکورہ بالا رائے کے تو معنی یہ ہوئے کہ گیت محض ایک ہلکی پھلکی صنفِ سخن ہے جو سطحی جذباتیت سے ایک قدم بھی آگے نہیں جاسکتی کیوں کہ گیت کی "چھان بھٹک میں" جو رس کی بیرن ہے "شعر کی علمی سنجیدہ" فکری سطح اور مابعد الطبیعات کی مختلف جہتوں کو کوئی دخل نہیں۔ دوسرے لفظوں میں گیت کی صنف کی ترقی کے تمام امکانات میراجی کی رائے کی روشنی میں ناپید ہو جاتے ہیں؛ جب کہ اردو گیت کے ارتقا میں آرزو لکھنوی نے جو کام کیا ہے وہ اردو شاعری کی تاریخ میں ایک انمول اضافہ ہے۔ آرزو لکھنوی نے گیت ... (SUBJECTIVE) شاعری سے معروضی (OBJECTIVE) شاعری کی ایسی نئی راہیں تلاش کی ہیں جن میں بیک وقت جہان بھٹک بھی ہے اور رس کا مزا بھی شامل ہے۔ آرزو لکھنوی کا نام اس لحاظ سے شاعری کی تاریخ میں ہمیشہ انمٹ حرفوں سے لکھا رہے گا کہ انھوں نے اردو شاعری کو ایک بھارتی

فراہم کی اور اردو شاعری کو گیت کا اعتبار عطا کیا۔ یہ بات یاد رہے کہ آرزو لکھنوی کے گیت جو بنیادی طور پر گائے جانے کے لئے لکھے گئے، جب پکّی روشنائی میں لکھے ہوئے نظر آئے تو پتا چلا کہ ان کے گیت گائیکی سے قطع نظر ایک ادبی و شعری جہت بھی لئے ہوئے ہیں۔ رس کا جو مزہ امیر خسرو اور آرزو لکھنوی کے ہاں علاوہ عظمت اللہ خاں اور میرا جی کے ہاں نہ مل سکا۔ یہ بات واضح ہے کہ حفیظ جالندھری اور اختر شیرانی وغیرہ نے گیت کے نام پر جو کچھ لکھا ہے اسے بہت اچھے نغمے تو کہہ سکتے ہیں گیت نہیں۔ سوال یہ ہے کہ امیر خسرو اور آرزو لکھنوی کے ہاں یہ رس کا مزہ کہاں سے آیا؟

اس کا جواب یہ ہے کہ امیر خسرو اور آرزو لکھنوی میں ایک بنیادی قدر مشترک بصورت غزل موجود تھی۔ میرا خیال ہے گیت کا مزاج بنانے میں ان کے رنگِ غزل نے نہ صرف اردو گیت کا مزاج پیدا کرنے میں ہاتھ بٹایا بلکہ اردو گیت کو لہجے کی ایک ایسی کھنک بھی عطا کی جس نے سچ مچ رس کا مزہ باندھا۔

غزل نے اردو کی ساری اصناف کو مالا مال کیا ہے۔ مثال کے طور پر اردو شاعری میں جہاں مثنوی نے ایک بلند مقام حاصل کیا وہاں مثنوی لکھنے والے سب کے سب شعرا بنیادی طور پر غزل گو تھے۔ یہی بات قصیدہ اور مرثیہ کے بارے میں بھی کہی جا سکتی ہے۔ دراصل یہ غزل کا کمالِ فن ہے کہ اس میں ہر قسم کا خیال باندھا جا سکتا ہے اور ہر طرح کی بات کہی جا سکتی ہے اور ان گنت لہجے بدلنے کے بعد بھی غزل غزل ہی رہتی ہے۔ اگر ہم امیر خسرو کی غزل کے دو ثانی مصرعوں کو ملا کر پڑھیں تو بات یوں بنتی ہے:

کسے پڑی ہے جو جا سناوے پیارے پی کو ہماری بتیاں
نہ نیند نیناں نہ انگ چیناں نہ آپ آویں نہ بھیجیں پتیاں

دیکھا آپ نے امیر خسرو کے ثانی مصرعوں کی اس نئی بندش سے غزل اور گیت کی ملی جلی ایک نئی کیفیت سامنے آئی۔ آرزو لکھنوی کی ایک غزل کا مطلع ہے:

گھر یہ تیرا اسرا نہ میرا ہے
رات دو رات کا بسیرا ہے

اس مطلع کو غزل سے الگ کر کے گیت کا ٹکڑا تصور کر لیا جائے تو آپ کو اس میں بیک وقت گیت کے رس کا مزا بھی ملتا ہے۔ اس بات سے پتا یہ چلا کہ اردو گیت کا رنگ روپ غزل سے بہت قریب ہے۔ یہ بات یوں بھی کہی جا سکتی ہے کہ غزل کا ایک انداز گیت سے بڑی حد تک مشابہت رکھتا ہے میں لینے

اس کلیہ اور تحقیق کے جواز میں مثال کے طور پر ناصر کاظمی کا ایک شعر پیش کرتا ہوں:

تیرے دھیان کی کشتی لے کر   میں نے دریا پار کیا تھا

ناصر کاظمی کے ہاں اس انداز کے بہت سے شعر ملتے ہیں جن میں غزل کی کیفیت اور گیت کے رس کا مزا آپس میں، اس قدر گھل مل گئے ہیں کہ خطِ تقسیم کھینچنا مشکل ہو جاتا ہے۔ اسی طرح کی مثالیں سراج اورنگ آبادی اور ولی دکنی کے ہاں بھی ملتی ہیں۔ اس طرح کے اشعار کے انتخاب میں ایک بات کا خیال خاص طور پر مد رکھا جائے کہ یہ سلیس اردو میں ہوں اور فارسی اور عربی کے الفاظ سے بے نیاز ہوں۔ اس سے یہ بات بھی سامنے آئی کہ گیت کا مزاج اور اس کے لب و لہجہ کو متعین کرنے میں سلیس اردو، رنگِ تغزل اور دھرتی سے رشتہ بیک وقت ضروری ہے اور اگر فارسی بحر کی جگہ ماتراؤں کے وزن پر لکھا جائے تو میرے خیال میں اردو گیت کی تعریف مکمل ہو جاتی ہے۔

آرزو لکھنوی کے گیتوں میں سلیس اردو جس میں بھاشا کے لفظوں کا استعمال، غزل کی چاشنی اور ماتراؤں میں لکھے ہوئے شعر اردو گیت کے مزاج کو نہ صرف مستحکم کرتے ہیں بلکہ سچ بات تو یہ ہے کہ آرزو لکھنوی کے ان گیتوں نے اردو شاعری میں ایک مضبوط علمی، ادبی اور فکر سے بھرپور صنف کا اضافہ کیا جسے ہم اردو گیت کہتے ہیں۔ پھر ان گیتوں کی جو موسیقی ترتیب دی گئی اور جس طرح انھیں اپنے وقت کے گانے والوں نے گا دیا ان کی مثال آج تک نہ مل سکی۔ میرے بزرگ اور نقاد حضرات اس بات سے بخوبی واقف ہیں کہ پنکج ملک، کندن لال سہگل اور کانن دیوی نے گیت کی گائیکی میں جو مقام حاصل کیا اس میں آرزو صاحب کے گیتوں کو موسیقار سے کہیں زیادہ دخل ہے۔ آرزو لکھنوی نے اگرچہ بیشتر گیت فلموں کے لئے لکھے لیکن آگے چل کر ان کا ان گیتوں کو یک جا کر کے اپنے رسالے "المسینی" بمبئی میں چھاپ دینا اس بات کا ثبوت فراہم کرتا ہے کہ آرزو صاحب فلموں کے لئے لکھے جانے والے ان گیتوں کی علمی، ادبی اور شاعرانہ نوعیت سے خوب واقف تھے، ورنہ آج کی دنیا میں فلمی گیتوں کی جو سطح ہے وہ سب جانتے ہیں۔

اگر ایک طرف میرا جی نے گیت کو داخلی (SUBJECTIVE) شاعری کا حصہ بنایا ہے (جو کہ بلاشبہ بنیادی طور پر درست ہے) وہاں کم و بیش اسی عرصے میں دوسری طرف آرزو لکھنوی نے گیت کے بے مثال معروضی (OBJECTIVE) پہلو اجاگر کر کے اردو گیت کو بڑے امکانات اور بڑی وسعتوں

سے مالامال کیا۔ مگر افسوس کہ ان کے اس کارنامے پر اردو ادب کے نقادوں کی نظر نہیں گئی اور بالخصوص ان اہل علم کی کور چشمی پر مبنی آتی ہے جنھوں نے جس سلسلے پر بھی اردو گیت پر تحقیقی کام کیا ہے وہ صرف آرزو لکھنوی کا نام لکھ کر گذر گئے ہیں۔ ان کے گیتوں کو زیر بحث لانے کی یا تو جرأت نہ کر سکے یا پھر نظر انداز کر گئے۔

لہٰذا میں اب آرزو لکھنوی کے گیتوں پر بات کرنا چاہتا ہوں اور ان کے گیتوں کے وہ جواہر لوگوں پر کھولنا چاہتا ہوں جو وقت کی دھول میں کہیں دب کر رہ گئے ہیں۔ گیت کی ایک بنیادی روایت، جو لوک گیتوں سے بھی منتقل ہوئی، برہا کے دکھ اور گھائل ہردے کی روایت ہے اور روایت گیت کی جذباتی شاعری کا اہم ترین حصہ ہے۔ آرزو لکھنوی نے اس روایت کو شاید اس لئے بدلے نام برتا کہ وہ اردو گیت کی معروضی (OBJECTIVE) شاعری کو برت کر گیت کو نئے امکانات سے روشناس کرانا چاہتے تھے۔ ان کے برعکس میراجی نے اس روایت کو برتنے کی اچھی کوشش کی ہے وہ کہتے ہیں:

برکھا کے لاکھوں ہیں تیر دل پر کس کو سہوں
ٹھنڈ سے کانپے سر پر اب تو چپ نہ رہوں

یوں محسوس ہوتا ہے کہ میراجی کے ہاں گیت کی ایک ادبی جہت تو مرتب ہو رہی تھی لیکن اس سے آگے وسیع تر امکانات کا کوئی راستہ سجھائی نہیں دیتا تھا۔ آرزو لکھنوی اس بات سے متفق نہیں تھے اور اس کا ثبوت ان کے کئی گیتوں سے ملتا ہے۔ جیسا کہ ڈاکٹر وزیر آغا نے کہا ہے کہ گیت میں بعض اوقات تذکیر و تانیث سے بے اعتنائی برتی گئی ہے "یوں لگتا ہے کہ آرزو صاحب کا بالخصوص گیت لکھنے میں یہی رویہ رہا ہے۔ اسے حسن اتفاق کہئے یا میری خوش نصیبی کہ جب آرزو صاحب نیو تھیٹرز کی فلموں کے لئے گیت لکھ رہے تھے اس وقت میں ہندوستان کی سیاسی کشمکش کا اہم معنوں میں ایک حصہ تھا کہ میں نے ہائی اسکول میں قدم رکھا تھا اور اس زمانے کے ہر طالب علم کی طرح میں بھی ہندوستان میں جو آزادی کی باڑھ بڑھ رہی تھی اس سے خوب واقف تھا۔ آرزو لکھنوی نے ہی اس سیاسی شعور کا اپنے گیتوں کے توسط سے حق ادا کیا اور ان کا کمال فن یہ تھا کہ سینما ہال میں بیٹھے ہوئے ناظر کے ذہن میں، اس فلم میں گیت کے محل و تنوع سے قطع نظر، اس کے بول اور اس کے مصرعوں سے ایک سیاسی احساس اور ایک سیاسی شعور بیدار ہوتا تھا۔ فلم "ڈاکٹر" کا ایک گیت

ہے ؎

کب تک نراشش کی اندھیاری

کجری نین کی بھور کو سمجھو
کارے نین کی جوتی
جگنو بن کر چمک رہی ہے
چھپی ہوئی اجیاری

دیکھو بھئی جگت اجیاری
بن گئی کاجل جاگی آنکھ کا
سمٹ کے رین اندھیاری

بیداری کے لیے جاگی آنکھ کی علامت اور غلامی کے دور کو ختم ہوتا ہوا دیکھ کر جو امید بندھی تھی، اس امید کو جگنو کی علامت اور آنے والی آزادی کو چھپی ہوئی اجیاری لکھ کر آرزو صاحب نے گیت کو ایک نئی سمت سے روشناس کرایا۔

چونکہ آرزو اردو زبان کے شاعر تھے اور اپنی زبان کا طرۂ امتیاز گیت بھی قائم رکھنا چاہتے تھے، اس کے پیشِ نظر انھوں نے کہیں کہیں شعوری کام بھی دکھایا ہے۔ مثلاً فلم "ڈاکٹر" میں ان کا مشہور گیت 'آئی بہار' زبانِ زدِ خاص و عام ہوا۔ اس کا آخری بند درج ذیل ہے:

کس نے ان کے اوپر چھڑکی
رنگ روپ کی مایا

آرزو صاحب کے گیتوں میں ایک نمایاں فرق جو میں نے محسوس کیا وہ ان کا وہ حوصلہ تھا جس نے انھیں زندگی کرنے کا فن دیا اور وہ کبھی مایوس نہیں ہوئے۔ انھوں نے اپنے گیتوں میں زندگی کو ایک نئے موڑ کا احساس بھی دیا اور قدرت کے ہاتھوں بندے کی مجبوری کو بھی نہیں بھولے:

قدم قدم پہ آشا اپنا
روپ انوپ دکھاتی ہے
بگڑے کاج بناتی ہے
دھیرج کے گیت سناتی ہے
اس کا سُر مصری سے میٹھا
اس کی تان رسیلی بابا
دنیا رنگ رنگیلی

بیا

دیا جلے پھر سے بجھ جائے
رات اندھیری جائے دن آئے
مٹتی آس ہے جوت انکھین کی
سمجھو گئی تو گئی
کھو نہ آس نراس بھی
جب نہ کسی نے راہ سُجھائی
دل سے اک آواز یہ آئی
ہمت باندھ سنبھل بڑھ آگے
روک نہیں ہے کوئی
کھو نہ آس نراس بھی

جب اللہ تعالیٰ کی حمد وثنا بیان کرنے پر آتے ہیں تو آرزو کے قلم سے گیت ایک نئے بھاؤ سے صفحہ پر اُترا ہے۔ اس کا مکھڑا اور ایک بند ملاحظہ ہو:

کس نے یہ سب ساز سجایا
کس نے یہ سب کھیل کھلایا
اپنے آپ سبھی کچھ کر کے

اپنے آپ چھپایا
کومل کومل پیارے پودے
دھان پان متولے پودے
آج پھولوں کا بلبل سے بیاہ ہونے کو ہے
آج تھالوں میں صندل آنے کو ہے
آج پیالوں میں اُبٹن آنے کو ہے
آؤ ترانے چھیڑیں نئے
آؤ مل جل کے گانے گائیں نئے
آؤ شادی رچائیں تو ہم سب ملیں
ہے یہ شادی نئی
آؤ دنیا بدلنے کا دن آگیا

اُبٹن کا قافیہ چندن لکھا جا سکتا تھا اور صندل ہی کے معنی میں لکھا جاتا لیکن آرزو لکھنوی صاحب نے صندل رکھا۔ اس بند میں مصرعوں کے اتار چڑھاؤ بھی اپنے اندر چھپی ہوئی موسیقی کا پتا دیتے ہیں۔

یہ اس زمانے کی بات ہے جب مولانا ابوالکلام آزاد احمد نگر کی جیل میں زیر حراست تھے۔ آرزو صاحب نے اس صورت سے اس طرح فائدہ اٹھایا کہ فلم "دشمن" میں محل وقوع کے اعتبار سے جو گیت لکھا اس نے ناظرین کے ذہن احمد نگر کی جیل کے طرف پھیر دیئے۔ ملاحظہ ہو:

پیاری پیاری صورت تو
موہ بھری مورت تو
دیس سے پردیس میں
تمرا سندیسہ آئے ہے
تن کہیں من کہیں

جیسا کھنچا جاتے ہے

مدد کرو مدد کرو

ہاں وہی گُن رس بھری جیسے

باجے بانسری

کانوں میں لے کر سن لیں

نیند سے چونکائے ہے

دیس سے ہم دور ہیں

آنے سے مجبور ہیں

مدد کرو

مدد بنا کیسے پہنچ پائیں گے

ان کے ہاں زندگی خوشیوں سے مالا مال تھی اور تعمیر کے نت نئے پہلو ان کے گیت تراشتے رہتے تھے:

ہر پل نئی بہار

دیکھو جگت سنگھار

کھلی کلی مُرجھا کے ہنسی

بندھی کلی مُسکائی

پریت کی ریت نبھانا سیکھو

بگڑے کام بنانا سیکھو

ڈار سے ڈار لپٹ کر جھومی

کر کے پریم سگائی

کاہے کو راڑ مچائی

من کی اُمنگ ترنگ چڑھی

انکھین کی جوت بڑھی
پریم لگن سے لَو اٹھی
نیچھے دیتے پیارے
ہٹ گئی لو کالی گھٹا
چمک رہے تارے

آرزو کے ہاں مقصدیت سے بھرپور شعر گیت کے روپ میں جس طرح ظاہر ہوئے ہیں ان میں آشا، جیون، سندیس، باٹ اور اسی قسم کے الفاظ نت نئے انداز سے استعمال ہوتے ہیں۔

کون دیس ہے جانا بابو
کون دیس ہے جانا
سورج ڈوبا، چاند نہ نکلا
بیتا سماں سہانا
رات اندھیری باٹ نہ سوجھے
سمجھ کے پاؤں بڑھانا

اس نگری کی ڈگر ڈگر میں
لاکھوں ہیں جنجال
سختی نرمی سردی گرمی
اک سانچے میں ڈھال
جگ میں چلے کون کی چال

کہیں کہیں تو آرزو لکھنوی کا گیت ڈھب کے اعتبار سے غزل سے بہت قریب تر ہو گیا ہے:

یہ کون آج آیا سویرے سویرے
کہ دل چونک اٹھا سویرے سویرے
کہا روپ نے چاند ہے چودھویں کا
مگر چاند کیسا سویرے سویرے
گیا من کا دھیرج بڑھی بے کلی بھی
یہ مجھ کو ہوا کیا سویرے سویرے

رنگِ تغزل میں سمویا ہوا یہ گیت اپنے روپ رس کے اعتبار سے بہرحال گیت کہلاتا ہے اور بات وہیں تک لوٹ کر جاتی ہے کہ اردو گیت بہرحال کسی نہ کسی عنوان رنگِ تغزل کا اور ایک حد تک اس کے لب ولہجہ کا مرہونِ منت ہے۔

اگر آرزو لکھنوی نے یہ گیت نہ لکھے ہوتے تو اردو گیت نے آج جو استحکام پایا ہے اور اردو شاعری میں ایک مستحکم اور مستقل صنفِ سخن کے درجہ پر فائز ہے' وہ اسے میسر نہ آتا۔ لیکن میں اس کو کیا کروں کہ شمیم احمد گیت کو ایک پرانی صنف بتاتے ہیں جس کی متحمل اردو شاعری نہیں ہو سکتی۔ آرزو لکھنوی کے گیتوں کے پیشِ نظر کیا ہم اس بات کو تسلیم کر سکتے ہیں؟

آرزو لکھنوی

آرزو کے ۱۲ گیت

۱

جیون بین مدھر نا باجے
بین کے جھوٹے پڑ گئے تار

گونج اٹھے سنسار
بین کے جھوٹے پڑ گئے تار

بگڑے ٹھاٹھ سے کام بنے کیا
میگھ بجے نہ ملہار
پنچم چھیڑو مدھم بولے
کھرج بنے گندھار
بین کے جھوٹے پڑ گئے تار

بجنے کو کوُچ نگارا
ہونا ہے سب سے چھٹکارا
جو ہے اپنا اُسے سمجھ لے
وہ بھی نہیں ہمارا

۲

اِن تاروں کو کھولو
اِن تربوں کو پھینکو پھینکو
اِن تاروں کو کھولو

یہ کیسا انّیائے داتا
یہ کیسا انّیائے

اُتّم تار نئی تربیں ہوں
سب ہوں نیا سنگھار
جس پردے سے جو سُر بولے

میرا بنتا کام بگڑ کر
بگڑا کام بنائے
یہ کیسا انّیائے

دُکھ جھیلیں جب سُکھ کے کارن
وہ سکھ بھی چھن جائے
جیسے اپنے دیئے کی جوتی
دوجے کے گھر جائے
یہ کیسا انیائے

میں بھی یونہی جما رہوں گا
کیسا ہی طوفان آئے
گھاٹ کا پتھّر ہل نہیں سکتا
لاکھ تھپیڑے کھائے
کبھی تو دُکھ کو سُکھ کر دے گا
انّبا ہی کا نیائے
اندھا تو جب ہی پتیائے
جب دو آنکھیں پائے
داتا

۳

کب تک نراشس کی اندھیاری

آس کا دامن دم کا دے گی
یہی بدریا کاری

سوکھے پیڑ کی ٹار ڈار ہے

اس کی بھری پچکاری
جیسے لاج کا گھونگھٹ کاڑھے
کوئی سندر ناری

کجری رین کی بھور کو سمجھو
کارے نین کی جوتی
جگنو بن کر چمک رہی ہے
چھپی ہوئی اُجیاری

دیکھو بھئی جگت اُجیاری
بن گئی کاجل جاگی آنکھ کا
سمٹ کے رین اندھیاری
بھئی جگت اُجیاری

نین جل سے سینچا تھا جس کو
ہری ہوئی وہ کیاری
بگڑی بنانے والے تو نے
رکھ لی لاج ہماری
بھئی جگت اُجیاری

۴

کس نے یہ سب ساز سجایا
کس نے یہ سب کھیل کھلایا

اپنے آپ سبھی کچھ کر کے
اپنے آپ چھپایا

کومل کومل پیارے پودے
دھان پان متوالے پودے
کس نے ان کے اوپر چھڑکی
رنگ روپ کی مایا
اپنے آپ سبھی کچھ کر کے
اپنے آپ چھپایا

اندھیارے میں سوتے تھے یہ
بے کل بے خود ہوتے تھے یہ
نیند پری کے ان ماتوں کو
نیند سے آن جگایا
اپنے آپ سبھی کچھ کر کے
اپنے آپ چھپایا

ہر بھرا گلزار کھلا ہے
سرسوں کا بازار لگا ہے
دیکھ دیکھ من میں سکھ ہووت
انکھین نور سمایا
اپنے آپ سبھی کچھ کر کے
اپنے آپ چھپایا

۵

دنیا رنگ رنگیلی بابا
دنیا رنگ رنگیلی

یہ دنیا اک سندر بگیا
شوبھا اس کی نیاری ہے
ہر ڈالی پر جادو چھایا
ہر ڈالی متوالی ہے
ادھر ادھر پنچھی پھول منوہر
کلی کلی چٹکیلی بابا

قدم قدم پر آشا اپنا
روپ انوپ دکھاتی ہے
بگڑے کاج بناتی ہے
دھیرج کے گیت سناتی ہے
اس کا سُر مصری سے میٹھا
اس کی تان رسیلی بابا

دکھ کی ندیا جیون نیّا
آشا کے پتوار لگے
او نیّا کے کھینے والے
نیّا توری پار لگے

پار بسنت ہے دیش سنہرا
قسمت چھیل چھبیلی بابا

۶

چلے پون کی چال
جگ میں چلے پون کی چال

یہی چلن ہے جگ سیوا کا
یہی جیون سکھ پال
جگ میں چلے پون کی چال

اس نگری کی ڈگر ڈگر میں
لاکھوں ہیں جنجال
سختی نرمی سردی گرمی
اک سانچے میں ڈھال
جگ میں چلے پون کی چال

دکھ کا ناشں ہو
سکھ کا پالن
دونوں بوجھ سنبھال
چبھتے کانٹے پس پس جاویں
پھول نہ ہوں پامال
کٹ نہ سکے یہ لمبا رستہ
کٹے ہزاروں سال
جہاں پہنچنے پر دم ٹوٹے
ہے وہی کمال کال
جگ میں چلے پون کی چال

۷

یہ کون آج آیا سویرے سویرے
کہ دل چونک اٹھا سویرے سویرے

کہا روپ نے چاند ہے چودھویں کا
مگر چاند کیسا سویرے سویرے

گیا من کا دھیرج
بڑھی بے کلی بھی
یہ مجھ کو ہوا کیا سویرے سویرے

آتے ہی ایک طرحدار نے دل چھین لیا
دلربا پن کے دل آزار نے دل چھین لیا
بانکی چتون کے چھپے پیار نے دل چھین لیا
دے کے دھوکا کسی عیار نے دل چھین لیا
آنکھوں میں جادو باتوں میں ٹونا
دیا کیسا چرکا سویرے سویرے
یہ کون آج آیا سویرے سویرے

۸

پریت میں ہے جیون جوکھوں
کہ جیسے کولہو میں سرسوں

بھور سہانی چنچل بالک
لڑکائیں دکھلائے
ہاتھ سے بیٹھا گڑھے کھلونے
پاؤں سے توڑت جائے
وہ تو ہے اک مورکھ بالک
تو تو نہیں نادان
آپ بنائے آپ بگاڑے
یہ نہیں تیری شان

۹

تم بن کل نہ آئے موہے
کچھو ناہی سہاوے بھاوے
کٹھن ڈگر کا پیڑ کہ جیسے
کٹھن ڈگر کا پیڑ
دیا کے پھول لٹاوے
کڑی دھوپ لے سر پر اپنے
چھاؤں میں سب کو بٹھاوے
وہی پیڑ جب جل بن سوکھے
کیسے دیکھا جاوے
نیائی آنکھ بہائے آنسو
کومل من کمہلائے
تم بن کل نہ آوے

۱۰

مہک رہی پھلواری
ہمری

کیسی کیسی چلی ہوائیں
پھول اور پھل بکھرائے
من آشا کا پیڑ سکھایا
دکھ پر دکھ پہنچائے
میرا بنتا کام نہ بگڑا
موت بھی تھک کے ہاری
مہک رہی پھلواری

سکھ کے بادل گھر گھر آئے
بگڑا کام بنایا
جیون جل نے برس برس کے
گیا سمے پلٹایا
پھر سے مہکی پھر سے لہکی
سوکھی ہوئی ہر کیاری

مہک رہی پھلواری
ہمری

۱۱

مدھ بھری مدھ بھری متواری
پھلواری
کیا نیاری
چمکے بجلی رین اُجری
چھائی بدریا کاری

بن شام چپ ہو نہ پاوے
شام پیاری
سکھی رو ٹھے شام پیارے
دیکھو ایک نہ مانے
مانے نہ بات ہماری
سکھی رو ٹھے شام پیارے
کو جانے سمجھائے

منا لائے رے
نہ مانے جیارا
کوئی جائے سمجھائے
تم بن پل چھن چین نہ آوے
بنتی کرت میں ہاری

۱۲

سندر ناری پریم پیاری
پیاری چھب دکھلائے

نینا رسیلے بانکے سجیلے
ٹھیری نین لڑائے

اک تو برہا اگن ستائے
دوجے لاگی جلائے
موہ بھرا من پھول کمل کا
دھوپ لگے کمہلائے

فخری بھوپالی

روپ متی، باز بہادر

روپ متی اور باز بہادر کی داستانِ محبت محض افسانہ و افسوں نہیں، عہدِ اکبری کا ایک تاریخی واقعہ ہے!

باز بہادر کا نام بازید خاں (یا یزید خاں) تھا، وہ شیر شاہ سوری کا ہم خاندان اور مالوے کے صوبیدار شجاعت خاں کا بیٹا تھا۔ وجیہہ، شجاع، علوم فنون حرب و ضرب میں ماہر اور بقول ابوالفضل فنِ موسیقی میں یکتائے روزگار۔ "سارنگ پور" اسے جاگیر میں ملا تھا۔ وہاں ایک برہمن جادو رائے اس کا دوست تھا۔ ایک بار اس نے باز بہادر کی دعوت کی اور اسی موقع پر اسے روپ متی کے کمالات دیکھنے کا موقع ملا جو جادو رائے کی بیٹی تھی۔ وہ مبہوت ہو گیا اس نے محسوس کیا کہ وہ کوئی غیر ارضی اپسرائی مخلوق ہے جس کے رقص میں ماورائیت اور آواز کے لوچ میں آسمانی صباحت و لطافت ہے: وہ روپ متی پر فریفتہ ہو گیا، لیکن باپ کی حیات میں وہ اسے حاصل کرنے کی جسارت نہ کر سکا۔

شجاعت خاں کی وفات کے بعد جب وہ مالوے کا صوبیدار بنا تو اس نے روپ متی کو حاصل کرنے کے لئے سلسلہ جنبانی کی۔ برہمن جادو رائے کو سارنگ پور کی جاگیر دے کر ہموار کیا اور پھر روپ متی کو حرم میں لے آیا۔

روپ متی کے وجود میں لکشمی اور سرسوتی دونوں کا امتزاج تھا، باز بہادر اس میں کھو گیا اور خود روپ متی نے باز بہادر کو کیا پایا گویا سنگیت کی روح پالی: مالوے کی پہاڑی کا ایک ایک پتھر باز بہادر اور روپ متی کے دلوں کی دھڑکن کے ساتھ موسیقی کی مدھر تانوں سے دھڑکنے لگا۔ مالوے پر نکھار آ گیا۔ مالوے کی راتیں اور بھی چمک اٹھیں۔

مالوے میں امن تھا۔ رعایا خوشحال تھی لیکن اکبر مغلیہ سلطنت کی توسیع کا خواہشمند تھا۔ مالوہ پر

ایک مدت سے اس کی نظر تھی۔ بالآخر اپنے دودھ شریک بھائی ادہم خاں کی سرکردگی میں مالوہ فتح کرنے کے لئے ایک فوج بھیجی۔ باز بہادر پامردی سے لڑا لیکن شکست ہوئی۔ وہ بھاگ کر خاندیش پہنچا اور تھوڑے عرصہ بعد عقاب کی طرح مغل افواج پر جھپٹا۔ اس مرتبہ بھی اسے فرار ہونا پڑا، لیکن اس نے ہمت نہ ہاری۔ برار اور اسیرگڑھ کے حاکم طفیل خاں کے ساتھ مل کر تیسری مرتبہ اس نے مغلوں پر حملہ کیا اور انہیں مالوہ خالی کر دینے پر مجبور کر دیا۔

ادھر مانڈو پر ادہم خاں قبضہ کرنے کے بعد رعایا پر ظلم و ستم توڑ رہا تھا۔ روپ متی اپنے محل میں نظر بند تھی۔ ادہم خاں اس کے حسن کی تعریف سن چکا تھا اور اسے اپنے حرم میں لانے کے منصوبے بنا رہا تھا۔ روپ متی حقارت سے اس کے پیام کو ٹھکرا چکی تھی۔ لیکن اسے خوف تھا کہ یہاں اس کی عزت و آبرو محفوظ نہیں ہے۔ لہٰذا ایک دن موقع پاکر اور مردانہ بھیس بدل کر اپنے آبائی گاؤں "سارنگ پور" فرار ہو گئی۔ روپ متی کا باپ مر چکا تھا، چچا نے جب روپ متی کے مصیبت کا حال سنا تو اس کے بھائیوں کو جمع کر کے روپ متی کی مدد کے لئے بھیجا۔ ادھر ادہم خاں کو جب روپ متی کے فرار کی خبر ملی تو اس نے ایک لشکر اس کی تلاش میں بھیجا۔ سارنگ پور سے بیس میل دور روپ متی ایک گاؤں میں پناہ لئے ہوئے تھی کہ وہاں ادہم خاں کا بھیجا ہوا لشکر روپ متی کی ٹوہ لیتا ہوا آ پہنچا۔ روپ متی کے بھائی بھی وہاں آ پہنچے دونوں کے درمیان گھمسان کا رن پڑا۔ روپ متی کے تمام بھائی مارے گئے۔ روپ متی مانڈو لائی گئی۔ ـــــ ادہم خاں نے اسے پھر شادی کا پیغام دیا جسے اس نے ٹھکراتے ہوئے کہا کہ "میں باز بہادر کی بن چکی ہوں! اب کسی اور کی ہرگز نہیں بن سکتی۔" ادہم خاں نہ مانا۔ اصرار کے بعد سختیاں شروع کیں۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ روپ متی نے ہیرے کی کنی چاٹ کر خودکشی کر لی اور اس طرح ایک باوفا اور پتی ورتا بیوی کی حیثیت سے زندۂ جاوید ہو گئی۔

روپ متی کے گیتوں کا خام مواد بھی ایام ہجر ہیں جب وہ باز بہادر سے جدا ہو کر نہ صرف فراقِ یار بلکہ ایک ظالم اور حریص فاتح کے مظالم کا شکار ہوئی اور تمام مصائب اور مشکلات کے باوجود اس نے اعلیٰ کردار کا مظاہرہ کیا۔

جہاں تک روپ متی کے گیتوں کا تعلق ہے تو ان کے متعلق صرف یہ کہنا ہے کہ میرا ترجمہ کرمپ کے انگریزی ترجمہ سے ماخوذ ہے۔ کرمپ کا بیان ہے کہ اس نے یہ گیت خود روپ متی کے مولد سارنگ پور واقع سابق ریاست دیواس (وسط ہند) کے قدیم برہمن خاندانوں سے حاصل کئے ہیں۔ وہ لکھتا ہے کہ اس بات پر تو تمام مورخ متفق

ہیں کہ وہ ایک بہترین مغنیہ اور شاعرہ تھی۔ ساتھ ہی اسے فن رقص میں بھی کمال حاصل تھا۔ موسیقی میں اس کی مہارت کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ آج بھی بھوپ کلیاں راگنی کی ایجاد اس سے منسوب کی جاتی ہے۔ فرشتہ، ابوالفضل، ماثرالامراء کا مصنف اور احمد العمری اس کی ان خصوصیات کو تسلیم کرتے ہیں۔ علاوہ حسن و جمال کے اس کی انہیں خصوصیات کی وجہ سے باز بہادر جو خود بھی موسیقی میں کمال رکھتا تھا اس سے بے انتہا محبت کرتا تھا۔ احمد العمری کے قول کے مطابق وہ برہمن زادی تھی اور اس لئے اسے رقص و موسیقی سے فطری مناسبت تھی۔ ان دونوں چیزوں کا فن شعر سے گہرا تعلق ہے۔ چنانچہ یہ بات بعید از قیاس نہیں کہ رقص و موسیقی کے ساتھ اس نے شعر کہنے کی مہارت بھی پیدا کی ہو۔ اگر روپ متی کا برہمن زادی ہونا تسلیم کر لیا جائے تو خود یہ بات بھی کچھ کم اہمیت نہیں رکھتی کہ یہ گیت خود اس کے مولد سارنگ پور کے قدیم برہمن خاندانوں سے حاصل کئے گئے ہیں۔ یہ بھی ایک طرح سے ان کی صحت کا ثبوت ہے۔ کرمپ کے قول کے مطابق یہ گیت ان برہمنوں کے پاس قدیم مخطوطات کی صورت میں ملے تھے اور یہ کہ ان مخطوطات کی حالت اور جن لوگوں کے پاس سے وہ دستیاب ہوئے ان کی عمر کو دیکھتے ہوئے یہ گیت تقریباً دو ڈھائی سو برس پہلے کے تحریر شدہ معلوم ہوتے تھے۔

ان گیتوں کے علاوہ کرمپ نے اپنی کتاب میں دو دوہے اور شامل کئے ہیں جو انگریزی کی دوسری کتابوں سے حاصل کئے گئے ہیں۔

پہلا دوہا۔ تاریخ مانڈو (HISTORY of MANDU) کے نوٹ نمبر ۳۶ صفحہ نمبر ۷۹ پر درج ہے۔

اور دوسرا کرنل لارڈ کی کتاب (DHAR and MANDU) کے صفحات ۲۲، ۲۳ پر ہے۔ خود یہ دونوں دوہے کننگھم کی کتاب سے حاصل کئے گئے ہیں۔

کرمپ آگے چل کر لکھتا ہے کہ یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ آج بھی مالوے کے اکثر موسیقار روپ متی کے گیت گاتے ہیں؛ انہیں میں سے بعض ایسے بھی ہیں جن کا خاندان دھار کے پوار حکمرانوں سے وابستہ رہا ہے اور وہ موسیقی میں وہی کمال رکھتے ہیں جو ان کے آباؤ اجداد کو حاصل تھا۔ گویا یہ عین ممکن ہے کہ روپ متی کے گیت انہیں سینہ بہ سینہ پہنچے ہوں۔ کرمپ البتہ ان گیتوں پر کسی قدر شبہ کا اظہار کرتا ہے جو ادہم خاں کو مخاطب کر کے کہے گئے ہیں یا جن میں اس کی مذمت کی گئی ہے۔ ایسے

گیتوں میں جذبات سے زیادہ عالمانہ شان نمایاں ہے۔

گریب نے جو گیت دیئے ہیں ان کی تعداد ۲۶ ہے۔ ان میں سے پہلا گیت جو ۲۹ دوہوں پر مشتمل ہے، اگر ان کو علیحدہ علیحدہ شمار کیا جائے تو کل گیتوں کی تعداد ۵۴ بنتی ہے۔ ان مذکورہ ۲۹ دوہوں کو گریب نے ایک خط کا عنوان دیا ہے جو اس کے بقول "روپ متی نے باز بہادر کو مخاطب کرتے لکھا ہے۔" میں نے ہر دوہے کو چار چار مصرعوں کی صورت دے دی ہے۔

ان گیتوں کا سوز و گداز، جذبات کی شدت، اظہار کی بے ساختگی اور احساس کی لطافت آج بھی ہمارے دامنِ دل کو اپنی طرف کھینچتی ہے۔

روپ متی کے گیت

اشک ٹپکے میری آنکھوں سے جو خط لکھتے ہوئے — گیلے کاغذ پہ سیاہی کے ہیں دھبے بکھرے
دکھ کی گھنگھور گھٹا چھائی ہوئی ہے سر پر — بات سوجھے تو کہاں سوچ کہاں سے نکھرے

کاش یہ گر مجھے آغاز میں ہوتا معلوم — کاش اک ضرب سے ہو جاتا مرا قصہ تمام
ایسے جینے سے تو سو بار مجھے موت بھلی — ایک پل بھی مرے دل کو نہیں ملتا آرام

کوسنے دیتا ہے دن رات مرا دل مجھ کو — میں نے کیوں جانے دیا تھا تجھے کیوں جانے دیا
واپس آ جا مرے پہلو میں تو ایک بار فقط — پھر میں دیکھوں گی تو کس طرح سے جاتا ہے بھلا

مرا معصوم مرا پھول سا نازک ہرنی — برہ کی آگ کے شعلوں کی اسے تاب کہاں
اس ستی پر مجھے کیوں رشک نہ آئے لوگو — اپنے شوہر کی چتا میں جسے مل جائے اماں

کوئی آفت کبھی آتی نہیں سر پر تنہا
دل نہیں دل کوئی مہمان سرا ہے شاید
آدھمکتے ہیں دبے پاؤں کئی اور بھی غم
یا کوئی درد کا پُل یا کوئی شہ راہِ الم

ذہن مدت سے ہے جولاں گہِ اندوہ و الم
حکمراں عشق ہے اور ایسا طبیعت کا کٹھور
دل ہے ٹکسالِ مصائب کی تو فتنہ ہے جگر
پیار مانگو تو عطا کرتا ہے غم کی ٹھوکر

دن ہو جب تک نہیں کھلتے درِ دل پوری طرح
کاش اب نیند نہ آئے مری آنکھوں میں کبھی
رات آتی ہے تو کھلتے ہیں گلِ راز و نیاز
کاش تا مرگ رہیں تیرے تصور میں یہ باز

آنکھوں آنکھوں ہی میں کٹ جاتی ہے ہر رات مری
یاد آتی ہے تو کیا کیا نہ ستاتی ہے مجھے
نیند کیا آئے مرے پاس نہ ہو تو جب تک
تیری آغوش کی گرمی، تیرے بوسے کی تھپک

لے گیا چھین کے تو مجھ سے مرے دل کا سکوں
صبح ہوتی ہے تو دبتی ہے کوئی تازہ خلش
میرا سرمایہ اگر ہے تو فقط رنج و محن
رات آتی ہے تو لاتی ہے نئی کوئی چبھن

تو ہی جیون تھا مرا، تو ہی دل و جاں تھا مرا
سانس باقی ہے بدن میں تری یادوں کے طفیل
موت تجھ بن نظر آتی ہے بہر سو مجھ کو
جان ہی جاتی رہے میری اگر یہ بھی ۔

خط تو لکھوں میں تجھے ہائے مگر کیا لکھوں
دل کی باتوں کو کوئی دل ہی سمجھ سکتا ہے
ترجماں دل کا نہیں ملتا کوئی لفظ مجھے
بوجھ لے تو مرا سندیس بنا میرے کہے

جو سمجھ دار ہے کیا اس کو بتائے کوئی
جو نہ جانے اسے سمجھانے سے بھی کیا حاصل
جاننے والے سے کچھ کہنا نہ کہنا ہے سو
لاکھ سر مارو مگر اس کی سمجھ ہے محدود۔

خط کے لکھنے کا ارادہ جو کبھی کرتی ہوں
میرے دل میں مری نس نس میں تو ہی تو ہے بسا
سوچتی ہوں کہ لکھوں بھی تو تجھے کیا لکھوں
کیوں نہ چپ چاپ میں دل ہی میں تجھے یاد کروں

اسی محبوب کو لکھتا ہے کوئی خط عاشق
جو بچھڑ کر کہیں پردیس گیا ہو اس سے
میرا دل ہی ترا گھر ہے تو کہیں اور نہیں
اتنے نزدیک ہو جو، خط اسے کیا کوئی لکھے

خط کے لکھنے کی ضرورت تو نہیں ہے مجھ کو
باوجود اس کے اگر میں کبھی لکھنے بیٹھی
جی میں آتا ہے کہ لکھتی رہوں لکھتی ہی رہوں
پھر جو دیکھوں تو ہے کاغذ پہ بس اک آہ کھنچی

جانتی ہوں کہ نہیں پاس بہت دور ہے تو
دور بھی اتنا کہ آکاش زمیں سے جیسے
پر مری روح تری روح سے پیوستہ ہے یوں
گوشت میں جیسے کہ ناخن، رگِ نغمہ نَے سے

میرا دل کیسا تڑپتا ہے ترے دل کے لئے
لب ترستے ہیں کہ مل جائیں لبوں سے تیرے
رات دن کان اسی ایک صدا پر ہیں لگے
آ کے تو کاش پکارے مجھے "سجنی" کہہ کے

تو گیا چھوڑ کے جس وقت، تعاقب میں ترے
آ گئی تھی میرے ہونٹوں پہ مری جاں کھنچ کے
منتظر ہوں کہ اسے ملتا ہے کیا حکم ترا
پار ہو جائے لبوں سے کہ یہیں پر ٹھہرے

جیٹھ کی رُت میں تو آکاش سے برسا ساگر
اور ساون میں یہ حالت کہ ہیں سوکھے بادل
دفعۃً قاعدۂ ارض و سما میں ظالم
آ گیا تیرے جدا ہوتے ہی یہ کیسا خلل

آج پھر اُبھرے گا آکاش کے نیلے تٹ پر
پیارا پیارا سا کماں جیسا نیا چاند سکھی
آج میں خوش ہوں کہ مل جائیں گی باہم دونوں
ایک مرکز پہ نظر میری، مرے "اُن" کی بھی

روح کا گرم سا اک بوسہ ہے میرا خط بھی
اپنے جادو سے مٹا دیتا ہے جو درد مرے
مجھ کو امید دلاتا ہے کہ یہ پیاسے ہونٹ
جلد ہو جائیں گے پیوست ترے ہونٹوں سے

اس قدر چھوٹے سے کاغذ پہ میں کیا تجھ کو لکھوں
دل کی ایک بات بھی پوری نہیں لکھی جائی
ایک کوزے میں چلی بند میں کرنے ساگر
انہیں باتوں سے تو اب پگلی ہوں میں کہلائی

بوالہوس ہوتے ہیں بس عیشِ دو روزہ کے غلام
کیا غرض ان کو رہِ عشق کی کٹھنائی سے
اپنے ہی نقشِ کفِ پا کو سمجھ کر منزل
جلد تھک جاتے ہیں اس راہ میں یہ بیچارے

وہ دوا ہو کہ دعا ہو مجھے ہر چیز قبول
کاش دے کوئی مرے دیدۂ تر کو آرام
بیچ طوفان میں ہی ان کی یہ قسمت ہے ہے
پیاس بجھنے کا نہیں لیتی کسی طرح بھی نام

بار ہا میں نے سمندر میں لگایا غوطہ
پر مجھے ایک گہر ایک صدف بھی نہ ملا
اپنے ہی بھاگ برے ہوں تو کرے کیا کوئی
ہے گہر سے، نہ صدف سے، نہ سمندر سے گلہ

اپنی آنکھوں پہ کبھی ناز تھا مجھ کو کیا کیا
پتلیاں جن کی سنگھاسن تھیں تری مورت کی
اب وہی آنکھیں ہیں سنسان بیاباں کی طرح
کوئی آبادی نہیں ان میں کسی صورت کی

جسم تو دو ہیں مگر تیری مری جان ہے ایک
جل کے مر جاؤں بھی میں خواہ چتا میں اپنی
گوشت ہو جائے بھسم آگ کے شعلوں میں مرا
روح تابندہ و پائندہ رہے گی پھر بھی

میں نے مانا کہ مرا جسم میری روح سمیت
غم کے طوفان میں خاموشی سے بہ جائے گا
پرچمِ عشق مگر پھر بھی ہمیشہ کی طرح
بیچ طوفان میں مستول پہ لہرائے گا

نگار صہبائی

گیت ۱

انت کے آگے ایک سفر ہے
سورج نے سمجھایا تھا
پیڑ کے نیچے شام کا ڈھلنا
گاڑی بان کو بھایا تھا

تن سے من تک میں ہی میں تھا
رات نے پردے اٹھا دئے
پل نے پل کو دکھا کے درپن
سمے کے دو جگ بنا دئے
اک جگ پائل ڈھونڈتے بیتا
دوجے نے سب گیت کہے
میں کل بھی بچپن کی گلی سے
تیرے گھر تک آیا تھا

شام ابھی سے گوندھ رہی ہے
گجرے تیری راتوں کے
جنگل میں بازار لگے ہیں
بھولی بسری باتوں کے
پتّوں کی آہٹ میں مگن تھے

ہم پلیا پر بیٹھے تھے
آنچل مکھ پہ ڈال کے تو نے
روپ کا دیپ جلایا تھا
پل کا ایک پڑاؤ ملا تھا
چاند کے ڈھلنے سے پہلے
بیٹھے تھے باہوں کے سہارے
تن اور من تھے میت نئے
عجب گھڑی تھی عجب سمے تھا
چاند تو کل بھی نکلے گا
کہاں سے لائیں پڑاؤ پل کا
جس نے ہمیں بلایا تھا

گیت ۲

تیری تو میں میری بنسی
جانے کس پل کو چھو آئی
میری کویتا سدا رہے گی
سمے کے من میں بات سمائی

دن ڈوبے گا رات ڈھلے گی
ٹھہر ٹھہر کے یوں چلے گی
رُت کے پتّے اڑتے رہیں گے
پل کی کھڑکی کھلی رہے گی
اپنی کھوج میں جب نکلو گے
پلٹ پلٹ کر مجھ سے پڑھو گے
اپنے سمے کے ہر لیکھ سے
پوچھو گے میری گہرائی

نگار صہبائی

من کی سگندھ سے میں کیا مہکا
کپڑے جھٹکے پُروا مہکی
دھول اڑی کیسی تاروں کی
رات کھڑی ہے سوچ میں ڈوبی
پھول سے کومل ہاتھ ہوا کے
عجب لگے ہے پیڑ کا گرنا
میں بھی کتنی بار گرا ہوں
دوش نہیں تیرا پُروائی

چڑیوں کی چہکار سے پہلے
رات کا ٹھنڈا ہاتھ پکڑ کر
جانے کس پربت کے پیچھے
سب سے اوجھل ہو گیا اطہر
بیتی شام سے گیت سنا ہے
یاد کی سیج پہ تو سوتا ہے
میں روتا ہوں اور ہنستی ہے
مجھ پر جیون کی تنہائی

(اطہر نفیس مرحوم)

گیت ۳

نگار صہبائی

دیپک تیری ماٹی پر ہیں
جیون بھر سر رکھ کر روتا
سانس کی لَے پر رات کھڑی تھی
میرا گیت تو مر گیا ہوتا

پنگھٹ کی سیڑھی نے پوچھا
کہاں ہیں کپڑے دھونے والے
ایسے گئے ہیں جل میں نہا کر
اُجلے پتھر پڑ گئے کالے
جلتے جی کو ٹھنڈک دی ہے
آ پُروا میں چوم لوں تجھ کو
ہر پنگھٹ نے دُھتکارا ہے
میں کس جل میں دُکھڑے دھوتا

ایک گزرتے پَل کے من میں
کتنی رُتوں کے پھول بھرے ہیں
گھوم کے دیکھا بیتے پَل نے
یادوں کے سب پیڑ ہرے ہیں
ایک الاپ میں ہنسی کے سب
چھپے ہوئے دکھ لپک اٹھے تھے
اتنی میٹھی لَے میں چھپ کر
تو چاہتا تو میں بھی روتا

یہ کس بن میں کلی کھلی ہے
سوکھے پتے دوڑ پڑے ہیں
بوندوں میں پرچھائیں ملی ہے
بادل کس پربت پہ کھڑے ہیں
پڑتی بارش میں سمجھا تھا
کہیں تو تھوڑی دیر رکو گے
میرا دیپ امر ہو جاتا
میرا نام بڑوں میں ہوتا

گیت ۴

نگار صہبائی

اب کے دبے پاؤں بچوں کی مانند
پنگھٹ سے گذری پھوار
تو کتنے آکاش کو چھو کے لوٹا

سپنوں کے تاروں سے آنچل بھرا ہے
ندیا میں بہتی ہے رات
ایک پیڑ آنگن میں اب بھی ہرا ہے
لے کر چلو ری برات
پت جھڑ کا جھونکا بھی آیا نا گھر میں
یوں تو کھلے تھے دوار
کس کو بتائیں کہ دل جانتا ہے
یہ بھی ہے جیون کی ہار!

پربت پہ اک رات بیتی ہے ایسی
لکھ نہ سکے جس کو گیت
سارے کواڑے ہوئے بند مجھ پر
من کو ملا تھا وہ میت
میں تو یہ سمجھا تھا ہر گھاؤ تیرا
دے گا کنول کو نکھار
اتنے بڑے دل کا بس اک منش تھا
مت چھیڑ بینا کے تار

تن میرا گھر ہے تو من اس کا آنگن
آکاش ہے تیرا دھیان
جگ ایک بیتے تو پل آن پہنچے
گاہک سے ہے یہ دوکان
میں اپنے درشن کا پیاسا تھا اتنا
دیکھا تجھے بار بار
درپن میں نسدن چٹکتی ہیں کلیاں
کس نے کیا تھا سنگھار

تاج سعید

۲ گیت

دنیا ایک سرائے ساتھی دنیا ایک سرائے
پل کے پل بسرام یہاں ہر پل میں کوچ نقارہ
دنیا کا نظارہ
نین سے نین ملائے ساتھی دنیا ایک سرائے
موسم سارے ساتھ ہیں چلتے بدل بدل کر بھیس
تو بھی ان کا سنگ نبھائے پھرے دیس بدیس
اونچی تان اڑائے ساتھی دنیا ایک سرائے
راہیں پگ پگ جال بنا کر رستہ تیرا بھلائیں
لیکن تو دانش کا پتلا کیسے جال میں آئے
خود ہی راہ بنائے ساتھی دنیا ایک سرائے
اجیارے میں ساری راہیں تجھ کو پاس بلائیں
اندھیارے میں گم راہوں کو جگنو آج چمکائیں
تو دنیا کا ساتھی پیارے دنیا تجھے بلائے
دنیا ایک سرائے ساتھی دنیا ایک سرائے

رنگ رنگ گاتے ہیں
موسموں کو لاتے ھیں
دیس کی ہواؤں میں
رس بھری فضاؤں میں
دل مچل ہی جاتے ہیں
رنگ رنگ گاتے ہیں
دھوپ ہو کہ سایہ ہو
گھر کے ابر چھایا ہو
سب ہی گنگناتے ھیں
رنگ رنگ گاتے ہیں
پھول مسکراتے ہوں
پنچھی گیت گاتے ہوں
پاس وہ بلاتے ھیں
رنگ رنگ گاتے ہیں
موسموں کو لاتے ھیں

احمد شریف

۲ گیت

سُن لے دل کی بات

سجنوا

سُن لے دل کی بات — جانے والے لوٹ کے آنا

رِم جھم کی آواز بھی کیا ہے

یہ سُر تال، یہ ساز بھی کیا ہے — جب چھم چھم پانی برسے گا

کل نہ ہوگی یہ برسات — من مدھر مِلن کو ترسے گا

سُن لے دل کی بات — ساون میں نا مجھے رُلانا!

سجنوا

سُن لے دل کی بات — جانے والے لوٹ کے آنا

گھائل کی گت گھائل جانے

میں جانوں یا کوئل جانے — جب دُور نگر سے آؤ گے

جان جلائے بھیگی رات — برہن کو بے کَل پاؤ گے

سُن لے دل کی بات — بے کَل مَن کی دِھیر بندھانا

سجنوا

سُن لے دل کی بات — جانے والے لوٹ کے آنا

جیون تجھ بن راس نہیں ہے

اگلی رُت کی آس نہیں ہے — یاد کے رشتے چھوٹ نہ جائیں

دل پہ رکھے ہیں دونوں ہات — پیار کے بجرے ٹوٹ نہ جائیں

سُن لے دل کی بات — مانگ میں آ کے پھول سجانا

سجنوا

سُن لے دل کی بات — جانے والے لوٹ کے آنا

احمد ندیم قاسمی

تدفین

چار طرف سناٹے کی دیواریں ہیں
اور مرکز میں اک تازہ تازہ قبر کھدی ہے
کوئی جنازہ آنے والا ہے!

کچھ اور نہیں تو آج شہادت کا کلمہ سننے کو ملے گا
کانوں کے اک صدی پرانے قفل کھلیں گے
آج مری تلاش سماعت کو آواز کی دولت ارزانی ہوگی

دیواروں کے سائے میں اک بہت بڑا انبوہ نمایاں ہوتا ہے
چپ آہستہ آہستہ، قبر کی جانب آتا ہے
ان لوگوں کے قدموں کی کوئی چاپ نہیں ہے!
لب ہلتے ہیں، لیکن حرف، صدا بننے سے پہلے مرجاتے ہیں!
آنکھوں سے آنسو جاری ہیں
لیکن آنسو تو ویسے بھی
دل و دماغ کے سناٹوں کی تمثالیں ہوتے ہیں!

میت قبر میں اتری ہے
اور حدِ نظر تک لوگ بلکتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں
____ اور حرف دکھائی دیتے ہیں
____ اور کان دھرو تو سناٹے ہی سنائی دیتے ہیں

جب قبر مکمل ہو جاتی ہے
اک بوڑھا، جو "وقت" نظر آتا ہے اپنے حلیے سے
ہاتھوں میں اٹھائے کتبہ، قبر پہ جھکتا ہے
جب اٹھتا ہے تو کتبے کا ہر حرف گرجنے لگتا ہے

یہ لوحِ مزار "آواز" کی ہے!

احمد ندیم قاسمی

نقصِ بصارت

معالج نے یہ کل مجھ کو بتایا
— تری بینائی میں فرق آگیا ہے
تری ضد نے تجھے یہ دن دکھایا

اگر کچھ ڈر ہے اپنے اندھے پن سے
تو سورج کو نہ دیکھا کر — وگرنہ
چٹخ جائیں گے یہ آئینے، چھن سے،

حقیقت کا نظارا کر رہا ہوں
مگر میرے معالج کو گلہ ہے
میں سورج کو مسلسل دیکھتا ہوں

احمد ندیم قاسمی

تکمیلِ کائنات

زمیں آدھی تاریک ہے
آدھی روشن ہے!
سورج کبھی اِس طرف ہے
کبھی اُس طرف!
آدھی انسانیت سو رہی ہے
مگر آدھی بیدار ہے!
اور خدا
(جو فقط ایک ہے)
ان تضادات پر
اس تنوع پہ
آسودہ!
ہر دائرے سے نیا دائرہ
اس طرح پیدا کرتا چلا جا رہا ہے
کہ جیسے ابھی کائنات
اپنی تکمیل کے سلسلے میں
تگ و دو میں معروف ہے!

ادا جعفری

رہائی

اور پھر میں نے سوچا
کہ میرے کئی روپ ہیں
کوئی بھی اسیری اسیری نہیں
جو زنداں کی دیوار اونچی ہوئی تو
میں پھولوں ستاروں کی بے خواب آنکھوں میں تھی
اور مرا شوقِ دیدار تھا
میں اکثر ہواؤں کے بے تاب جھونکوں میں تھی
کہ تسکینِ جاں کے لئے
قُربِ محبوب کے لمس سے آشنا ہو سکوں
اور کبھی وحشتِ دل کی خاطر
چٹانوں سے اور کوہساروں سے باتیں کروں
کہ بازارِ سود و زیاں میں
ہمیشہ زیاں ہی نہیں
آرزو حاصلِ رائگاں ہی نہیں
طلسمِ جہاں میں جو ظلمات کی رات تھی
میں وہاں
دلنشیں اسم کی روشنی میں رہی
کہ میں خود بھی تعبیر اک خواب کی ہوں
کہ میں زندگی ہوں!

ادا جعفری

وہ لمحہ جو میرا تھا

اک دن
تم نے مجھ سے کہا تھا
دھوپ کڑی ہے
اپنا سایہ ساتھ ہی رکھنا
وقت کے ترکش میں جو تیر تھے کھل کر برسے ہیں
زرد ہوا کے پتھریلے جھونکوں سے
جسم کا پنچھی گھائل ہے
دھوپ کا جنگل، پیاس کا دریا
ایسے میں آنسو کی اک اک بوند کو انساں ترسے ہیں
تم نے مجھ سے کہا تھا
سمے کی بہتی آندھی میں
لمحے کی پہچان بھی رکھنا
میرے دل میں جھانک کے دیکھو
دیکھو ساتوں رنگ کا پھول کھلا ہے
وہ لمحہ جو میرا تھا وہ میرا ہے
وقت کے پیکاں بے شک تن پر آن لگے

دیکھو اس لمحے سے کتنا گہرا رشتہ ہے
خوشبو بند دریچے کھول رہی ہے
چاندنی راتوں سا موسم بھی
کلیاں بھی ہیں، شبنم بھی
یہ سب میرے آئینے ہیں
اور ہر آئینے میں تم ہو!

قیوّم نظر

ایک نظم

تو فسانے کی حقیقت ہے فسانہ تو نہیں
زندگی تیری زمانے کو بدلنے کے لئے
موت کے پہلو سے اس رنگ سے پیوست ہوئی
ناسمجھ وقت نے جانا کہ جہاں کی تقدیر
اپنی آشفتہ خرابی سے تہی دست ہوئی

پھیلے دامن کو اٹھائے ہوئے اڑتا ہوا وقت
ڈال دیتا ہے شب و روز کے لاکھوں پردے
اور چھپا دیتا ہے خاموشی سے اُن یادوں کو
ذہن کے گوشوں میں تاریک تہوں کے نیچے
تازگی جن کی، حیاتِ ابدی دیتی ہو

تیرے کردار کا، اعمال کا، یادوں کا جہاں
رِستے برسوں کے سیہ کوہ گراں کے اُس پار
آج بھی زلیت سے ہم دوش ہے تابندہ ہے
اور یہ وقت کا بہتا ہوا دھارا گویا
تجھ کو نظروں سے نہاں دیکھ کے شرمندہ ہے

لہ شہید ملت لیاقت علی خاں مرحوم کی برسی پر لکھی گئی۔

قیوم نظر

طلیطلہ میں کبھی

اونچے اونچے کتنے مکانوں کے قدموں میں
ایک گلی ہے ــــ اور بھی ایسی کئی گلیاں ہیں
سانپ کی صورت جاتے جاتے بل کھاتی سی،
لیکن یہ مسجد کے پہلو تک بڑھتی ہے

اس کے گھیرے کے دامن میں ــــ دائیں جانب
ایک مکاں ہے ــــ صاف اور ستھرا اور کشادہ
جس میں داخل ہونے کا بھاری دروازہ
گھوڑے کے ایک نعل ایسی صورت رکھتا ہے

یوں تو ایسے مکانوں میں ہیں اک اک دو دو
لوہے کی مضبوط سلاخوں والے دریچے
جن میں رکھے ننھے گملے، رنگ برنگے
پھولوں کو دیتے ہیں دنیا نشو و نما کی

لیکن گھیرے والے مکاں کا پہلا دریچہ
اپنے پیچھے صحن کی پھیلی رعنائی کا،
جس کی زیبائی خوش ذوقی پہ قائم ہے،
ایک شگفتہ منظر سامنے لے آتا ہے

سیمیں گردن، ستواں ناک، غزالیں آنکھیں
گورے گالوں کے نیچے باریک رگوں میں
صدیوں پر چھائی ہوئی عظمت کے رخشندہ
خوں کا جلوہ کتنا صاف دکھائی دیتا ہے

دوشیزہ اک ہاتھ میں اُجلا پھول لئے ہے
جس کے دودھیا جسم کی ہر سو پھیلی خوشبو
نازک بیلوں کے پتوں کی، فوارے کی
آبی چادر کی، گل کاری میں بستی ہے

شہر پنہ کے باہر ہنگاموں کے تودے
چھوٹے چھوٹے بکھرے بکھرے افسانوں کو
شہروں شہروں عجب عُسرت سے پھیلاتے ہیں
اور کئی شعلوں کے پرچم لہراتے ہیں

کتنی تلواروں کی خوں آشام زبانیں
جوشِ وعمل کی دُہائی دیتی نکل آتی ہیں
نیزے، برچھے، بھالے، عزت کے رکھوالے
کتنے سروں کو خاک سے پیوستہ کرتے ہیں

اور گلی میں۔ اپنی ہی مونچھوں میں ہنستا
ہونٹوں کو دانتوں میں دابے دائیں تکتا
بے گانۂ انجام سے بے بس حسن کے ہاتھوں
کون ہے جو دیوار سے لگ کر کھو ہی گیا ہے

جیسے دریائے تاجہ کا سرمئی پانی
اپنی لپیٹ میں طوفانوں کو لے لیتا ہے
یہ بھی جیسے گلی کو، گھیرے والے مکاں کو،
دوشیزہ کو، پھول کو، ساتھ لئے جاتا ہے

قیوم نظر

برف باری

چاندی سی چمک رہی تھی ذوری
اک نازک دل تو بہ وسمن پا
آہو، اسے چھیڑ کر در آیا
محفل سرمائی تھی ادھوری

پتھر، پودے، ہوا — کوئی شے
لیتی تھی نہ سانس، تن گئی تھی
جادو بھرا نقش بن گئی تھی
تبدیل ہوئی تھی زیست کی نے

ایک ایک قدم سنبھل سنبھل کر
آہو نے حجر شجر پہ رکھا
برگ قلب و نظر پہ رکھا
پہلو اپنا بدل بدل کر

یہ حسن کا پے بہ پے بناؤ
اٹھا ہے عجب ابال جی میں
لایا ہے ترا خیال جی میں
انداز کا طرفہ تر گھلاؤ

ڈاکٹر وزیر آغا

پوسٹ مارٹم

کہاں ہوں
یہ چٹیل زمیں
جس پہ میلوں کے مَیلے نشاں
جیسے کیلوں کی صورت گڑے ہیں
درختوں کے ہیکل
عمارات کی ہڈیاں
خشک ندیوں میں
کُہنہ چٹانوں کے اعضا
جلی کھیتیوں کے بدن
اور پرندوں کے
جُھلسے ہوئے پَر
کوئی ایک بھی چیز
زندہ نہیں ہے
زمیں مر چکی ہے!

زمیں مر چکی ہے تو کیا ہے
مجھے اُس کے مرنے کا دُکھ کس لئے ہو
اُسے۔ اک نہ اک دن تو مرنا تھا،
سو مر گئی ہے!

مجھے دُکھ اگر ہے تو اس بات کا ہے

کہ جب وہ مری
آسماں نے اُسے
اِک لحد تک نہ دی
(شبنم افشانیاں تو بڑی بات ہے)
آسماں نے فقط یہ کیا
ایک سفّاک سے ڈاکٹر کی طرح
اُس کی اکڑی ہوئی لاش کو
اپنے نشتر سے دو نیم کر کے
بدن کے خزانوں کو باہر نکالا
بکھیرا، ٹٹولا
لکھا: موت ـــ صدمے،
کسی ذہنی صدمے سے واقع ہوئی ہے!
پھر اُس نے زمیں کی کٹی اور پھٹی لاش کو
یوں ہی رہنے دیا
اور خود چل دیا!

جب سے اب تک
یہ چٹیل زمیں
اک دریدہ بدن بے رِدا لاش ہے
اِک دریدہ بدن بے رِدا لاش ہے

جسٹس عطاء اللہ سجاد

مُسافر

میں کہ اک مسافر ہوں راہ گزارِ ہستی میں
پا برہنہ ہی قدم فرسا رہا
سنگِ راہ کی ٹھوکر، نوکِ خار کی تیزی
میری آبلہ پائی سے رہیں شناسندہ
خاک و خوں میں آغشتہ میرے پائے فرسودہ
تھے رواں سوئے منزل

کون سی وہ منزل تھی
جس کی راہ میں کوئی سنگِ میل پیدا تھا نہ نشانِ جادہ تھا
کوئی کُنجِ دل کُشا،
کوئی جوئے نرم رو،
کوئی برگ و بار و شاخِ گل کا انبوہِ جمیل،
میرے استقبال کو آیا نہ تھا

ریت کے تپتے ہوئے دریا پہ میں چلتا گیا
ہر قدم پہ اِک سراب اندر سراب
زندگانی خواب خواب
پھر بھی میرے دل میں آتا تھا خیال

میرے خوں آلودہ پاؤں کے نشاں
ریگِ صحرا پہ بہاروں کے نشاں بن جائیں گے
اک گلابوں کی مسلسل کہکشاں بن جائیں گے
اور میرے بعد جو بھی راہ پیما آئیں گے
میرے تابندہ لہو کو دیکھ کر
اپنی منزل کا نشاں پا جائیں گے
اور کہیں گے اک مسافر ہم سے پہلے بھی انہیں راہوں سے گزرا تھا کبھی

اب جو پہونچا ہوں میں سرحد کے قریب
اور کھڑا ہوں اُس مسافر کی طرح
منتظر ہو جو کسی آواز کا، اک نئی پرواز کا
اور پلٹ کر دیکھتا ہوں اپنی اُن پامال راہوں کی طرف
جن کو تیرے زخمی پاؤں نے دیا اپنا لہو
جن پہ کھل اٹھی گلابوں کی مسلسل کہکشاں
کچھ نظر آتا نہیں جز وسعتِ صحرا مجھے
مٹ چکی ہے لالہ و گل کی قطار،
وہ گلابوں کی مسلسل کہکشاں
ریگِ ماہ و سال کی چادر میں پنہاں ہو گئی
اور نہیں اب کوئی بھی اس بات کا باقی نشاں
کہ انہیں راہوں سے گذرا تھا مسافر بھی کوئی
جس نے اپنے خون سے ان کو بنایا گلستاں

جسٹس عطاء اللہ سجاد

میں نے دستک دی

میں نے دستک دی کہ شاید کوئی آواز آئے
کوئی اندر سے کہے
ٹھہریئے کھلتا ہے ابھی دروازہ
یا کوئی پھول سا کومل چہرہ
جھانک کے دروازے سے
مسکرا کر یہ کہے
" اندر آجاؤ، تھکے ماندے ہو آرام کرو
یہ غبارِ سرِ آشفتہ، یہ خاکِ سرِ پا
سرِ دہلیز انہیں جھاڑ کے اندر آؤ
اس شبستان کو آباد کرو
اپنے رستے کی صعوبت کو نہ اب یاد کرو
اور جب صبح دریچے سے ہمیں جھانکے گی
میں تری نیند سے بھرپور بوجھل آنکھوں کو
اذنِ بیداری عطا کر دوں گی
اور تری بادیہ پیمائی میں، ہاتھ میں ہاتھ دیئے
گام زن ہوں گی ترے ساتھ قدم تا بہ قدم"

کوئی آواز نہیں آئی مگر
کوئی دروازے سے جھانکا بھی نہیں

نظر آیا نہ کہیں پھول سا کومل چہرہ
میری آواز مرے کانوں سے ٹکراتی ہے
جیسے ویرانے میں درماندہ مسافر کی پکار
گونج کے ساتھ پلٹ آتی ہے
اور تنہائی کا ہر ہر لمحہ سانپ بن کر اسے ڈستا ہے اُسے کاٹتا ہے
میری دستک کا جواب
ایک دلدوز خموشی کے سوا کچھ بھی نہیں

مجھے تقدیر کا پیغام ہے یہ
"کوئی دروازہ نہیں کھلتا اگر
ہم سفر کوئی نہیں ملتا اگر
پھر بھی تنہا ہی چلو، پھر بھی تنہا ہی بڑھو
سفرِ درد والم جاری رہے"

اجنبی بستیوں میں، شہروں میں، ویرانوں میں
بے شجر راہوں میں، بے سایہ بیابانوں میں
جنگلوں اور پہاڑوں کی بلا خیزی میں
سفر آمادہ رہوں گا جب تک
ہے میسّر مری تنہائی کو
صحبتِ خارِ مغیلاں، یاریٔ سنگِ سبیل

محسن احسان

اقبال کے لئے ایک نظم

ہم بے چہرہ لوگ تھے، لیکن
تو نے اک دن خواب میں دیکھا
کوئی ہمارا چہرہ ہو
اُس چہرہ پہ عظمت کا اک سہرا ہو

تو نے اپنا خواب سُنایا
اس کو جو تعبیر بھی کرنا جانتا تھا
ذہنوں کی تعمیر بھی کرنا جانتا تھا
موجوں کو زنجیر بھی کرنا جانتا تھا
تیز ہوا تسخیر بھی کرنا جانتا تھا

اس نے ہمارے جسم پہ اپنے ہاتھوں سے
اک چہرہ سجایا
آنکھیں بنائیں تاکہ ہم انوارِ سحر کو دیکھ سکیں
وسعتِ فلک کے ڈوبتے چڑھتے شمس و قمر کو دیکھ سکیں
اپنی ذات کو دیکھ سکیں اور اپنے گھر کو دیکھ سکیں

اس نے ہمارے ہونٹ بنائے
تاکہ ہم کچھ بول سکیں
جنسِ سخن کو معنی کے میزان میں رکھ کر تول سکیں
کاسۂ شب میں مہرِ عالم تاب کی کرنیں گھول سکیں

لیکن ہم نے اپنا چہرہ
اپنے ہاتھوں سے خود نوچ لیا ہے
اپنی بربادی کا اپنے ہاتھوں سے سامان کیا ہے
ہاتھ ہمارے، خود غرضی کے ہاتھ

ہاتھ ہمارے رشوت اور ریاکاری کے ہاتھ
ہاتھ ہمارے جھوٹ، تعصب اور عیاری کے ہاتھ
مکر سے یاری، سچ سے بیزاری کے ہاتھ
دھوکہ دہی کی دیواروں پر گلکاری کے ہاتھ
خرقۂ فقر کے اندر، خواہشِ زرداری کے ہاتھ
ہم نے اِن ہاتھوں سے اپنے چہرے کو بے نور کیا ہے
اپنی ذات کو حرص و ہوس کے زنداں میں محصور کیا ہے
ہم پر خود غرضی نے اپنا وار بڑا بھرپور کیا ہے

میرے شاعر، میرے مغنّی!
تیرے جن نغموں نے ہم کو نیندوں سے بیدار کیا تھا
تیرے جن گیتوں نے ہماری روحوں کو سرشار کیا تھا

اُن گیتوں، اُن نغموں کی لَے
اب بھی سُریلی ہے لیکن
ہم میں اب وہ تاب نہیں ہے
سامنے کوئی خواب نہیں ہے

انجم اعظمی

نا امیدی کفر ہے

تم جو مغرب کی جگالی سے کبھی تھکتے نہیں
تم کو کیا معلوم ہے تخلیق کا جوہر کہاں
فلسفی بنتے ہو اپنے آپ سے پوچھو کبھی
کھو گیا ہے روح کا گوہر کہاں
تم دل و جاں سے جو مشرق کی پرستاری کرو
کیا برہمن کے سوا کچھ اور ہو
کیا کسی کی مشرق و مغرب میں دلداری ہوئی
بھوک سے بے حال ہیں جو ان کی غمخواری ہوئی؟
عدل کی میزان جب ٹوٹی پڑی ہو درمیاں
زندگی ساری کی ساری ہی ریاکاری ہوئی
مغرب و مشرق کی ساری بحث میں تم نا امیدی کے سوا کیا دے سکے

نا امیدی کفر ہے
کفر سے بچتے بھی ہو اور کفر ہی کرتے ہو تم
تم تو ماضی حال و مستقبل کے بھی قائل نہیں
دل کہے کچھ بھی مگر تم اس طرف مائل نہیں
وہ جو مطلق ہے تمہارے واسطے سارے زمانے دے گیا
تم بتاؤ تم نے اب تک کیا کیا
نا امیدی کفر ہے اور کفر ہی کرتے ہو تم
دل میں گر روشن ہو اس دن کی امید
جستجو تم کو جب اپنے آپ سے ملوائے گی
زندگی کرنے کو پیارے شش جہت کھل جائے گی

انجم اعظمی

آخری امید

سُود و زیاں کا یہ بھنور جس کے حصار میں ہوں میں
دل میں یہ اضطراب تھا
اس سے بچوں تو کس طرح
وقت کی لازوال لہر مجھ سے بچھڑ گئی کہاں
لوگ جو میرے ساتھ تھے، شہرِ جدید میں رہے
شہر میں بھونکتا ہوا غولِ سگانِ گُرسنہ
معرکۂ ہوس میں ہے
پنجۂ حرص و آز سے خوابوں کی قتل گاہ میں
نوچ رہا ہے بوٹیاں
آپس کی چپقلش بھی ہے جس سے لہولہان ہے
دشتِ بے اماں میں یوں گزرے تمام روز و شب
لوگوں کو خوف کھا گیا
راہِ فرار بھی نہ تھی
شوق سے اجتناب تھا، کہتی تھی دل کی بے بسی
شوق ہے آخری امید

میرا خدا تھا مجھ سے دور، تنہا میں اس بھنور میں تھا
دل نے دہانِ زخم سے اس کو پکار ہی لیا

سرشار صدیقی

ثمرہ

ہوا کی حمایت میں
کتنے چراغوں نے
اپنی سرفراز روشن لَویں چُوس لیں
اور بجھتی ہوئی زندگی کے دھوئیں میں
اندھیروں کا گہرا کفن اوڑھ کر
بے نشاں ہو گئے

موقع پرست

سموم وقت کے پالے ہوئے خیاباں میں
صلیب و دار سے ترشے ہوئے شجر ہوں گے
شجر، شجر میں سجائے ہوئے ثمر ہوں گے
ثمر، ہمارے، تمہارے، سبھوں کے سر ہوں گے
سروں کی قلمیں لگیں گی
تو فصل آنے تک
سروں کے پھل ہی
سرِ شاخِ بارور ہوں گے

آتش فشاں

گرتے پڑتے
میں پربت کی سب سے اونچی چوٹی تک
تو پہنچ گیا ہوں
لیکن میرے چاروں اور تو دھند
کی اک گہری چادر ہے
(یہی دھند میرے اندر ہے)۔
دُھواں دھواں سا ہر منظر ہے
برف اُگلتی، برف نگلتی
سرد چٹانوں سے چمٹا ہوں
سوچ رہا ہوں
جب تک پربت جوش میں آئے
جوالا اُگلے
تب تک میں خود
ایک چٹان نہ بن جاؤں
اور مجھ پر برف نہ جم جائے۔

محمد ہادی حسین

کر کے سورج کی کرن کو خامہ میں لکھتا رہا

عالمِ بالا کا سچا عشق میں نے کھو دیا'
اور میں نے عالمِ سفلی کی رَد کر دی ہوس۔
اک خیالی عشق کی میں لذتیں چکھتا رہا،
اور یہ سمجھا کیا دشمن مرا دوزخ ہے' بس۔

میں نے اس دنیا کی خوشیاں سب کی سب تج دیں مگر
میرا سینہ آسماں کے نور سے روشن رہا۔
ہوتے ہوتے حسن گویا میرے اندر کر کے گھر
جو فنا ہوتا نہیں اس کا غزل خواں بن گیا۔

میں نے الفت کی' مگر عورت نے دی مجھ کو دغا۔
اس کی رسوائی سے میں نے منھ چھپا کر آڑ لی۔
کر کے سورج کی کرن کو خامہ میں لکھتا رہا'
یہ زمیں تا آں کہ محض اک نام ہو کر رہ گئی۔

جو زباں بھی ہے زمیں کی اس میں میں لکھتا گیا۔
میں نے ہر ساحل پہ' ہر ساگر پہ لکھا اپنا نام،
اور یوں اس کو اَمر کر کے جنم دیتا رہا۔
ہاں رہا آزاد روحوں میں سدا میرا مقام۔

ے جس بلند پایہ الہامی نظم کا یہ ترجمہ ہے وہ انگریزی زبان کے دیوانہ شاعر جان کلیر کے پاگل خانے ... [illegible]

امین راحت چغتائی

شائیگاں

مَرمریں طشت میں نیم وا سا گلابی صدف
اس کے بالائی گوشے میں اِک گوہرِ شائیگاں
جس کا حُسنِ بیاں
لڑکھڑائے زباں
مختصر یوں کہیں، آپ اپنا بیاں،

اور اس تک رسائی کی دھن ہو جسے
طے کرے ہفت خواں،
اس طلسمات میں
جسم و جاں کا زیاں،
ہوش، صیدِ زبوں،
شوق، صیدِ فسوں

ٹوٹتی سی بدن کی طنابیں اُدھر
گردشِ خوں کہ سیالِ آتش رواں

آگ آہن گدازی کرے تو کرے،
آگ شیشے کو پگھلائے، یہ بھی سہی
آگ سے گیان کو روشنی ملے،
آگ میں جو تپے وہ سہاگن بنے،
آگ کے انگ کے رنگ نیارے، مگر
آگ میں جو جلیں انگ پیارے، مگر
مرمریں طشت کا گوہرِ شائیگاں،
آگ کی زد میں آئے تو آہن بنے،
گرم تر، سرخ تر،
جو بھی آئے قریں، بس فنا ہو وہیں

پھر بھی مچلے یہی آرزو دم بدم
پھر جلیں، پھر اٹھیں، پھر فنا ہوں یونہی
آگ کی زد میں تا دیر گوہر رہے،

ابن راحت چغتائی

انگارے

چاندی کی چوٹیاں
ہانپتے راہرو
اجنبی، اجنبی، پھر بھی منزل کی پُرپیچ راہوں سے مانوس ——
بڑھتے چلے جا رہے ہیں،

مگر سانس سے آگ کے تیر برسیں،
کبھی اپنی جرأت پہ حیرت سے چیخیں،
کبھی چوٹیوں پر لپکنے کی دُھن میں
پھسلتے ہوئے، بازوؤں پر خراشیں سجاتے،
خیالات کے دائرے سے بناتے
سنبھلتے، لڑھکتے،
لڑھکتے، سنبھلتے،
بڑھے جا رہے ہیں،

نگاہوں میں پھر چاندی کی چوٹیاں ہیں،
یہی چوٹیاں چاند ہیں، چاندی کی چاندنی میں ڈھلی،
دودھ پی پی چٹانوں کا جیسے پلیں،
دیکھنے میں کبھی برف کا بانکپن،
اور چھونے میں تپتی چٹانیں کبھی،

ہاتھ تو ہاتھ ہیں اب زباں بھی جلی،
کون جانے یہ کیسے ہُوا، کیوں ہوا،
چاندی کی چوٹیوں پر یہ انگارے کس نے دھرے؟

امین راحت چغتائی

چاہت

کچھ لذت سی آوازوں کی، کچھ آوازیں سی لذت کی
کچھ پیراہن کی خوشبوئیں کچھ خوشبوؤں کے پیراہن
کچھ خاموشی کا شور و غل، کچھ شور و غل کی خاموشی
کچھ کیفیت کھو جانے کی، کچھ کیف سا کھو کر پانے کا
کچھ اُلجھن سی آسودگی میں کچھ آسودہ پن کی اُلجھن
کچھ سودائی پن کی باتیں، کچھ باتوں کا سودائی پن
کچھ منزل پا لینے کی دُھن، کچھ طولِ مسافت کی خواہش
کچھ خلوت میں جلوت کا مزا، کچھ جلوت میں خلوت کا سماں
کچھ کہتے کہتے رُک جانا، کچھ رُکتے رُکتے کہہ جانا

کبھی کوشش نیند میں جاگنے کی، کبھی جاگتے جاگتے سو جانا
کبھی سانس لپکتا شعلہ سی، کبھی شعلوں پر سانسوں کا گماں
کبھی اپنے دھیان میں منزل سے بھی آگے پہنچ کر دم لینا
کبھی امرت کی آشا کرنا، کبھی خود امرت بن بن جانا
کبھی مدّھم مدھم رنگوں میں اک شوخ سا رنگ ملا دینا
کبھی لہر سی بن کر لہرانا، کبھی لہروں میں گھل مل جانا
کبھی بے رنگی سی چہرے پر، کبھی رنگوں کا آنا جانا
کبھی بہکانا، کبھی بھٹکانا، کبھی راہ دکھا کے مکر جانا
کبھی جاتے جاتے رُک جانا، کبھی رُکتے رُکتے چل دینا

کبھی اپنی آگ میں جل اُٹھنا، کبھی جل تھل جل تھل ہو جانا
یہ چاہت کیا ہے آگ اور پانی کا آپس میں مل جانا

امین راحت چغتائی

دو سورج

وُہ رنگت، سب رنگوں سے الگ
کچھ تپتے ہیں سیندور ملا، کچھ دھوپ میں مہکا مہکا پن
پھر ان سے مدّور طشت بنیں
دیکھیں تو نہ دیکھا جائے انہیں
دو سورج آنکھیں چندھیائیں
سدا لہرائیں، پر من بھائیں

دو سورج، جن کی آنچ لہو کو گرمائے
پھر گرم لہو کی خوشبو، سانس میں رچ جائے
اُس خوشبو کی مستی بھی الگ
جی چاہے سورج پاس آئیں، ارمانوں کی آغوش بھریں
پھر دیکھیں دائم کون یہاں اور کون فنا کا راہی ہے
جو آگ دبی ہے سینے میں، اُس سے کس کو آگاہی ہے

ہر لحظہ سوچ انوکھی ہے
دو سورج جو محور پہ رہیں، گردش بھی کریں
آنکھوں کے دریچوں سے اُتریں
پھر سانس کے زینے سے چڑھ کر
اندھیارے تن میں جھلمل کرنیں پھیلائیں

این آئی ٹی بیئرر یونٹ
خریدنے والوں کو شناخت
کی کوئی ضرورت نہیں۔
ہم ان کا نام، پتہ، نشان کچھ بھی دریافت
یا درج نہیں کرتے۔
بعض لوگ ذاتی وجوہ کی بنا پر اپنا نام، نشان بتانا پسند نہیں کرتے۔
ان میں مرد بھی ہو سکتے ہیں اور عورتیں بھی۔
ہم ان کی اس خواہش کا پورا لحاظ کرتے ہیں۔ وہ کاؤنٹر پر ہاتھ کے ہاتھ بیئرر یونٹ خرید سکتے ہیں اور بوقت ضرورت بیچ بھی سکتے ہیں۔
پھر منافع کیونکر وصول کیجئے؟
جی ہاں! ہولڈر کو بھی منافع کوپنوں کے بدلے ادا کر دیا جاتا ہے جو یونٹ سرٹیفکیٹ کے ساتھ منسلک ہوتے ہیں۔
ایک کوپن دیجئے اور سال بھر کا منافع وصول کیجئے۔
ہم قومی ترقی کے لیے سرمایہ مہیا کرنے میں آپ کی مدد اور آپ کے ذاتی مفادات کا تحفظ کرتے ہیں اور یونٹ خریداروں کو سال بہ سال معقول منافع تقسیم کرتے ہیں۔
این آئی ٹی بیئرر یونٹ
سرمایہ کاری کی آسان ترین صورت
این آئی ٹی - امانت، قومی سرمایہ کاری
نیشنل انویسٹمنٹ ٹرسٹ لمیٹڈ
Jnited
PID (1) 2/82

جدید جرمن نظمیں

۱۹۱۱ء تا ۱۹۷۴ء

(۲۸ نظمیں)

ترجمہ

مقبول الٰہی

ارنسٹ شٹاڈلر
(۱۸۸۳—۱۹۱۴ء)

لندن کے خیراتی طعام خانے کے سامنے بچے

میں نے دیکھے بچے کشکول بنائے
طویل طویل قطار میں گھیرا باندھے
دو دو صف میں زرد، زرد معصوموں پر
اک دارالغرباء کے باہر

بھوکے خوف زدہ
آس لگائے استادہ
چپ چپ، ماندہ جب کہ چراغ جلے تھے لیکن
شام کے خوان سے بس چند اک
اپنی اپنی باری کی

اکثر نازک چہرے
گندے، بکھرے بگڑے تھے
چیتھڑوں ڈھانپے کچھ داغوں، کچھ زخموں کی لکیروں سے
بھینچے ہوئے

ڈیوڑھی اور کٹہرے میں ان کے کپڑوں سے آتی تھی
بو باس تہ خانوں کی
کم سن بچیاں کم روشن دالانوں کی
کم کم سکت کے ہاتھوں کے غربت کی اور طعنوں کی

ان کے جسم جراحت خوردہ
محرومی اور قبل از وقت محن سے
اور تھکاوٹ سے

حیرت ناک سی گٹریاؤں کے
کھلے دروں دریچوں والے کمروں کے
کاشانوں میں۔

(۱۹۱۴ء)

آس لگائے
جلد ہی اگلے فارغ ہوں
تو رسائی ہو
ان کی بھی ایوان کے اندر

ان کی بھی ہو تواضع
روٹی، ترکاری سے
ٹین کے پیالوں میں
شوربے سے اور سب ستی سے
اخاہ! نیند کا غلبہ ہوگا اب تو
ان کا جکڑا بند بند
کھل جائے گا

رات اور میٹھی نیند
انہیں لے جائیں گے
جھولنے والے گھوڑوں، سپاہی گڈوں پاس۔

جارج ہیم
(۱۸۸۷ — ۱۹۱۲)

عصر

کنارِ جادہ
خزاں میں شمشاد
کانپتے ہیں
دو ایک بچّے
چند ایک عورت
اٹھائے چھڑیاں
اُترتے جنگل سے آرہے ہیں
وہ ایک ویران راستے پر

ہوائے تُند ایک
ہے ہمیشہ
پڑی ہوئی پیچھے، ان گنت بھورے اور سرخ پتّے پتیوں کے
اور
اس کا ہر ایک حملہ
شاخوں سے ان بے چاروں کو نوچنے کے لئے تُلا ہے
کہ وہ بالآخر
گریں زمیں پر بجھے ہوئے آسمان سے
جیسے پرندے مردہ

(۱۹۱۱ء)

ہانز آرپ
(۱۸۸۷ - ۱۹۶۶ء)

مکان

کسی اک مکاں میں
سبھی ساکنوں نے وہی خواب دیکھا
انہوں نے یہ دیکھا
کہ وہ دن بہ دن سب
سکڑتے چلے جا رہے ہیں
بالآخر انہیں موت نے آلیا ہے
یہ پیشِ نظر رکھ کے وہ جُت گئے
اپنے اپنے کفن کو کفنچہ بنانے
جہاں جائیں ان کو بغل میں دبائے
مُسلّم، بجا بھی تھا یہ طور اُن کا
اگرچہ اوائل میں ان کا سکڑنا
نہ تھا قابلِ ذکر
اور یہ عمل یوں ہوا بھی اَلل ٹپ
چنانچہ کئی ماہ تک یہ رُکا بھی رہا
پر جو سکڑے تو سکڑے خلافِ توقع اچانک
تو پھر ایک شاداں صبح
اس مکاں میں جہاں سب نے دیکھا تھا بالکل وہی خواب
سارے کے سارے جو سو کر اٹھے
تو وہ ننھے ننھے سے گڈّے
سمائے مکمل طرح سے بخود ساختہ اپنے اپنے ہی
تابوتچوں میں

(۱۹۵۶ء)

ہانز آرپ
(۱۸۸۷-۱۹۶۶)

گھڑی کی سیکنڈ کی سُوئی

میں جب میں ہوں
ایک اور دو ہے
میں جب میں ہوں
تین، چار ہے
میں جب میں ہوں
کیا بجتا ہے ؟
میں جب میں ہوں
ٹِک اور ٹِک ہے
میں جب میں ہوں
پانچ اور چھ ہیں
میں جب میں ہوں
سات، آٹھ ہیں
میں جب میں ہوں
رک جاؤں تو
رُک جاتی ہے،
میں جب میں ہوں
چلنے لگوں تو
چل پڑتی ہے
میں جب میں ہوں
نو اور دس ہیں
میں جب میں ہوں
گیارہ بھی ہے
بارہ بھی ہے۔

(۱۹۲۵ء)

جارج ٹراکل

(۱۸۸۷-۱۹۱۴)

تنزّل

کارل ہائی نرش کے نام

سفید تالاب کے اوپر سے
جنگلی پرندوں نے سفر جاری رکھا
شام ڈھلے ایک برفیلی ہوا ہمارے ستاروں کی جانب سے چلی

ہماری قبروں کے اوپر
شکستہ جبین شب جھکی
صنوبر کے درختوں تلے ایک روپہلی کشتی میں ہم جھونکے لے رہے ہیں

شہر کی سفید دیواروں سے سدا صدائے بازگشت اٹھتی ہے،
کانٹوں کی محرابوں تلے،
اے میرے برادر، نابینا ساتھیوں کے بازوؤ،
ہم نصف شب کی جانب چڑھ رہے ہیں۔

(نثر)

جارج ٹراکل

(۱۸۸۷—۱۹۱۴)

نوحہ

نیند اور موت، دو عقابِ سیاہ
رات بھر ہیں جھپٹتے سر کے گرد
ابدیت کی موج — برفیلی —
آدمی کے سنہرے عکس کو لو
جیسے یا نسل نگل کے دم لے گی،
بحر کی خوف زا چٹانوں پر
پرخچے ہے پٹخ پٹخ کے جسم
اور آوازِ تیرہ و تاریک
پھرے نوحہ کناں سمندر پر
حزنِ طوفاں بدوش کی ہمشیر
دیکھ! دیکھو! اک سفینۂ ترساں
غرقِ آب ہو رہا ہے تاروں تلے
رات کا چہرۂ خموش خموش

(۱۹۱۴)

جارج ٹراکل

(۱۸۸۷—۱۹۱۴)

نیند

تم ملعون سیاہ زہرو
نیند سفید!
یہ نایاب ترین چمن کہ جو ہیں
شفق میں لپٹے درختوں کا
پرسانیوں سے، پروانوں سے
مکڑیوں اور چمگادڑوں سے
اجنبی! تیرا سایہ گم شدہ
غربِ غروب کی سرخی میں
ایک تیرہ و تار سفینہ
غمگینی کے بحرِ نمک پر
رات کی جھالر برسے
سبھی سفید پرندے
نظروں سے ہوئے اوجھل اڑ کر
اوپر سے فولاد کے ڈھیتے شہروں کے

(۱۹۱۴)

جوآچم رنگل ناز
(۱۸۸۳ء — ۱۹۳۳ء)

ڈان کیحوٹے کی ایک جلد پر تحریر

ہوائیں لیتی ہیں راستہ اپنا
پھر اچانک ہی لوٹ آتی ہیں
تند ہوں، نرم رو یا کہ خرم
مزے کی یہ بات ہے کہ آتی بھی ہیں قرب میں ہمارے

وہ ہو سلیٹی کہ زرد ہو
آخری زرد سا تھا جیسے ——
تمام رنگوں کے
لوٹ آتے ہیں سب ہی بادل
وہ بدلے بدلے اگرچہ ہوں
پر ہمیشہ رہتے تو ہیں وہ بادل
"بڑی ہی اچھی ہے بات یہ تو"
بھلا یہ خود آپ نہ کہیں گے؟

نہیں ہے شرطی کوئی بچی آپ کی
پوچھ لیں آپ بادل سے —— یا ہوا سے
کہ کیوں ہر اک شکل آشنا

لازماً دوست ہوتا نہیں ہر اک کا
ہے لگتا مانوس سا بہت کچھ ہمیں جہاں میں
کہ جیسے چھتّیاں یعنی آنیٹز
اور یہی وجہ ہے کہ ڈان کیوٹے
کا سا کردار گھڑ گیا۔

سرو انیٹز

مائیخائل گوٹن برتر
(۱۹۱۹ء ———)

مارچنگ پاسٹ

بہترین گائیکی جو میں نے اب تک سُنی ہے
وہ روسی فوجی سپاہیوں کے گلوں سے
جو بھوک سے قریب المرگ تھے ـ جو بمشکل کھڑے ہو سکتے تھے ـ
" گاؤ! اگر گاؤ گے تو تھوڑا بہت کھانے کو ملے گا "
سو اُنہوں نے گانا شروع کر دیا
میں، پاس سے نپے تلے قدموں چلتا وہاں سے گذرتے ہوئے
مدّت بعد بھی، اسے سُن سکا
جاں بلب نغمہ

(۱۹۶۵)

نیلی ساخز
(۱۸۹۱–۱۹۷۰ء)

نیلی دُوری میں

نیلی نیلی دوریوں میں جس جگہ
سیب کے پودوں کا لعلیں سا خیاباں یوں ہی محوِ گشت ہے
پا بہ گِل ہیں پھر بھی ہیں پودے سدا
مائلِ پرواز تا بہ آسماں۔
ہو رہی ہیں واں تمنائیں کشید
وادی کے سب ساکنوں کے واسطے
آفتاب

راستے میں لیٹ کر، زور پہ جادو کی چھڑیوں کے جہاں
حکم دیتا ہے ہر اک رہرو کو: ٹھہرو، ٹھہر جاؤ

وہ ٹھہر جاتے ہیں اک

شیشہ گوں قابوس میں۔
جب کہ جھینگر کھٹکھٹاتا ہے بہت آہستگی سے
غیر مرئی چوکھٹوں دروازوں کو
اور بدل لیتے ہیں موسیقی میں پتھر
رقص کے عالم میں
اپنی خاک کو

(۱۹۵۷ء)

پوان گول
(۱۸۹۱ـ ۱۹۵۰)

شجر خاک

بڑھ رہا ہے شجر غبار کا اک
ایک جنگل ہے خاک کا ہر جا
جس طرف بھی قدم اٹھے اپنے
اور یہ ہاتھ بھی تو خاک کا ہے
مت چھوؤ، مت چھوؤ اسے ہرگز

اٹھ رہے ہیں ہمارے گرداگرد
بھول ہی بھول کے منارے جو
جانب اندروں ہی ڈھیتے ہیں
پھر بھی روشن ہیں فیض سے تیرے
سُرخ نارنج سی شعاعوں سے
اڑ گیا دھول کا پرندہ اک

اپنے افسانۂ محبت کو
میں کراؤں گا نعل میں محفوظ
اور سونے کو اپنے خوابوں کے
دفن اک دشت میں کراؤں گا

تیرگی میں فزوں، فزوں تر ہے
دھول کی مٹی، غبار کا جنگل
خاک کے اس گلاب کو مت چھو

(۱۹۵۰)

برٹولٹ برخت
(۱۸۹۸—۱۹۵۶ء)

آرام دہ کار میں سفر

ہم ایک آرام دہ کار میں سفر کرتے ہوئے
برستی بارش میں مضافات کی ایک سڑک سے نشیب کی طرف آرہے تھے
شام ڈھلے ہم نے چیتھڑوں میں ملبوس ایک شخص کو دیکھا۔
کافی نیچے جھک کر مؤدبانہ اس نے ہمیں اشارہ کیا کہ اسے بھی ساتھ بٹھا لیں
ہمارے سروں پر چھت تھی، کار میں گنجائش بھی، پھر بھی ہم نے سفر جاری رکھا
ہم نے مجھے ایک تنگ آواز میں کہتے ہوئے سنا: "نہیں،
ہم کسی کو بھی اپنے ساتھ نہیں لے جا سکتے"
ہم طویل راستہ، شاید ایک پورے دن کی مسافت، طے کر چکے تھے
جب اچانک مجھے اپنی اس آواز سے شدید دھچکا لگا
اپنے اس رویّے سے
اور اس ساری دنیا سے

(۱۹۳۷)		(نثر)

برٹولٹ برخت
(۱۸۹۸ء—۱۹۵۶ء)

گزرے زمانوں کے آثار

چاند رہتا ہے اب بھی آویزاں
رات کو ہر نئی عمارت پر
ساری تانبے سے ساختہ اشیاء
کے مقابل ہے پھر بھی ناکارہ
ماؤں نے اب سے ہی شروع کردیں
داستانیں جو پہیوں کی کہنی
کھینچتے تھے جو گاڑیاں، چھکڑے
جن کو کہتے تھے عرفاً گھوڑے
بین اقوام گفتگوؤں میں
یہ تو ہیچ ہے کہیں نہیں آتا
ذکر ان کا نہ اِن کے ناموں کا
موجۂ برق گیر، بالا بلند،
علم ان کو نہیں ذرا بھر بھی
کتنے گزرے ہوئے زمانوں کا

(۱۹۲۵ء)

جوہنس بوب رڈسکی
(۱۹۱۷ء — ۱۹۶۵ء)

ناچاقی

زمانہ
گردش میں ہے
ملبوس
خوش قسمتی میں
یا بدقسمتی میں
بدقسمتی کے دوران
وہ بگلے کی جھنجھناتی آوازمیں بولتا ہے،
اور بگلے —— وہ اس سے گریز کرتے ہیں۔
اس کی کلغی کالی
اس کے درخت، سائے
رات آتے ہی

اس کے راستے ہوائیں سے گزرتے ہیں۔

(نثر)
(۱۹۶۵)

ارنسٹ مائیش ٹر

(۱۹۱۱ء ——)

انجام کار

آخر میں
دو میں سے
ایک کہتا ہے:
ملے ہے تم سے
رسمِ وفا
آخر میں
دو میں سے
دوسرا بولا:
دیکھو، نا
ہر نزدیک
ہے کتنا دور
بہت بعید
بہت ہی دور

(۱۹۷۰)

ارنسٹ مائیس ٹر

(۱۹۱۱ء ——)

ایں جہانی

شہانِ مرحوم ہو نشستہ
جو اک رکابی کے حاشیے پر

سنائیں اک داستاں پری کی مجھ کو
مگر وہ خاموش ہیں۔
جبروت! تم سناؤ،

کہ وہ تو چپ ہیں

بتاؤ بھی مجھ پہ کون حکمراں ہے!

رکابی کھانے لگی ہے چکر

(۱۹۶۲ء)

ہلڈا ڈومن
(۱۹۱۲ء—)

چال

تم نے بات کی اس دم
کشتیاں جلانے کی
جل کے جب مری کشتی
ہو چکی تھی خاکستر
تم نے خواب دیکھا تب
ڈال دینے کا لنگر
جب پہنچ چکا تھا میں
درمیانِ سمندر
تم نے خواب دیکھا جب
ہو نئی دنیا میں گھر
دفن ہو چکا تھا میں
اجنبی زمیں اندر
اور عجب سے نام کا
پر عام جیسا اک شجر
اُگ چکا مجھی میں سے
جیسے سارے مُردوں سے
فرق کیا کہ کس جا پر

(۱۹۴۶)

ہلڈا ڈومن
(۱۹۱۲ء—)

جلاوطن

مرتے دم مُنھ
بھنچا کھنچا، کوشش میں کہ
ٹھیک تلفظ
"جلاوطن" کا ہو
ایک غیر زباں میں

(۱۹۶۴)

ہانز ورنر کوہن

(۱۹۱۶ء—)

نیند

نیند کیا ہے :
پسپائی
اندھیارے برآمدوں میں

تاآنکہ
خواب کے آئینے سے
دفعتاً نکل کر تم
ٹکراتے ہو خود، خود سے

اور یہ تصادم یوں
کرتا ہے تمہیں بیدار

ہانز ورنر کوہن

(۱۹۱۶ء—)

گراوٹ

اک صبح
اس کا چہرہ گر پڑا
آئینے کے اندر سے
سیدھا اس کے ہاتھوں میں

اس نے بس گرنے دیا

(۱۹۷۰—۱۹۷۲ء)

گن ٹر کونزٹ
(۱۹۲۹ء —)

بالکل بجا

بے مقصد اور با معنی بھی
اور چاہئے بھی
بے مقصد اور با معنی ہی
اس کو تو اٹھنا چاہئے ہی مٹی سے اور گارے سے
جس میں سے اینٹیں بنتی ہیں
بڑے بڑے محلوں کی اور قصروں کی
پھر سے تاکہ دھڑام سے گر جائیں وہ کیچڑ گارے میں
ایک بڑے ہی خوش کن دن

بے مقصد بھی با معنی بھی
جیسا کہ ہونا چاہئے ہی
وہ کام تو ہوگا ہی بھدّا
جو کام نہ آئے کچلنے کے
نہ ظلم وستم میں بحتا بحثی
اور اسی لئے بے مقصد ہے
اور اسی وجہ سے با معنی

جیسے کہ شاعری ہوتی ہے (۱۹۷۴)

ہانز میگنس این زین برگر
(۱۹۲۹ء ——————)

سایوں کی مملکت

یہاں اب بھی مجھے دکھتی ہے اک جا
جو ہے آزاد
اس سائے کے اندر

یہ سایہ جو
نہیں بکری کی خاطر

سمندر بھی تو شاید ڈالتا ہے
سایہ
وقت بھی تو اس کی طرح ہی

تو جنگیں سایوں کی ہیں
محض کھیلیں
کوئی سایہ
نہیں بنتا رکاوٹ دوسرے کی روشنی میں

جو ہیں سایوں میں رہتے اُن کو جاں سے
ہے مشکل مار دینا

بس اک لمحہ
قدم رکھتا ہوں میں سائے سے باہر
فقط لحظہ برابر
جنہیں خواہش ہے دیکھیں روشنی کی
حقیقت
وہ چُھپیں سایوں کے اندر
جو روشن تر ہے سورج سے
وہ سایہ
خنک سایہ وہ آزادی کا سایہ

مکمل طور پر سائے کے اندر
جو ہو جاتا ہے غائب میرا سایہ

کہ پنہائی میں سائے کے
ابھی
سما جانے کی گنجائش ہے باقی

(۱۹۶۴)

والٹر ہلموٹ فرز
(۱۹۲۹ء ——)

جزر

پتھر گھونگھا، کارک کا ٹکڑا
ریڑھ کی ہڈی
دُھل دُھل کر ستھری نتھرائی
جس کے پیچھے
اٹھتا نہیں ہے کوئی اندھیرا، اب
جیسے کہ اٹھتا تھا
ہڈی جسم کا حصّہ تھی جب
لیکن جیسے ہی لہر مُڑی
تو لے گئی اپنے ساتھ وہ چیز
جو تھی دکھائی دیتی بس ایک لمحہ پہلے۔

(۱۹۷۲ء)

گُن ٹرام وِسپر
(۱۹۴۱ء ——)

مانوس خبریں

میرے کھانوں کے دوران
وہ سب باتیں کرتے ہیں
ہیجانوں کی
یہیں تلک ہو، تب بھی خیر!
زچ ہو کر رکھ دیتا ہوں
اپنا کانٹا، لیں تو
بولنے والا سمجھے ہے
آمد ہے طوفانوں کی
یہ کچھ ہوتا رہا کیا ہے
عرصے سے اک مدّت سے

۱۹۶۶ء

گُن ٹرام ڈسپر
(۱۹۴۱ء—)

مجھے کس بات کا ڈر ہے

بہ طورِ مہماں مقیم
ایک دوست کنبے کے ساتھ
سرما کا منتظر ہوں
ہراس ذرّہ سا بھی نہیں ہے
جو منجمد ایک ہاتھ ہو جائے
دوسرا تو ہوگا ہی سلامت
جو چھت مرے سر پہ گر بھی جائے
تو میرے پاؤں فنا نہ ہوں گے
جو بے ارادہ ہی
اگلا گرما نہ آئے
جیسا کہ ہو چکا ہے
درخت ایک بھی نہ جاں بر ہوگا — خیر
تب میں اٹھاؤں گا حظ
تصوروں سے جزائے خوش کن کے
آخرت میں

(۱۹۶۶)

گُن ٹرام ڈسپر
(۱۹۴۱ء-)

روز کا واقعہ

کھیل میں مار دھاڑ کی
خواہش

کہہ دیا اس سے
اوبے! اُسُرخے سوز!

ایک دی اس نے
میری پسلی میں

میرا ہی اپنا انتخاب
غلط

وہ عبادت گزار انگلا اُف

(۱۹۶۶ء)

گبرائلڈ سِنگر
(۱۹۳۴ —)

ایک پریشان کن سوال کا جواب

شاعری کیا ہے ؟
شاعری کیا ہے ؟
شاعری کیا ہے ؟
ایڈریا نو اسپا ٹولا

کہتا ہے
پوچھتا ہے
لوگوں سے جو ہیں کہتے
کہتا ہے ،
شاعری
کچھ بھی تو نہیں ہے
کیونکہ

کیونکہ اور کیونکہ اور
اس کا فائدہ کیا ہے ؟
ایڈریانو

درست بھی نا درست بھی ہے
بجا
کہ تاریخ میلو وان جیلاس نے لکھا ہے

ہمیشہ رہتی ہے تاک میں کم سے کم مدافعت کی
تو شاعری
کا وجود بھی ہے
بنا خوشی بھی
بنا محبت بھی
اور آزادی کے بنا بھی
بغیر امید بھی
اور روشنائی کے بنا بھی
کہ جیسے تاریخ ہے
جو ہمیشہ ہے تاک میں
کم سے کم مدافعت کے راستے کی
اور جو
بنا خوشی بھی
بنا محبت بھی
اور آزادی کی بنا بھی
بغیر امید بھی
اور روشنائی کے بنا بھی
وقوع میں آتی ہے محض
اتنی بے کار ہی ہے
جتنی کہ شاعری
جو اسی طور لامحالہ
وقوع میں رہتی ہے آکے
لیکن
نگاہ اس کی خوشی، محبت، امید و آزادی ڈھونڈتی ہے،

اور یوں

بنا سیاہی کے
بال پن
موقلم
ٹائپ رائٹر کے بھی
ہمیشہ
بلا کسی فائدے کے
انتخاب کرتی ہے
رستہ مدافعت کا
سو یہ
فقط اور صرف یہ ہے
خوبی و حسن
(شاعری کا)

(۱۹۷۰ء)

جُرگُن تھیو بالڈی
(۱۹۴۴ء ———)

باورچی خانے کا محاذ

میں نے اپنے ریفریجریٹر کو کھولا' اندر جھانکا
ٹھنڈا ہے پر خالی ہے
ٹھنڈا بھی اور خالی بھی
اس کی سفیدی یاد دلاتی ہے مجھ کو
قطبِ شمالی کے اُفقوں پہ مناظر کی
برف سے پُر انسان کے ہاتھوں سے محفوظ
کام کی چیز وہاں پر کوئی اُگتی نہیں
قیمتیں گر اس طرح سے یاں چڑھتی ہی رہیں
ہر سُو پھر تو برف ہی پڑنے لگ جائے گی
قیمتوں کا بھی برف زمانہ آئے گا
اُفقی منظر یعنی خالی خولی ریفریجریٹرز کا
ہم کو جتنی اب لگتی ہے
اس سے زیادہ کہیں زیادہ، سردی لگنے لگ جائے گی
جو کچھ ہم کھاتے ہیں' اس کا فیصلہ ہوتا ہے،
نہ باورچی خانے میں اور نہ ہی سرد الماری میں
شاید یہ ہے خیال اچھوتا
پڑھنے والا فیصلہ کرلے خود ہی یہ

شاید اس سے مدد ملے مجھ کو اس نظم کے لکھنے میں
لیکن اس لمحے اور کل بھی
بہتر ہوگا میں تیار رکھوں ایک چاپ کی خاطر اپنا فرائی پان
گرنہ جم کر رہ جائے
میری رگوں میں خون کہ جس دم
مجھ کو بتائے قیمت اس کی
القصاب

(۱۹۷۴ء)

سلیم احمد

غزل

صبح سے شام تک جاگنا شام سے جاگنا تا سحر جاگنا
چشمِ بے خواب یہ تیری تقدیر ہے تیری تقدیر ہے عمر بھر جاگنا

میرے ادراک کی انتہا بے نشاں میرے احساس کی سرحدیں بیکراں
منزلِ خواب کا اک مسافر ہوں میں اور ہے میرا رختِ سفر جاگنا

جب ذرا دوپہر دھوپ ڈھلنے لگے جب ذرا شام کے سائے بڑھنے لگیں
درد کی موج جب دل میں اٹھنے لگے تم بھی اے میرے دیوار و در جاگنا

یہ عدم ہے کہ ہے اک شبِ بیکراں سلسلہ ہے عدم کا کہاں سے کہاں
اور میسر ہوا ہم کو اس رات میں اک دیئے کی طرح مختصر جاگنا

اس میں گمراہیوں کا خطر ہے بہت اور پھر رہزنوں کا بھی ڈر ہے بہت
سو نہ جانا کہیں رہروانِ وفا دیکھنا رہگزر رہگزر جاگنا

راحتِ یک شبی خواہشِ نفس کی بال کھولے ستارے اڑاتی ہوئی
دیکھ دشت بلائے ہوس سے یہی رہ کے ہشیار اے ہمسفر جاگنا

سلیم احمد

غزل

ہمیں بھی یاد ہے عالم جو بزمِ یار میں تھا
دلِ خراب وہاں تو کسی شمار میں تھا

سبب یہ ہے مری بڑھتی ہوئی اداسی کا
میں شام ہی سے نئے دن کے انتظار میں تھا

مرے جنوں کا کسی فصل سے نہیں پیوند
خزاں میں بھی وہی عالم ہے جو بہار میں تھا

مجھے خبر نہ ہوئی یہ ہوا کی سازش تھی
وہ اک غنیم کا لشکر تھا جو غبار میں تھا

وہ چاہتے تھے مگر میرے دوست کیا کرتے
مرا نصیب تو دشمن کے اختیار میں تھا

وہ میرا عہدِ وفا تجھ کو یاد ہو کہ نہ ہو
کبھی تو میں بھی تری چشم اعتبار میں تھا

غزل

قرب کیسا یہ جسم وجان میں ہے
پھر بھی اک فصل درمیان میں ہے

صرف میں ہی نہیں اداس اتنا
اک ستارہ بھی آسمان میں ہے

سنگ باری سی شب کو ہوتی ہے
کوئی آسیب اس مکان میں ہے

ڈھونڈتا ہوں ہدف نہیں ملتا
ایک ناوک مری کمان میں ہے

دیکھئے صبح کیا دکھاتی ہے
رات سے کچھ مرے گمان میں ہے

حرف سے دل جھلسنے لگتے ہیں
کوئی شعلہ مری زبان میں ہے

اک خریدار پوچھتا ہے سلیم
مال کتنا تری دکان میں ہے

سلیم احمد

غزل

پہلے سُنتے تھے اب تجربہ ہو گیا اک خلل آ گیا ہے خورو خواب میں
یاد آیا کہ یوں ہی نظر آئی تھی میرؔ کو بھی تو اک شکل مہتاب میں

مجھ کو بے تابیوں میں سکوں کب ملا جلتی آنکھیں ہیں بیداریوں کا صلہ
عمر اس کی تلاش و طلب میں کٹی ایک دنیا نظر آئی تھی خواب میں

مُضطرب کر رہا ہوں میں ماحول کو ان سوالات سے جیسے بچہ کوئی
گہرے پانی میں اک کنکری پھینک دے اور ہلچل سی مچ جائے تالاب میں

اب تو اک بے کلی ہے مری روح میں اور ویران سا ہے سوادِ نظر
سوچتا ہوں نئے موسموں میں کہ تھیں کتنی گہرائیاں چشمِ پُر آب میں

عصرِ نو میں ترے کرب کو جھیلتا صبحِ فردا کے غم میں سُلگتا رہا
جیسے کوئی دِیا جل رہا ہو کہیں ایک ویران مسجد کی محراب میں

چاند سے پوچھتی ہے ہوائے سحر اے نگہدارِ شب ناظرِ خشک و تر
ساحلِ بحر سے سر پٹکتا رہا کون تھا رات بھر موجِ بے تاب میں

ادا جعفری

غزل

اُجالا دے چراغِ رہگزر آساں نہیں ہوتا
ہمیشہ ہو ستارا ہم سفر آساں نہیں ہوتا

جو آنکھوں اوٹ ہے چہرہ اُسی کو دیکھ کر جینا
یہ سوچا تھا کہ آساں ہے مگر آساں نہیں ہوتا

بڑے تاباں بڑے روشن ستارے ٹوٹ جاتے ہیں
سحر کی راہ تکنا تا سحر آساں نہیں ہوتا

اندھیری کاسنی راتیں یہیں سے ہو کے گزریں گی
جلا رکھنا کوئی داغِ جگر آساں نہیں ہوتا

کسی دردآشنا لمحے کے نقشِ پا سجا لینا
اکیلے گھر کو کہنا اپنا گھر آساں نہیں ہوتا

جو ٹپکے کاسۂ دل میں تو عالم ہی بدل جائے
وہ اک آنسو مگر اے چشمِ تر آساں نہیں ہوتا

گماں تو کیا یقیں بھی وسوسوں کی زد میں ہوتا ہے
سمجھنا سنگِ در کو سنگِ در آساں نہیں ہوتا

نہ بہلاوا نہ سمجھوتا جُدائی سی جدائی ہے
اداؔ سوچو تو خوشبو کا سفر آساں نہیں ہوتا

اختر ہوشیار پوری

غزل

دستِ ہُنر میں سارا تصرف ہنر کا ہے
اور میں بھنور میں ہوں کہ یہ عالم بھنور کا ہے

کاغذ پہ جو لکیریں تھیں بارش سے ڈھل گئیں
شاید یہ سارا نقشہ مرے بام و در کا ہے

مٹی پہ جتنی دھوپ تھی آنگن میں آ گئی
شاید کہ طائروں کا ارادہ سفر کا ہے

جو آنکھ بھی اٹھی ہے وہی آنکھ بِک گئی
چرچا تمام شہر میں نیلام گھر کا ہے

میں ذات کے سفر میں انا تک نکل گیا
اب دل ہی جانے آگے ارادہ کدھر کا ہے

سوچ کی دھڑکنوں سے سمندر لرز اٹھے
لیکن یہ سب قصور مری چشمِ تر کا ہے

آگے انا ہے پیچھے رِیا، درمیاں خلا
یہ درمیاں کا رستہ ہی اپنے سفر کا ہے

اختر دیارِ دوست صفِ دشمناں میں ہے
اور دشمنوں سے واسطہ ہی سنگ و سر کا ہے

غزل

کوئی تصویر تو ہو دھوپ کا منظر ہی سہی
شاخ پر کچھ نہ سہی ٹوٹا ہوا پَر ہی سہی

سائے لمبے ہوں تو قد اور بھی گھٹ جاتا ہے
شام کے سائے مرے گھر کے برابر ہی سہی

کسی پتھر میں اسے بھی کوئی چہرہ نہ ملا
وہ صنم گر ہی سہی وقت کا آذر ہی سہی

میں کسی طور تو بہلاؤں نگاہیں اپنی
نہ سہی چاکِ سحر چاکِ گلِ تر ہی سہی

اک فقط نام ہے اپنا کہ جو اب یاد نہیں
نام ہر چیز کا ورنہ مجھے ازبر ہی سہی

میں پلٹ کر بھی نہ دیکھوں گا گزر جاؤں گا
اے ہوا دَر مرے رستے میں مرا گھر ہی سہی

چوک میں نصب جو بُت تھا ہوا ریزہ ریزہ
میں بھی اس دشت میں اک خاک کا پیکر ہی سہی

چاند کی رتھ سے وہ اترے تو مرے گھر اترے
ورنہ گردوں پہ فروزاں کوئی اختر ہی سہی

اختر ہوشیارپوری

غزل

جرمِ ناکردہ کی خوابوں سے صفائی مانگوں
اور پھر رات کے زنداں سے رہائی مانگوں

مجھ کو کیا کیا نہ ہوئے تجربے ہاتھوں اپنے
زندگی بھر کے لئے خود سے جدائی مانگوں

سر اٹھانے نہیں دیتے ہیں زمانے مجھ کو
میں کہ اک لمحہ ہوں لمحے کی خدائی مانگوں

کب کسی رائی نے بخشا ہے کسی کو پربت
اب یہ سوچا ہے کہ پربت ہی سے رائی مانگوں

سر پہ سورج ہو تو پتھر بھی جھلس جاتے ہیں
میں چٹانوں کی بلندی سے ترائی مانگوں

میری دیواریں مرے قد سے بھی اونچی ٹھہریں
خود سے نکلوں صلۂ بال کشائی مانگوں

زندگی حاصلِ مجموعۂ اضداد ہی ہے
خود کو بھی چاہوں میں ان تک بھی رسائی مانگوں

لوگ صحراؤں میں منزل کا نشاں ڈھونڈتے ہیں
میں مگر حوصلۂ آبلہ پائی مانگوں

دن کے سورج میں بصارت کو گنوا آیا ہوں
[illegible] مانگوں

[illegible]

غزل

گھروں میں بیٹھے ہوئے دھوپ کی پناہ میں تھے
مرے رفیق مگر منزلوں کی چاہ میں تھے

یہی نہیں کہ زمانے کا سامنا تھا ہمیں
ہمارے اپنے قدم بھی ہماری راہ میں تھے

طنابیں ٹوٹ گئی تھیں لہو کی بارش سے
مسافروں کی جگہ تیر خیمہ گاہ میں تھے

مچان پر تھے شکاری زمین پر میں تھا
مگر تمام پرندے مری نگاہ میں تھے

کھلی کتاب سے چہرے تھے آئینوں کی طرح
عجیب لطف مگر حرفِ لا الٰہ میں تھے

اگرچہ تارے بھی تھے ہاتھ میں چراغ بھی تھا
ہزار حادثے پھر بھی شبِ سیاہ میں تھے

مری حیات کے ناپے ہیں فاصلے کس نے
کوئی تو میری طرح شب کی بارگاہ میں تھے

وہ سارے زخم ہی تھے جنکو چھو کے دیکھا تھا
سجے ہوئے جو پروں کی طرح کلاہ میں تھے

بس اک تمہاری گواہی پہ ہے رہا ہونا
کہ اک تمہیں تھے جو شامل مرے گناہ میں تھے

یونہی تو ہاتھ کا سایہ نہیں تھا آنکھوں پر
مرے خیال کے پیکر مری نگاہ میں تھے

مرے وجود کے ملبے میں دفن ہیں ہی تھا
گئے زمانے بھی اختر دل تباہ میں تھے

انجم اعظمی

غزل

رہی تمنائے وصل آوارہ عمر بھر کی مسافتوں میں
دبی ادھوری محبتوں کے چراغ جلتے ہیں خلوتوں میں

یہ شہر کیسا ہے اے عزیزو، سمجھ گئے ہو تو کچھ بتاؤ
عذاب میں چھوڑتا ہے تنہا، شریک رہتا ہے راحتوں میں

جو عمر بھر ایک ایک چہرے کو غور سے دیکھتا رہا ہوں
وہ کون ہے جس کو ڈھونڈتا ہوں میں خال و خط کی شباہتوں میں

خموش تھے ہم کہ محو تھے گفتگو میں ایک دوسرے سے باہم
نہ پوچھ ہم سے، بیاں ہوتی ہے جو بات دل کی اشارتوں میں

برہنہ اس کا بدن ہے مدہوش چاندنی کے نشے میں ڈوبا
بسا ہے بستر چنبیلی، بیلا، گلاب، جوہی کی نکہتوں میں

جب ایک مدت سے لفظ و معنی کے سارے رشتے بکھر چکے ہیں
کہاں سے پائے وہ لفظ تو نے ادا کیے جو بشارتوں میں

کسی سے ہوتی ہے دل لگی اور کسی سے دل کی لگی ہوتی ہے
مجھے پتا ہے کہ مجھ کو یوں ہی خراب ہونا ہے چاہتوں میں

پرتو روہیلہ

غزل

تیری یاد کی ٹیسیں اٹھیں رہ رہ کر یوں جانی ہو
پوہ کی ٹھنڈی رات میں جیسے دکھتی چوٹ پرانی ہو

دل کی بات بتاؤں کس کو سمجھے کون پرائی پیر
من بپتا کا ساجھی بنانا چھاتی چیر دکھانی ہو

ہم پردیسی تیرے نگر میں آن کی آن ہی ٹھہریں گے
کل کی ہونی وہ ہی بوجھے جس کو گوٹھ بسانی ہو

تیرے روپ کا چندا چمکا بستی بستی گاؤں گاؤں
میرے پیار کی خوشبو پھیلی بن بن رات کی رانی ہو

من تو ایسا الھڑ بالک مانگے انگاروں کا کھیل
جیون وہ کٹھنائی کا رستہ چاہے چال سیانی ہو

پیار تو وہ مورکھ کی ارتھی مرنے والا آپ اٹھائے
پریت تو وہ چھاتی کی اگنی رو رو آپ بجھانی ہو

پرتو اس بستی کے پنچھی کتنے بھولے بھالے ہیں
ایسی بگیا پر منڈلائیں راکھی جس کی پٹھانی ہو

پرتو روہیلہ

غزل

اک گائے بندھی ہے کھونٹے سے، قصاب اسے ہولائے ہے
کبھی رسّا اس پکڑ کر کھینچے ہے کبھی چھریوں کو کھنکائے ہے

یہ رسّی مہلت جیون کی، یہ کھونٹا لوگو بھاگ اُس کا
قسمت کی اس تکلی پر بے بس نت چکر کھائے ہے

قصاب سے کوئی جا پوچھے کیا جوڑ ہے تیرا گائے کا
اس دکھیا پر اس بے بس پر کیوں زور اپنا آزمائے ہے

اک سانس کی ڈوری گردن میں، اک پیار کی بیڑی پیروں میں
یہ بندھن کیا کم بندھن ہیں جو بھاگوں اور بندھائے ہے

جو ناند کنھالی کے اوپر کچھ دیکھ نہ پائی کیا جانے
جو دانہ گھاس کھلاوے وہ کیوں پھندا ڈال گرادے ہے

جس ہاتھ کلہاڑا جمدھر ہے جس ہاتھ گنڈاسا خنجر ہے
وہ ہاتھ کمر کیوں رکھے ہے کیوں چلتے میں رک جائے ہے

جب دھار چھری کی رکھنا ہے اور بوٹی بوٹی کرنا ہے
جب بھوک سے جان نکلتی ہے جب باگھ کے ڈر سے مرتی ہے

کیوں دانہ گھاس کھلائے ہے کیوں رہ رہ پانی پلائے ہے
اس پیار کی بندی کو پھر بھی بس چرواہا یاد آئے ہے

کبھی سادھو سنت کی کٹیا میں کبھی سائیں فقیر کے ڈیرے پر
ترے پیار کا موہ کھ بیراگی مجھے کس کس جا لے جائے ہے

اس وقت کے بہتے دریا میں کیا آج اور کل کا فرق میاں
کوئی گھر کے دوارے گرتا ہے کوئی رستے میں مر جائے ہے

شاہد عشقی

غزل

اک شخص کے نہ ہونے سے ویراں ہے سارا شہر
اے دل زدو! بسایا ہے تم نے یہ کیسا شہر

بے مہر سنگ و خشت تو بے سایہ ہر شجر
لگتا ہے دوستو یہ قرائن سے اپنا شہر

آسیب کھا گیا کہ نظر لگ گئی اُسے
اب خواب ہو گیا ہے وہ اِک ہنستا بستا شہر

دلّی تو سات بار لُٹی اور بس گئی
لیکن اُجڑ کے پھر نہ بسا اپنے دل کا شہر

اب حال یہ ہے اٹھے کسی سمت بھی دھُواں
میں سوچتا یہی ہوں کہ جلتا ہے میرا شہر

عشقی، غریبِ شہر کہے بھی تو کیا کہے
جس کا ہے شہرِ یار، اسی کا ہے سارا شہر

غزل

گرچہ تفسیرِ محبت تھی جوانی اُس کی
شہر والوں نے کبھی قدر نہ جانی اس کی

چند یادوں کے ورق، چند ورق خوابوں کے
دو ہی ابواب میں تھی ختم کہانی اس کی

اس کی ہی آنکھ سے ہر آنکھ کا آنسو ٹپکا
عجب انداز کی تھی اشک فشانی اس کی

شعر جب اس نے لکھے، دل کے لہو سے لکھے
سب سمجھتے تھے جسے سحر بیانی اس کی

اس کے ہر لفظ میں پوشیدہ معانی تھے ہزار
خامشی بھی تھی اک اعجاز بیانی اس کی

اس کا ہر روز رہا وقفِ نگارانِ غزل
نذرِ میخانہ تھی ہر شام سہانی اس کی

زیست کے دونوں سرے اس نے جلا رکھے تھے
مختصر لکھی تھی قدرت نے کہانی اس کی

آگ سے خاک ہوا، خاک بھی آخر نہ رہی
بے نشانی ہی فقط ٹھہری نشانی اس کی

عشقی جس شخص نے ہنس ہنس کے پیا زہرِ حیات
زیب دیتی نہیں کچھ مرثیہ خوانی اس کی

جمال پانی پتی

غزل

رات یادوں کی برکھا برستی رہی، دھیان بچھڑے زمانوں کا آتا رہا
آنکھ میں راکھ بیتے دنوں کی لئے، میں گئے موسموں کو بلاتا رہا

شہر سے دشت میں دشت سے شہر میں، لہر سی اک ملاتا ہوا لہر میں
میں سرِ شہرِ جاں رقص کرتا رہا، میں سرِ دشتِ دل خاک اڑاتا رہا

آنکھ میں در کھلا تھا طلسمات کا، بھید کھلتا نہ تھا پر کسی بات کا
آئینہ سا دکھاتی رہیں حیرتیں، کوئی پردے اٹھاتا گراتا رہا

رات کی اوڑھنی کے ستارے بجھے، بجھنے والے جو تھے دیپ سارے بجھے
درد کے چاند کی چاندنی میں مگر، شہرِ جاں رات بھر جگمگاتا رہا

کچھ خیالوں کا خوابوں کا میں نقش گر، اور تو کچھ نہ تھا پاس اپنے مگر
کچھ خیال آنکھ میں صورتِ خواب تھے، نقش کیا کیا انہی سے بناتا رہا

احمد مشتاق

غزل

کہاں کی گونج دلِ ناتواں میں رہتی ہے
کہ تھرتھری سی عجب جسم و جاں میں رہتی ہے

قدم قدم پہ وہی چشم و لب وہی گیسو
تمام عمر نظر امتحاں میں رہتی ہے

مزہ تو یہ ہے کہ وہ خود تو ہے نئے گھر میں
اور اس کی یاد پرانے مکاں میں رہتی ہے

اگرچہ اس سے مری بے تکلفی ہے بہت
جھجھک سی ایک مگر درمیاں میں رہتی ہے

پتہ تو فصلِ گل و لالہ کا نہیں معلوم
سنا ہے قرب و جوارِ خزاں میں رہتی ہے

میں کتنا وہم کروں لیکن اک شعاعِ یقیں
کہیں نواحِ دلِ بدگماں میں رہتی ہے

ہزار جان کھپاتا رہوں مگر پھر بھی
کمی سی کچھ مرے طرزِ بیاں میں رہتی ہے

ماجد الباقری

غزل

بستی کا شور ذہن کے اندر لگا مجھے
سب سو رہے تھے رات بڑا ڈر لگا مجھے

تنہا تھا وہ مگر مجھے احساس جرم تھا
سایہ بھی اس کا قد کے برابر لگا مجھے

اتنی تھکن کہ نیند کی چادر نہ ہٹ سکی
اندر جو چور تھا وہی باہر لگا مجھے

ایک لمس گرم روح کے اندر اتر گیا
میں سو گیا تو ہاتھ بھی پتھر لگا مجھے

خواہش کے جس حصار میں پھنس کر نکل گیا
وہ بھی حصار گنبدِ بے در لگا مجھے

وہ مر گیا تو ماتھے سے میرے چمٹ گیا
مارا تھا اس کو میں نے جو خنجر لگا مجھے

آنکھوں کی شش جہات میں صدیوں کی گرد باد
قطرہ جو تھا پلک پہ سمندر لگا مجھے

فکرِ معاش جسم سے آرام لے گئی
میں تھک گیا تو فرش بھی بستر لگا مجھے

ہر فرد خواہشوں کے مطابق تھا خوش مزاج
جو گھر بھی تھا حساب کا دفتر لگا مجھے

تاج سعید

غزل

حسین چہروں سے جب دلہن کی طرح سجے تھے دریچے میرے
اسی میں دیکھے تھے میں نے گوری بسے نشے میں ڈوبے نین تیرے

غضب ہیں گوری یہ نین تیرے کہ جس طرح ہوں حسین آہو
پلک جھپک میں جھٹک کے رکھ دیں اُفق اُفق تک گھنے اندھیرے

یہ چاند چہرہ سیاہ زلفوں کے جال میں جگمگا رہا ہے!
کہ جیسے بادل اُفق میں پھیلی حسین تر چاندنی کو گھیرے

گلاب چہروں سے دل کے آنگن کی وسعتیں یوں سجی ہوئی ہیں
بہار کی رُت نے جیسے میرے ہی گھر میں ڈالے ہوئے ہوں ڈیرے

یہ ہاتھ کس کا ہے جو گلستاں کے رنگ و نکہت سے کھیلتا ہے
اجاڑ کر رکھ دیئے ہیں کس نے چمن میں یاردگلی کے ڈیرے

اُداسیاں ہیں چمن میں اپنے، جگہ جگہ زخم سے لگے ہیں
یہ کون ہیں جو بجھا رہے ہیں مرے وطن کے حسیں سویرے

احمد ہمدانی

غزل

ہو رہا ہے ذکر کس کا دھوپ میں
بہہ رہا ہے ایک دریا دھوپ میں
خود کو جب دیکھا تو یہ آیا نظر
کھیلتا ہے ایک بچہ دھوپ میں
الغرض دوری کا یہ دن بھی کٹا
جا گرا اک اور پتہ دھوپ میں
چھاؤں پیڑوں میں نہ دیواروں میں ہے
آ گیا یہ کیسا رستہ دھوپ میں
جان پہلے ہجر میں آدھی ہوئی
جل گیا پھر جسم سارا دھوپ میں
چھاؤں پلکوں کی گھنیری تھی بہت
ہم نے چھیڑا ہے یہ قصہ دھوپ میں
ہم سفر دو شخص تھے لیکن یہ بات
ایک کھیلا ایک جھلسا دھوپ میں

غزل

مل رہا ہے حال دل کا دشت سے
اٹھ رہا ہے اک بگولا دشت سے
بس گیا ہے خوف کیسا شہر میں
آ رہا ہے کوئی سایہ دشت سے
زندگی خالی بھی ہے بے حال بھی
بات کرتا ہوں میں کیا کیا دشت سے
شہر جاتے ہیں کہاں کس کو خبر
شہر کو آتا ہے رستا دشت سے
آگ برساتی ہے دیواروں کی چھاؤں
کوئی لا دے پیڑ سوکھا دشت سے
کہہ رہا ہے کیا اداسی کا سماں
راز یہ بھی پوچھنا تھا دشت سے

منظر ایوبی

غزل

زہرِ دانش نہ سہی، تلخیٔ گفتار ملے
غم مقدر ہے تو پھر کوئی بھی آزار ملے

ہم اگر اتنے بُرے تھے تو ہماری خاطر
رقص کرتے ہوئے کیوں لوگ سرِ دار ملے

میں تجھے ٹوٹ کے چاہوں گا مگر شرط یہ ہے
تھک کے بیٹھوں تو کہیں سایۂ دیوار ملے

خونِ بسمل سے فروزاں ہے اگر شعلۂ عشق
پھر یہ اعزاز مجھے بھی مرے سرکار ملے

چھت ٹپکنے کی خبر تھی نہ جنھیں طوفاں کی
اب کے بارش میں وہ دیوانے بھی ہشیار ملے

خلعتِ زخم سے جسموں کو سجا کر نکلو
اس بھرے شہر میں شاید کوئی غمخوار ملے

پر حرمِ عشق زلیخا ہے نگوں سار بہت
کوئی تو یوسفِ دوراں کا خریدار ملے

میں اکیلا ہی تیراتا رہا کشتی تیری
دریا اُترا تو کئی یارِ طرح دار ملے

غزل

گیا وہ دورِ قدح، وہ قدح شکن بھی گیا
شبِ نشاط گئی، کارِ انجمن بھی گیا

رہا نہ سیلِ زمانہ سے کوئی گھر محفوظ
تری قبا بھی گئی میرا پیراہن بھی گیا

یہ کس عدد سے کیا آپ نے مجھے تقسیم
پتہ چلا کہ میرا حاصلِ سخن بھی گیا

تمہارے عہد میں کس کس کا مرثیہ لکھوں
متاعِ جاں تو لُٹی تھی، وقارِ فن بھی گیا

اُلجھ کے دیکھ لیا سرپھری ہواؤں سے
قناتِ جاں ہی نہیں خیمۂ بدن بھی گیا

چلی کچھ ایسی ہوائے نفاق اَب کے برس
کلاہِ شیخ ہی کیا، تاجِ برہمن بھی گیا

دیارِ غیر میں کس طرح سر اٹھا کے چلوں
کہ جس پہ ناز تھا منظرؔ وہ بانکپن بھی گیا

صمد انصاری

غزل

کتنے گدازِ شب سے ستارے ہو ہوئے
کیا کیا نگار رات کو صَرفِ سبو ہوئے

ہونٹوں سے بات بڑھ کے نگاہوں میں آ گئی
ایسے بھی کچھ کنائے سرِ گفتگو ہوئے

بارِ خلوص ہو گئیں مردم شناسیاں
اک دوست کی تلاش میں کتنے عدو ہوئے

پسپائیوں کی راہ کھلی خانقاہ میں
بے دست و پا جو لوگ تھے اہلِ وضو ہوئے

دستِ ہوس تھا جن میں زلیخائے عمر کا
وہ دامنوں کے چاک تو کب کے رفو ہوئے

روشن ہوئے ہیں آج ہواؤں کے نور سے
وہ طاق جو چراغ کی کل آبرو ہوئے

کچھ بھی ملا نہ راہ میں جز نقشِ پا مگر
دن کے قدم تمام شبِ جستجو ہوئے

کوہسار شب کے ڈوب گئے شبنموں تلے
سب حوصلے جنوں کے ہم آرزو ہوئے

پروانہ فاطری نے کیا انجمن کو خاک
محفل کے سب چراغ صمدؔ شعلہ خو ہوئے

غزل

آنکھ میں خواب کی اُتری نہیں تعبیر ابھی
اپنے رنگوں سے شناسا نہیں تصویر ابھی

رہگزاروں کے ہیں پابند سفر ہو کہ قیام
پاؤں سے راہ کی اُتری نہیں زنجیر ابھی

وقت رک جائے گا اک دن مرے لمحوں کے سبب
وجہِ تشویش نہیں ہے مری تاخیر ابھی

کلمۂ حق کو ترستا ہے سخن ہو کہ کلام
ان نیاموں کو میسّر نہیں شمشیر ابھی

ذکر سے اُس کے کھلے گا مرے انفاس کا رنگ
بند ہے مجھ میں مرے نام کی تاثیر ابھی

میرے چہرے پہ ہے واجب مری صورت کا سراب
قرض ہے مجھ پہ مرے جسم کی تسخیر ابھی

رُخ در و بام کے ہیں اپنی بلندی کی طرف
اپنی بنیاد سے واقف نہیں تعمیر ابھی

پیکرِ شمع میں خود ڈوب گئی شمع کی لو
خاکِ پروانہ ہوئی بھی تو کھلی اکسیر ابھی

کیا لکھیں لوحِ مقدر کے قبالے میں صمدؔ
جن کی قسمت میں نہیں کاتبِ تقدیر ابھی

جمیل یوسف

غزل

ہر قدم دھرنے آئینہ دکھایا ہے مجھے
محوِ حیرت ہوں کہ کیا چیز بنایا ہے مجھے

تیری دوری بھی ہے مشکل تیری قربت بھی محال
کس قدر تو نے مری جان ستایا ہے مجھے

تیرے فردوس کی ہنسریں مری خاطر ہیں تو کیوں
پیاس کے دشت میں حیران پھرایا ہے مجھے

تو کسی پھول کسی آنکھ کے پردے میں رہا
تو نے کب اپنا حسیں چہرہ دکھایا ہے مجھے

وہی پلکوں کا جھکاؤ وہی آنکھوں کی چمک
شاہ نے حسن ترا یاد دلایا ہے مجھے

اور کے چہرے میں اسے ڈھونڈ رہا ہوں کب سے
مرحلہ یہ بھی محبت نے دکھایا ہے مجھے

جس قدر آگے بڑھوں تشنگی کچھ اور بڑھے
یہ عجب راستہ ہے جس پہ لگایا ہے مجھے

ساری مخلوق سے تقویم میں احسن ہوں میں
اور پھر آگ کا ایندھن بھی بنایا ہے مجھے

اپنی تخریب پہ نادم ہوں نہ تعمیر پہ خوش
تو نے ڈھایا ہے مجھے تو تے بنایا ہے مجھے

غزل

خود اپنی ذات کا نام و نشان بھول گئے
رہا ہوئے تو پرندے اُڑان بھول گئے

اس انہماک سے کارِ زمیں میں محو ہوئے
زمیں پہ چھایا ہوا آسمان بھول گئے

ہر امتحان میں پہلا سبق تو یاد رہا
کتابِ عشق کہیں درمیان بھول گئے

نہ ٹھہرنا ہی مناسب نہ اُٹھ کے جانا ہی
بُلا کے گھر میں ہمیں میزبان بھول گئے

اس اجنبی کی رفاقت میں ایسی خوشبو تھی
ہم اپنے سارے سفر کی تھکان بھول گئے

نہ کر نمود کی خواہش کہ یہ جہان والے
بڑے بڑوں کا بھی نام و نشان بھول گئے

کچھ اس طرح غمِ عمرِ رواں نے خاک کیا
فراق و وصل کی سب داستان بھول گئے

انور شعور

غزل

دیکھ تو گھر سے نکل کر کہ گلی میں کیا ہے
تجھ میں کچھ بھی نہ سہی، اور کسی میں کیا ہے

دیدہ ور! حسن کی تعریف سبھی کرتے ہیں
بات سب حسن میں ہے، دیدہ وری میں کیا ہے

کون ہے جو نہیں تکتا ترے منہ کی جانب
سب میں ہوتی ہے ہوس، ایک مجھی میں کیا ہے

ملتے رہتے ہیں بہت لوگ تمہارے جیسے
پر سمجھ میں نہیں آتا کہ کسی میں کیا ہے

سب کچھ احساس پہ موقوف ہوا کرتا ہے
غم میں کیا ہے مرے غم خوار، خوشی میں کیا ہے

ثانیوں میں بھی گزر جاتی ہیں صدیاں دل پر
فرق پھر ثانیے میں اور صدی میں کیا ہے

میں نے یہ سوچ کے روکا نہیں جانے سے اُسے
بعد میں بھی یہی ہوگا تو ابھی میں کیا ہے

تیز چلنا مجھے آتا ہے مگر آپ کے ساتھ
کیف مت پوچھئے آہستہ روی میں کیا ہے

جو بھی اُفتاد پڑے، سر سے گزر جاتی ہے
فائدہ اِس کے سوا بادہ کشی میں کیا ہے

آدمی کے لئے رونا ہے بڑی بات شعورؔ
ہنس تو سکتے ہیں سب انسان ہنسی میں کیا ہے

صابر ظفر

غزل

خود بھی میں بسوں تجھے بساؤں
مسجد کی جگہ مکاں بناؤں

یہ نورِ ظہور ہو رہے گا
آنکھوں کو تو بجھنے سے بچاؤں

اتنا سا تو روزنِ قفس ہو
میں کھیلتے بچے دیکھ پاؤں

شعلہ جو بھڑک کے بجھ چکا ہے
میں اس کی راکھ کیا اڑاؤں

جیسے یہ بہار آخری ہو
ہر گل کو بکھرنے سے بچاؤں

تتلی! ترے رنگ خوشنما ہیں
میں ہاتھ نہ جب تلک لگاؤں

تو اتنا عزیز ہے کہ تجھ کو
اب رسماً کیا گلے لگاؤں

جس خاک میں آگ کی کمی ہو
میں اس میں دیا سا ٹمٹماؤں

باطن پہ یقین کیسے آئے
ظاہر میں اگر نظر نہ آؤں

ایسا نہیں لوٹ آؤں بے حس
کشکول بدست اگر میں جاؤں

ہر دھوپ کو سایہ دے رہا ہوں
دکھ دہر کے اور کیا اٹھاؤں

جو خواب کو اصل سے ملا دے
میں اس سے کہیں بچھڑ نہ جاؤں

تجھ سا کوئی بے وجود ہوں کیا
میں محض کرشمے ہی دکھاؤں

بیمار کا جاگنا ہی اچھا
ایسا نہ ہو پھر جگا نہ پاؤں

کیا جانے کوئی کہاں ہو پیاسا
بادل ہوں تو میں برس ہی جاؤں

یہ بھی تو شکست خوردگی ہے
جاؤں اسے حالِ دل سناؤں

دنیا کا ملال ہی رہے گا
دنیا سے اگر نجات پاؤں

شاید یوں رنجِ ہجر کم ہو
شمعِ سحری کے ساتھ ڈوب جاؤں

صابر ظفر

غزل

دل تو مل جاتے ہیں راضی بہ رضا ہونے سے
تن بدلتے نہیں ملبوس نیا ہونے سے

اس بھرے شہر میں اب کوئی ٹھکانہ ہی نہیں
گھر ہیں آباد، فقط دل میں جگہ ہونے سے

اپنے ہونے کا گماں ہو تو یہی ہوتا ہے
ہو گیا میں بھی نہ ہونے کی طرح ہونے سے

دل میں دھڑکن کی طرح ہو گی سکونت میری
میں اگر بچ گیا صحرا کی صدا ہونے سے

میری بخشش کا یہ امکان کہاں سے نکلا
رہ گئی ہوگی ظفرؔ کوئی خطا ہونے سے

غزل

ہزار خواب ہیں ہم خفتگانِ شب کے لئے
مگر وہ لوگ جو سوئے نہ اپنے رب کے لئے

یہ غائبانہ اذیت عجیب ہے کہ دعائیں
تجھی سے مانگ رہا ہوں تری طلب کے لئے

نمونہ یہ ہے اے خاندانِ بے تاریخ
اک اہدنام ترے شجرۂ نسب کے لئے

یہ لوگ اس طرح اُجڑے ہوئے دکھائی نہ دیں
جو نشّہ اِن کے لئے ہے اگر ہو سب کے لئے

بر ایں ہمہ کہ نہ جھپکی کبھی پلک سر بزم
یہ عشق کم نظر آیا ترے ادب کے لئے

سعید اختر

غزل

ہم لاجواب ہو گئے بس اس خیال سے
حیرت میں پڑ نہ جائے حقیقت سوال سے

چھیڑی ہے تیرے پیار کی لَے اس کمال سے
ہم بوس و ہم کنار ہے فرقت وصال سے

بے رنگئ خزاں میں بھی اُس کے رفیق ہوں
اتنی بھی دوستی نہیں پتوں کی ڈال سے

یوں جم کے بیٹھئے نہ حضور اس کے رُو برو
آئینہ ٹوٹ جائے گا جذبِ جمال سے

ہر دائرے کے بعد ہے اک اور دائرہ
نکلے ابھی کہاں ہیں تمنّا کے جال سے

مخلوق بے شعور تو بس بے شعور ہے
ہم لوگ سرفراز ہوئے کس وبال سے

صحرا سے اتنا اُنس بھی اچھا نہیں سعید
وحشت سی ہو رہی ہے چمن کے خیال سے

غزل

دل میں تو نہ اب گھر ہے نہ محفل نہ گلستان
کس سوچ میں رہتا ہے مرے پیار کا ارمان

میں ایک نئے پیار کا گھر ڈھونڈ رہا تھا
رستے میں کھڑی تھی کوئی بھولی ہوئی پہچان

تم اپنی سناؤ کہ چمن بھی ہو دھنک بھی
میری سنو گے کہ نہ مندر ہوں نہ شمشان

کب تک وہ مرے پیار سے انکار کرے گا
ہونی ہے کسی روز تو مشکل مری آسان

چپ ہوں کہ تری شان میں ایک لفظِ گماں بھی
یا پھول کی توہین ہے یا چاند پہ بہتان

فخری بھوپالی

غزل

یوں تو آتا ہے یہاں ہر شخص کو باتوں کا فن
پھر بھی اس گفتار کے جنگل میں گونگا ہے سخن

گر نہ جائے ایک دن چپکے سے دیوارِ بدن
جمع ہے اس میں نہ جانے کتنے قرنوں کی تھکن

یہ نہیں معلوم کس کے پاس ہے اس کا سِرا
یہ خبر ہے میری گردن میں پڑی ہے اک رسن

زندگی اندھی گلی ہے، ذہن اندھا راہرو
اور اس اندھے کو اک عنقا کی ہے شاید لگن

اشکِ انجم رولتے گزری ہے اس کی ساری عمر
سینۂ شب میں خدا جانے یہ کیسی ہے دکھن

بند جس گھر نے کیا در مجھ پہ وہ بھی ہے مرا
غیر ہوں اب تک جہاں پر وہ بھی ہے میرا وطن

سچ تو یہ ہے تو نے فخری آپ لوٹائی بہار
اتنی اونچی بھی کوئی رکھتا ہے دیوارِ چمن

غزل

ہر زاویے سے میری وفا آزما کے دیکھ
ترکش میں جتنے تیر ہیں سارے چلا کے دیکھ

تصویری قاعدوں سے نہیں آتے حرف ہاتھ
پڑھنا ہے آدمی کو تو چہرہ ہٹا کے دیکھ

ہیں سنگ و خشت پاؤں پہ اپنے کھڑے ہوئے
یہ وہم ہے تو سائے کی دیوار ڈھا کے دیکھ

شاید ہو کوئی حسرتِ خفتہ کہیں پڑی
دل کے کھنڈر میں کوئی صدا تو لگا کے دیکھ

فخری کہیں نہ ڈوب گئی ہو ہوا کی نبض
آنگن میں اپنے پیڑ کا شانہ ہلا کے دیکھ

ضیا شبنمی

غزل

ہوا اُسے مرے آنے کی جب خبر دے گی
وہ اپنے آپ کو میرے سپرد کر دے گی

تو اس دل کی تری ہمرہی میں تلاش اپنی
یونہی رہے گی تو جینے کا کہنر دے گی

میں انتسابِ غزل اُس کے نام کر دوں گا
یہ اختیار اگر مجھ کو وہ نظر دے گی

غزل غزل مری سوچوں میں اک سوچ بھی ہے
مری نوا ہی مجھے میرے بال و پر دے گی

گلاب صبحوں کی خاطر لڑا ہوں راتوں سے
گواہی اس کی مری چشمِ تر بہ تر دے گی

اے چاندنی نہ بھٹک میرے ساتھ صحرا میں
کہ ساتھ بھی تو اگر دے گی رات بھر دے گی

غزل

میں ترے ہجر میں بھی قرب کا پہلو دیکھوں
ہر طرف پھیلے ہوئے پیار کے بازو دیکھوں

رُوپ کی دھوپ کا پھیلا ہوا جادو دیکھوں
جب ترے پاؤں میں گاتے ہوئے گھنگرو دیکھوں

یہ دُعا دے کے کیا بیٹی کو ماں نے رخصت
عمر بھر میں نہ تری آنکھ میں آنسو دیکھوں

کاش یہ خواب حقیقت کی سند پا جائے
میں کبھی بھی نہ پریشاں ترے گیسو دیکھوں

جاگتے لمحوں کا دُکھ لکھنے سے پہلے پہلے،
دل میں انجانا سا اک تیر ترازو دیکھوں

کون اُترا ہے ضیا رُوح میں آنسو آنسو
آنکھ کھولوں تو چمکتے ہوئے جگنو دیکھوں

اسلم شیخ

غزل

وقت کر سکتا ہے یوں تو ہر طرح یکسو مجھے
سوزشِ پیہم سے دے گا کب رہائی تو مجھے

میں غمِ احساس کے شعلوں سے ہوں جھلسا ہوا
لوگ دیتے ہیں مگر کافور کی دارو مجھے

ضبط پردہ پوش ہے ہر چند شیون کا مگر
فاش کر دیتے ہیں سب کے سامنے آنسو مجھے

دیدنی ہے آج بھی اپنی بصارت کا ہراس
گرگِ خوں آشام آتا ہے نظر آہو مجھے

باندھ رکھا ہے تحفظ کے لیے حرزِ شعور
دے نہیں سکتا ضرر ماحول کا جادو مجھے

فرصتِ ہستی کسے اور موت کا کیا انتظار
"ہے غبارِ شیشۂ ساعت رمِ آہو مجھے"

نغزِ ایراں نے نکھاری ہے مری طبعِ لطیف
روضۂ ابلاغ میں پہنچا گئی اردو مجھے

غزل

حرم والے سرِ محفل نہ زناری سرِ محفل
فرد کش ہے بصد عشوہ سیہ کاری سرِ محفل

تقاضے دوستی کے مختلف انداز رکھتے ہیں
کبھی بختہ نہیں ہوتی جو ہو یاری سرِ محفل

مسیحا بھی اگر چاہے تو درماں ہو نہیں سکتا
لگے ہیں زخم اس انداز سے کاری سرِ محفل

پسِ پردہ اگر کچھ بامصاحبتی میں رقصاں ہیں
تو کیوں کھل کر نہ ہو پھر رقص تاری سرِ محفل

جسے بدقسمتی سے چشمِ پرسش بھی نہ حاصل ہو
کرے گا کون اس کی ناز برداری سرِ محفل

زبانِ عرضِ غم مجمل، سماعت شرح کی عادی
یہی رہتی ہے اپنے ساتھ دشواری سرِ محفل

نہ جانے کیوں مرے بے ساختہ تشریف لانے سے
اچانک ہو گئیں خاموشیاں طاری سرِ محفل

حیدر قریشی

غزل

مرے بدن پہ ترے وصل کے گلاب لگے
یہ میری آنکھوں پہ کس رُت میں کیسے خواب لگے

نہ پورا سوچ سکوں، چھو سکوں، نہ پڑھ پاؤں
کبھی وہ چاند، کبھی گل، کبھی کتاب لگے

نہیں ملا تھا تو برسوں گذر گئے یونہی
پر اب تو اس کے بِنا ہر گھڑی عذاب لگے

یہ میرے جسم پہ کیسا خمار چھایا ہے
تمہارے جسم میں شامل مجھے شراب لگے

ہمیں تو اچھا ہی لگتا ہے گا وہ حیدر
بلا سے ہم اسے اچھے لگے، خراب لگے

فرحت نواز

غزل

لگا تھا یوں کسی اونچی اڑان سے اُترے
تصورات کے جب لامکان سے اُترے
شجر کی بانہوں میں سوئی ہوا کو نہ چھیڑو
تھکن کا بوجھ تو کچھ جسم و جان سے اُترے
میں دیکھ تو لوں زمانے کے تیوروں کا رنگ
وہ تھوڑی دیر کو ہی میرے دھیان سے اُترے
چمک کے خوشیوں کا سورج بھی تھک گیا آخر
اداسیوں کے نہ سائے مکان سے اترے
انا یوں گھات میں بیٹھی رہے گی کتنی دیر
کبھی تو میرے بدن کے مچان سے اترے
بلندیوں کی مسافت کا دم نہیں مجھ میں۔!
مرے لئے کوئی چشمہ چٹان سے اترے
گلاب رُت میں بھی اتنی اُداسیاں فرحت
ترے لئے تو ارم آسمان سے اترے

آذر تمنّا

غزل

یقیں بناتا ہے کوئی گماں بناتا ہے
جو آدمی ہے الگ داستاں بناتا ہے
شکست کرتا ہے زنجیرِ خانہ و محراب
اور ایک حلقۂ آوارگاں بناتا ہے
رگِ وجود سے کرتا ہے کسب کوزۂ جاں
خمارِ سود میں لیکن زیاں بناتا ہے
کمالِ بے خبری ہے اگر بہم ہو جائے
مگر یہ زیست کو آساں کہاں بناتا ہے
لبِ چراغ ارادہ کوئی تو ہے آذرؔ
جو میرے شعلۂ دل کو دھواں بناتا ہے

اظہر ادیب

غزل

بھنور سے الجھا ہوا بادبان چھوڑ گیا
جہاز ڈوبا تو اپنا نشان چھوڑ گیا
ابھی تک آتی ہے دیوار و در سے اس کی مہک
وہ خود تو عرصہ ہوا یہ مکان چھوڑ گیا
وہ دھوپ دیس میں بچھڑا تو کیا گلہ اس کا
یہ کم ہے یاد کا اک سائبان چھوڑ گیا
پلٹ نہ آئے کہیں خوف ہے یہ جنگل میں
شکار کھیلنے والا مچان چھوڑ گیا
گیا ہے واسطہ آبا کی آن کا دے کر
وہ میری راہ میں کیسی چٹان چھوڑ گیا
اسے خبر تھی کہ قاتل ہوں اس کا میں پھر بھی
مری صفائی میں اظہرؔ بیان چھوڑ گیا

یعقوب لطیف

غزل

سچ بات گر کہیں تو ہمیں سب برا کہیں
ایسے میں کوئی یہ تو بتائے کہ کیا کہیں

وہ میکدہ رہا نہ وہ زندانِ باصفا
اب رہ گیا ہے کون، کسے آشنا کہیں

اٹھتے نہیں ہیں ہاتھ کہ وہ بے نیاز ہے
اک آرزو ہے موت کی جس کو دعا کہیں

شکوہ زباں پر، نہ شکایت نہ احتجاج
طاری ہے وہ سکوت کہ رشکِ صدا کہیں

ناکامیوں کے داغ جو رونے سے دھل سکیں
اشکوں کو خواہشات کا ہم خوں بہا کہیں

پتھر کے تو تراش چکا بے شمار بت
تخلیق کر اک ایسا جسے ہم خدا کہیں

غزل

جب تری یاد کے سوتے پھوٹے
خشک آنکھوں سے بھی چشمے پھوٹے

حالِ دل سب نے ہی سننا چاہا
ہم مگر کچھ بھی نہ منہ سے پھوٹے

آبلہ پا کوئی گزرا ہوگا
ریگزاروں میں شگوفے پھوٹے

زندگی کا وہ مزہ ہی نہ رہا
یار چھوٹا کہ نصیبے پھوٹے

جام اپنا، دہن اپنا اپنا
میکشو ظرف ہیں ٹوٹے پھوٹے

جب بھی یوسف کوئی نیلام ہوا
کسی یعقوب کے دیدے پھوٹے

ثمینہ راجہ

غزل

شام جو چہرے پہ لہراتے ہوئے رنگ کی تھی
بعد تیرے وہی کاجل میں ڈھلے رنگ کی تھی
نہ محبت کا جنوں تھا نہ کوئی خواہشِ لمس
یہ شرارت تو فضاؤں میں چھپے رنگ کی تھی
دل سے نکلی تھی کوئی بات گلابی آبی
لب سے پھوٹی ہوئی سرگوشی ہرے رنگ کی تھی
کیا ستم تھا کہ وہ اور ہم سے محبت طلبی
بات مشکل تھی مگر شوخی بھرے رنگ کی تھی
"آسماں حدِ نظر شیشۂ سے" لگتا تھا
شام بھی صبح کے رنگوں میں ڈھلے رنگ کی تھی
اس کے لہجے کی دمک اور ہی محسوس ہوئی
اس کی آنکھوں میں چمک آج نئے رنگ کی تھی
یوں تو میں سہہ نہیں سکتی تھی حنا کی خوشبو
پر وہ شب نرم ہتھیلی پہ سجے رنگ کی تھی
شاخ در شاخ بڑی دور تلک ہم بھی گئے
ہاتھ آئی نہیں تتلی بھی ہرے رنگ کی تھی
بحر ایسا کہ بہت ڈوب گئے دل زدگاں
موج ایسی کہ ہر اک لمحہ نئے رنگ کی تھی

غزل

دریا میں قطرہ رہنا بھی، دریا ہونا بھی
کتنا انوکھا لگتا ہے یہ اپنا ہونا بھی
سُکھ کے کتنے سارے لمحے دُکھ کی اک ساعت
اک ساعت میں سب لمحوں کا ہنگامہ ہونا بھی
ایک حقیقت بن کر جو آنکھوں میں رہتا تھا
آنکھیں دیکھ رہی ہیں اس کا سپنا ہونا بھی
جینے کا احساس تو ہے اس اندھی نگری میں
دیپ کا جلتا ہونا بھی اور بجھتا ہونا بھی
رات کی سانسیں بوجھل ہوتے ہوتے دیکھی ہیں
اس کی یاد کا پُروا بننا تارا ہونا بھی
کالی چنچل آنکھوں والی ایک البیلی روح
کتنی پیاری بات ہے لوگو چڑیا ہونا بھی
ٹوٹی پھوٹی اس دنیا میں خواب سی بات لگے
اک انجانے شخص کا اتنا پیارا ہونا بھی
میرے شہر کا رستہ بھولے عرصہ بیت چلا
دیکھ سکو تو دیکھو اس کا سُونا ہونا بھی

احمد جاوید

غزل

پھاڑتے ہیں اپنے کپڑے اس فراوانی سے ہم
روز خلعت پاتے ہیں دربارِ عریانی سے ہم

منتخب کرتے ہیں میدانِ شکست اپنے لئے
خاک پر گرتے ہیں لیکن اوجِ سلطانی سے ہم

ہم زمینِ قتل گہ پر چلتے ہیں سینے کے بل
جادۂ شمشیر سر کرتے ہیں پیشانی سے ہم

ضعف ہے حد سے زیادہ لیکن اس کے باوجود
زندگی سے ہاتھ اٹھا سکتے ہیں آسانی سے ہم

ایک وحشت سی لگی رہتی ہے جان و دل کے ساتھ
کوہ کو ذرہ سمجھتے ہیں پریشانی سے ہم

دل سے باہر آج تک ہم نے قدم رکھا نہیں
دیکھنے میں ظاہرا لگتے ہیں سیلانی سے ہم

کاروبارِ زندگی سے جی چراتے ہیں سبھی
جیسے درویشی سے تم مثلاً جہانبانی سے ہم

دولتِ دنیا کہاں رکھیں جگہ ہو بھی کہیں
بھر چکے ہیں اپنا گھر بے ساز و سامانی سے ہم

جانے کس دیوار و در کی یاد میں کھوئے گئے
اپنے گھر میں بھی پڑے رہتے ہیں بے دھیانی سے ہم

بے حواسی نے کہیں کا بھی نہیں رکھا ہمیں
دشمنوں کو پوچھتے ہیں دلبرِ جانی سے ہم

The
world's greatest soccer
player loves the world's
greatest drink
PEPSI
COLA
PELÉ –
the sportsman
of the century
HAVE A PEPSI DAY
PEPSI
PAKISTAN
BEVERAGE
LIMITED.
(Bottled under the authority of Pepsico Inc N.Y. USA.)

تبصرے

(تبصرے کے لئے دو کتابوں کا آنا ضروری ہے)

(۱) اُردو افسانہ روایت و مسائل: مرتبہ: گوپی چند نارنگ

صفحات ۷۴۳۔ قیمت ۷۵/ روپے، ناشر: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس لال کنواں دہلی۔

اردو افسانہ: روایت اور مسائل بنیادی طور پر ان مقالات کا مجموعہ ہے جو ہند پاک اردو افسانہ سیمینار جامعہ ملیہ اسلامیہ نئی دہلی میں ۲۹ تا ۳۱ مارچ ۱۹۸۰ء کو پڑھے گئے لیکن فاضل مرتب ڈاکٹر گوپی چند نارنگ نے اس مجموعے کی اہمیت و افادیت بڑھانے کے لئے اس میں وہ مضامین بھی شامل کر دیے جو اردو افسانہ کے بارے میں مختلف نقادوں اور اہل نظر نے وقتاً فوقتاً لکھے تھے۔ اس طرح یہ کتاب جدید اردو افسانے پر ایک منفرد کتاب بن گئی۔ منفرد ان معنوں میں بھی کہ جدید اردو افسانے کے بارے میں پاکستان و ہندوستان سے اب تک ایسا کوئی دوسرا مجموعہ شائع نہیں ہوا۔ یہ ایک ایسی کتاب ہے جسے ان سب لوگوں کو پڑھنا چاہیئے جو افسانہ لکھتے یا افسانہ پڑھتے ہیں۔ اس کتاب کے مطالعے سے شعور و آگاہی میں اضافہ ہوتا ہے اور جدید افسانے سے متعلق کم و بیش سارے مسائل اور رجحانات سامنے آجاتے ہیں۔ یہ ایک ایسی کتاب ہے جسے برعظیم پاک و ہند کی ساری جامعات میں شامل نصاب ہونا چاہیئے تاکہ ہمارے اساتذہ و طلبہ بھی جدید اردو افسانے کے مختلف پہلوؤں سے واقف ہو سکیں۔ اردو زبان کے نامور محقق و نقاد ڈاکٹر گوپی چند نارنگ نے اس کتاب کو سلیقے کے ساتھ ترتیب دیا ہے اور دہلی کے مشہور ناشر ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس نے اسے نوٹو آفسٹ پر نہایت عمدہ کتابت و کاغذ پر ایسے حسن طباعت کے ساتھ شائع کیا ہے کہ اس دور میں چھپنے والی اردو کی بہت کم کتابیں اس معیار کو پہنچتی ہیں۔ پھر اس دور میں جب عام طور پر ناشر منافع خوری کے متعدی مرض میں مبتلا ہیں، ۷۴۳ صفحات پر مشتمل سنہرے ٹھپے کی مضبوط جلد، آرٹ پیپر پر سہ رنگے سرورق کے ساتھ، اس کی قیمت بھی مناسب ہے۔ (ادارہ)

(۲) انیس شناسی ـــــــــــ مرتبہ: گوپی چند نارنگ

صفحات ۲۹۳، قیمت ۵/۔، ناشر ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس لال کنواں دہلی۔

یہی خصوصیات اس ادارے کی دوسری کتاب "انیس شناسی" میں ملتی ہیں۔ اس کتاب میں ۱۸ مقالات شامل ہیں جو ۱۹۷۵ اور ۱۹۷۶ء میں انیس صدی کے موقع پر ہونے والے سیمناروں میں پڑھے گئے۔ ڈاکٹر نارنگ نے ان تمام مقالات کو نہایت محنت و سلیقہ سے مرتب کیا ہے۔ یہ کتاب بھی میر انیس کی شاعری کے مختلف نئے پہلوؤں کو سامنے لاتی ہے۔ اب تک میر انیس پر جو بھی کام ہوا ہے "انیس شناسی" اس پر یقیناً ایک اضافہ ہے۔

ہم نے ان دونوں کتابوں کے موضوعات و مباحث پر عمداً اس لئے روشنی نہیں ڈالی ہے کہ یہ ایسی کتابیں ہیں جنہیں ہم سب کو پڑھنا چاہئے۔ یہ دونوں کتابیں تنقیدی و فکری نقطۂ نظر سے بھی خاص اہمیت رکھتی ہیں۔ ان کے مطالعے سے آپ کے شعور میں، آپ کے علم میں، آپ کی فکر اور انداز نظر میں اضافہ ہوتا ہے۔

"انیس شناسی" بھی اردو افسانہ: روایت اور مسائل کی طرح فوٹو آفسٹ کے ذریعے عمدہ کاغذ، اعلیٰ کتابت، مضبوط جلد اور صاف ستھرے سرورق کے ساتھ شائع کی گئی ہے۔ (ادارہ)

برطانیہ میں اردو (ماہنامہ افکار کا خاص نمبر) مرتبہ، صہبا لکھنوی

صفحات ۶۰۰، قیمت ۶۰/۰، ناشر، مکتبہ افکار، کراچی۔

ماہنامہ افکار اور اس کے پرجوش و جواں ہمت مدیر صہبا لکھنوی گزشتہ ۲۹ سال سے اردو زبان و ادب کی خدمت کر رہے ہیں۔ افکار اردو کا وہ ادبی پرچہ ہے جو ہر مہینے پابندیٔ وقت کے ساتھ شائع ہوتا ہے۔ اس سے پہلے بھی افکار نے بہت سے خاص نمبر مثلاً جوش نمبر، فیض نمبر، مجاز نمبر، احمد ندیم قاسمی نمبر، حفیظ جالندھری نمبر شائع کئے ہیں اور اس بار برطانیہ میں اردو نمبر شائع کرکے ایک اور بڑا کام کیا ہے۔ اس خاص شمارے سے جہاں ایک طرف انگریز مستشرقین کی اردو خدمات پر روشنی پڑتی ہے وہاں یہ بات بھی سامنے آتی ہے کہ انگریز اہل قلم نے پاکستان کی علاقائی زبانوں کی کیا خدمات انجام دی ہیں، کتب خانے اور مخطوطات کے طور پر عنوان برٹش میوزیم اور انڈیا آفس لائبریری کے تعارف کے علاوہ اردو مخطوطات کی ایک طویل فہرست بھی دی ہے۔ آخر میں ان ادیبوں اور شاعروں

کے مضامین افسانے اور منتخب تخلیقات بھی شامل کر دی ہیں جو آج برطانیہ میں رہتے ہوئے اردو میں لکھ رہے ہیں۔ اس اعتبار سے ششماہی کا یہ فائن نمبر ایک ایسا شمارہ ہے جو بیک وقت قدیم و جدید کا احاطہ کرتا ہے ادارہ نیا دور اس شمارے کی اشاعت پر جس میں ۲۰ تصاویر بھی شامل ہیں مدیر اذکار صہبا لکھنوی کو مبارکباد پیش کرتا ہے۔ (ادارہ)

غالب اور صفیر بلگرامی : —— مشفق خواجہ

صفحات ۲۰۳ قیمت /۲۵ ۔ ناشر عسری مطبوعات کراچی ۔

سید فرزند احمد صفیر بلگرامی (م۔ ۱۸۹۰ء) عام طور پر اپنے تذکرے جلوۂ خضر کی وجہ سے علمی حلقوں میں مشہور ہیں۔ ان کا شمار غالب کے نامور تلامذہ میں ہوتا ہے۔ صفیر فارسی و اردو کے بلند پایہ شاعر ہونے کے علاوہ داستان گو، سوانح نگار، مورخ اور قواعد نویس بھی تھے۔ اردو کے مشہور محقق جناب مشفق خواجہ نے بڑے سلیقے سے جہاں زیرِ نظر کتاب میں صفیر بلگرامی کے حالاتِ زندگی و تصانیف کا احاطہ کیا ہے وہاں غالب و صفیر کے تعلقات اور مراسلت پر روشنی ڈال کر ان تمام مکاتیب کو بھی صحتِ متن کے ساتھ از سر نو مرتب کر دیا ہے جو غالب نے صفیر کے نام یا صفیر نے غالب کے نام لکھے تھے۔ اس کتاب کی خصوصیت یہ ہے کہ کوئی بات بغیر مستند حوالے کے نہیں لکھی گئی ہے۔ اس کتاب کے مطالعے سے اردو ادب کے بہت سے ایسے گوشے سامنے آتے ہیں جو اب تک نظروں سے پوشیدہ تھے۔ غالب اور صفیر بلگرامی ادبیاتِ غالب میں ایک قابل قدر اضافہ ہے۔ (ادارہ)

آسماں کیسے کیسے : —— صادق الخیری

صفحات ۳۰۲، قیمت /۴۰ شہناز بک کلب، کراچی ۳۳ ۔

صادق الخیری اردو کے معروف ادیب ہیں۔ برسوں کی خاموشی کے بعد جب وہ دوبارہ سرزمینِ ادب میں داخل ہوئے تو انہوں نے نہ صرف اپنی پرانی کتابوں کو از سر نو مرتب و شائع کیا بلکہ چند نئی تصانیف بھی اردو دنیا کے سامنے پیش کیں جن میں لب پہ آسکتا نہیں اور داستان سرائے کے علاوہ زیرِ نظر کتاب آسماں کیسے کیسے بھی شامل ہے۔ لب پہ آسکتا نہیں ان بے زبان بیٹیوں کی کہانیوں پر مشتمل ہے جو حسن، تعلیم اور دولت کے باوجود شادی سے محروم رہیں۔ اس کتاب میں ان کے والد علامہ راشد الخیری کی روایات جدید دور کے خاندانی مسائل سے آملتی ہے۔ داستان سرائے میں دنیا کی مختلف زبانوں کے

منتخب ناول، ناولٹ افسانے اور ڈراموں کو اردو میں ایسے دلچسپ پیرائے میں پیش کیا گیا ہے کہ معلوم ہوتا ہے جیسے یہ کہانیاں اردو ہی میں لکھی گئی ہیں۔ آسماں کیسے کیسے' میں صادقہ الخیری نے اپنی یادوں کے چراغ روشن کئے ہیں اور اپنی آٹوگراف البم کے حوالے سے چالیس نامور شخصیات کو موضوع بنایا ہے۔ ان شخصیات میں قائداعظم علامہ اقبال، سر عبدالقادر، عبدالماجد دریابادی، ملا واحدی، خواجہ حسن نظامی آغا حشر کاشمیری بھی شامل ہیں۔ اور جگر مراد آبادی، علامہ نیاز فتحپوری، جوش ملیح آبادی وغیرہ بھی شامل ہیں۔ آسماں کیسے کیسے اچھے انداز میں لکھی ہوئی ایک دلچسپ اور قابل مطالعہ کتاب ہے۔ (ادارہ)

سخنوران کاکوری ــــــــــــ حکیم نثار احمد علوی،

صفحات ۵۷۶۔ قیمت ۵۰/، ناشر، میخانۂ ادب ناظم آباد کراچی۔ ۱۸۔

کاکوری اودھ کا ایک مردم خیز خطہ ہے جس نے متعدد ایسے مشاہیر اور نامور ادیب و شعرا کو جنم دیا جن کے ناموں سے قومی سطح پر ہم آج بھی متعارف ہیں۔ ان میں شاہ تراب علی کاکوروی، محسن کاکوروی نور الحسن نیر (صاحب نور اللغات) ناظر کاکوروی، مفتی امیر احمد علوی، ظفر الملک (مدیر الناظر) نادر کاکوروی اور وحیدہ نسیم وغیرہ شامل ہیں۔ فاضل مولف حکیم نثار احمد علوی نے بڑی دیدہ ریزی اور محنت سے اس کتاب کا مواد ریزہ ریزہ کرکے جمع کیا ہے اور اسے ایسے سلیقے سے ترتیب دیا ہے کہ یہ کتاب تاریخ بھی بن گئی ہے اور تذکرہ بھی۔ یہ ایک ایسی تالیف ہے جسے ہر لائبریری اور ذاتی کتب خانے میں ہونا چاہئے۔ (ادارہ)

محفلے دیدم ـــــ حیرت شملوی مرتبہ، سید انیس شاہ جیلانی

صفحات ۲۵۰، ناشر حیرت شملوی اکادمی محمود آباد۔ ضلع رحیم یار خاں۔

سید انیس شاہ جیلانی حیرت شملوی مرحوم کے ایسے عاشق ہیں جنہوں نے اپنی زندگی نذر حیرت کر رکھی ہے۔ اس بار وہ ایک نیا تحفہ لے کر آئے ہیں۔ حضرت حیرت شملوی کے متفرق مسودات میں سے ریزہ ریزہ کرکے انہوں نے وہ تحریریں جمع کی ہیں جو مرحوم نے ملک کے نامور شخصیات کے بارے میں مرتب و مدون کی تھیں، ان شخصیات کی تعداد ۵۰ ہے جن میں علامہ اقبال، ابوالکلام آزاد، ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی، آصف علی، ایڈورڈ ہشتم، میر ناصر علی، داستان گو، پرنس اطف دیز، جوش ملیح آبادی، راس مسعود، ڈاکٹر ذاکر حسین خاں، ڈاکٹر سیف الدین کچلو، نواب سائل بھی شامل ہیں اور سر سلطان احمد

شاد عارفی، شاہد احمد دہلوی، ڈاکٹر ضیاء الدین، عبدالسلام دہلوی، غلام بھیک نیرنگ، مہاتما گاندھی، ممتاز محمد خاں ٹوانہ، نواب بھوپال وغیرہ بھی شامل ہیں۔ اس دلچسپ کتاب میں بعض ایسے واقعات بھی درج ہیں جن کے مطالعہ سے اس شخصیت یا اس دور کے بارے میں نئی بصیرت حاصل ہوتی ہے۔ امید ہے جیلانی صاحب حیرت شملوی مرحوم کی دوسری کتابیں بھی جلد مرتب و شائع کر دیں گے۔ (ادارہ)

راہ اور روشنی ——— حسنین کاظمی۔

صفحات ۲۴۸، قیمت ۲۵/۰ روپے، ناشر، علمی ادارہ، بہادر آباد۔ کراچی ۵۔

زیر نظر کتاب پروفیسر حسنین کاظمی صاحب کے اُن مسلسل مضامین کا مجموعہ ہے جو موصوف نے ڈاکٹر مورس بوکائی کی کتاب "دی بائیبل، دی قرآن اینڈ سائنس" کے حوالے سے قسط وار اخبار "جنگ" میں لکھے تھے۔ ان مضامین میں جدید دور کے مسائل کو قرآن و سیرت طیبہ کی روشنی میں دیکھا گیا ہے۔ ویسے تو اس کتاب کا بنیادی حوالہ مورس بوکائی کی کتاب ہے لیکن اس میں کاظمی صاحب کے افکار و عقائد، خیالات و نقطۂ نظر نے ایک نئی بصیرت پیدا کر دی ہے اور اسے ایک ایسی تصنیف بنا دیا ہے جسے ہر اس شخص کو پڑھنا چاہئے جو اسلام کو آج کے دور کے حوالے سے سمجھنا چاہتا ہے۔ ساتھ ہی ساتھ پروفیسر کاظمی نے اس کتاب کو ایسے صاف و رواں اسلوب میں لکھا ہے کہ بات براہ راست پڑھنے والے تک پہنچ جاتی ہے۔ (ادارہ)

حرف سرور ——— زہرا معین۔

صفحات ۲۳۲، قیمت ۲۱/-، مکتبۂ عالیہ لاہور۔

حرف سرور پروفیسر آل احمد سرور کی آپ بیتی ہے جسے زہرا معین نے سرور صاحب کی تحریروں کی مدد سے اس طور پر مرتب کیا ہے کہ سرور صاحب کا سارا سفر حیات دلچسپ انداز میں سامنے آ جاتا ہے۔ آپ بیتی مرتب کرنے کا یہ ایک نیا انداز ہے جسے ان کے شوہر سید معین الرحمٰن صاحب رشید احمد صدیقی کے سلسلے میں برت چکے ہیں۔ زہرا معین نے جس محنت، دیدہ ریزی اور ہوش و شعور سے اس کام کو انجام دیا ہے وہ یقیناً قابل تعریف ہے۔ اس کتاب کے مطالعہ سے آل احمد سرور کی ذات، شخصیت اور ذہن و فکر کے بیشتر گوشے سامنے آ جاتے ہیں۔ (ادارہ)

سید وقار عظیم ـــــــــــ مرتبہ، سید معین الرحمٰن۔

صفحات ۱۴۴، قیمت ۲۰/-، اردو اکیڈمی سندھ، کراچی۔

یہ کتاب ۱۹۶۶ء میں مرتب ہوئی اور ۱۹۶۷ء میں اشاعت کے لئے تیار تھی کہ وقار عظیم صاحب نے اس کی اشاعت کو روک دیا۔ ۱۹۷۶ء میں وقار عظیم صاحب وفات پاگئے اور ۱۹۸۰ء میں یہ کتاب اسی طرح دوبارہ شائع کردی گئی۔ یہ تو ہمیں معلوم نہیں کہ وقار عظیم صاحب نے اس کی اشاعت کیوں روک دی تھی۔ لیکن افسوس اس بات کا ضرور ہے کہ اگر فاضل مرتب اس میں بطور ضمیمہ وہ سارا مواد بھی شامل کردیتے جو ۱۹۶۷ء سے ۱۹۷۶ء تک وقار عظیم صاحب کے قلم سے وجود میں آیا تھا تو اس سے اس کتاب کی افادیت بڑھ جاتی۔ موجودہ صورت میں اس ادھوری کتاب کی اشاعت یقیناً بے محل ہے۔ (ادارہ)

سفر نصیب ـــــــــــ مختار مسعود۔

صفحات ۳۱۹، قیمت ۳۵ روپے، فیروز سنز لمیٹڈ۔

مختار مسعود کی پہلی کوشش (آواز دوست) کے بعد ایک اور ادبی تحفہ "سفر نصیب" کے نام سے کتابی شکل میں نمودار ہوا۔ سفر نصیب چار مقالاتی مجموعہ سینکڑوں تہ بر تہ ورقوں کی ضخامت اور دنیا بھر کا مواد سمیٹے ہوئے ہے جو تمام کا تمام ذاتی تجربہ اور ذاتی ردعمل کی واردات ہے۔ اس تصنیف کو عام قاری بہ اعتبار مواد دو حصوں پر تقسیم کرے گا۔ دو سوانحی خاکے اور دو سفر نامے مگر سچ پوچھئے کہ اس کا آخری مقالہ جو ڈاکٹر فضل الرحمٰن کا سوانحی خاکہ اور روئداد سفر ہے یہی سفر نصیب کے مصنف کے لڑکپن کے دل کا چور رہے اور یہیں سے مصنف کے شوقِ سفر اور ذوقِ سیاحت کا آغاز ہوتا ہے یہ عمر وہ ہوتی ہے جس کے اثرات بڑے راسخ اور ردعمل بڑے کارگر ہوتے ہیں۔ ڈاکٹر فضل الرحمٰن کے خاکے میں سنتری، چوکیدار، محافظ سے لیکر ڈاکٹر فضل الرحمٰن تک جانے سے زیادہ سفر نصیب کے مصنف کی اپنی جہانیاں جہاں گشت سیاحت کی تڑپ اور حسرت و ذوقِ سفر مضمر ہے۔

برعظیم کے سیاسی امور میں علی گڑھ کا رول تاریخ میں پتھر کی لکیر کی طرح محفوظ رہیں گے اور مصنف اسی دور کی علیگڑھ کی ٹائپ سازی کی معنوی تشکیل ہے۔ خود کو اسکول سے کالج یونیورسٹی تک سنہرا تمغہ آویزاں طالب علم ثابت کرتا رہا اور لطف یہ کہ نہ کرم کتابی گوشہ نشیں رہا اور نہ پتھر کے بت کی طرح

سنجیدہ و متین مٹی کا مادھو سخت کوش قسم کا رائڈنگ کلب کا شہسوار اور سوئمنگ پول کا تیراک اسپورٹس مین رہا۔ پر تیر مانیٹر اور پراکٹوریل مانیٹر رہا۔ قرآن کے بیشتر حصّے کا حافظ رہا اور پھر یونیورسٹی کے اندر عام سیاست میں اتنا فعال و دخیل رہا کہ یونیورسٹی کے سب سے اعلیٰ عہدے وائس پریذیڈنٹ کے لئے یونین کے انتخاب میں میدان میں اترا اور شاہ عطا حسن جیسے بے پناہ مقرر طالب علم سے کانٹے کی ٹکر لی اور گیارہ ووٹ سے شکست کھائی۔ اس الیکشن میں مختار مسعود کو تقریر کے جوہر بھی دکھانا پڑے اور اس سلسلے میں شاہ عطا حسن کے مقابلے پہ ہاتھی سے ہاتھی کی ٹکر کا سماں بھی دیکھنے میں آیا۔ اس کتاب کا مصنف تحریک پاکستان میں سب سے فعال اور دور شباب کی پیداوار ہے اور اس کی تحریریں پڑھتے ہوئے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ چونا گارا اور سنگ بنیاد علی گڑھ سے باندھ کر لایا تھا۔ ویسے تو بعض لوگوں نے چلتے پھرتے خاصے کے خاکے لکھے اور بعد میں اڑائے بھی مگر اس فن میں آوازِ دوست کے مصنف نے جوہر قلم کے ساتھ جودت شیخ دکھانے کے لئے بکمال فطانت پروفیسر ابل کے حیدر کو منتخب کیا۔ بظاہر یہ دل کا معاملہ نظر آتا ہے مگر شیخ صاحب نے یہاں پر بھی دل کی بات کھل کر نہیں کی ہے ساتھ ہی انہیں نہ کہنے کی بات نہ کہہ کر کہہ جانے میں ید طولیٰ ہے۔ جامعیت کے اعتبار سے شیخ اہل فن صاحب قلم نے بڑی بھرپور شخصیت ابھار کر دی ہے اور ندرت قلم اور توانائی تحریر تو شیخ صاحب کے بائیں ہاتھ کا کھیل ہے ہی۔

مختار مسعود مضبوط قلم، نثر رسیا ادیب ہیں اور آج راقم الحروف پہ پیرانہ سالی کے اواخر میں یہ عقدہ کھلا کہ ہم نے تختی لکھنے والی عمر میں قلم پکڑ کر غلطی کی تھی۔ اگرچہ پچاس سال کی تخلیق میں کوئی ایک لفظ بھی غیر کا معلوم نہیں ہوتا مگر مختار مسعود نے قلم پکڑا اعلیٰ تعلیم پاکر بھانت بھانت کی سوسائٹی دیکھ کر ادھر سروس کی، ربع صدی تو ایک جانب رہی علی گڑھ یونیورسٹی کا باشی پکھیرو پر پرزے نکالتے نکالتے گھر بیٹھے قطب شمالی سے قطب جنوبی تک پکھیروؤں سے بالمشافہ معاملت میں آجاتا تھا اور بولی بولی سیکھ کر گھونسلے سے پھدکنا نکلتا تھا۔ بلاشبہ انہیں علی گڑھ میں اچھے ہی لوگ ملے ہوں گے اور آج تک بہت سے رنگے سیاروں سے بھی پالا پڑا ہوگا اور یہ مصنف پر سوسائٹی کا قرض ہے۔

کتاب کا وہ حصہ جو سفر نصیب کی روئداد پر مشتمل ہے بحر ذخار ہے اور قلم کے رسیا اور سفر کے رسیا کے ستاروں کا قران السعدین ہے اور عام قارئین مجھے معاف کریں مصنف نے اس کو باذوق اور نثر کے شوقین لوگوں ہی کے لئے سپرد قلم کیا ہے۔ دقتِ مشاہدہ، زورِ بیان اور اہمیتِ معاملہ یکساں ربط

وضبط کے ساتھ دوش بدوش ہیں۔ کہیں پر قلم بال کی کھال نکالتا ہے اور تفصیل و جزئیات کا اشاریت کے ساتھ پورا پورا احاطہ کرتا ہے اور کہیں ایک آدھ جملہ یا ایک دو لفظوں ہی ادا کرکے پورا کینوس سمیٹ لیتا ہے اور ابلاغ کا کمال دکھلاتا نکلا چلا جاتا ہے۔ اجمال کی اس تفصیل کا کمال سنجیدہ اور خوش مزاج گرگ باراں دیدہ قاری تک کو بار بار دبوچ دبوچ لیتا ہے اور چھوڑ چھوڑ کر گرفت میں لیتا رہتا ہے۔ علم مجلس میں مہارت کے ساتھ ساتھ مطالعے اور ذہانت و فطانت کے ساتھ پیش کرنے کا یہ شعور کہ ماضی قریب تا حال کے ملّی و قومی واقعات پر خوبصورت اور تاثیر سے پُر بات کہتے چلے جائیں اور قاری کے اندر سے بے ساختہ سبحان اللہ نکلتا چلا جائے اور ابھی یہ سرور ہلکا ہلکا باقی ہو کہ دوسرے کنارے سے اگلے جملے میں ایک اور مہمیز تفنن کے لئے دست بستہ حاضر۔ قاری کو سرور اندر سرور لڑی میں پروتا چلا جائے اور لطف یہ کہ تکرار و اعادہ کا کہیں شائبہ بھی نہ ہو لیکن حالات و تجربات اس طرح پیش کرنا جیسے کوئی جوہری پہل در پہل ترشے ہوئے جواہرات مخمل پر رکھ کر نمائش کے لئے پیش کرتا ہے اور لطف یہ کہ قیمت میں ایک دوسرے سے مختلف آب و جلا اور رنگ سے ایک دوسرے پر چھوٹے چھینک کر مجلا کر رہا ہو جیسے رنگا رنگ کم خواب، زربفت ساٹن، مخمل، پوت، مشجّر اور یہ بات نہیں کہیں کھدر اور گاڑھا بھی موقع موقع سے ایک آدھ ٹاٹ کا ٹکڑا بھی اوپر تلے تہ بہ تہ کسی بکس میں سے ایک کے بعد دوسرا اٹھا کر دکھایا جا رہا ہے۔ اس طرح مختار مسعود اچھے برُے گھٹیا بڑھیا، نیک و بد، پاک ناپاک کی نمائش کے سلیقے کے شائق ہیں۔ مصنف وسعتِ معلومات اور زورِ بیان کا علامت کی حد تک کے آمیزہ ہے۔ نئی اور پرانی دنیا کا سیاح، نیچرل سائنس کا ماہر خصوصی اور جدید انکشافات کے ذریعے مستقبل پر حاوی نگاہ رکھتے ہوئے تاریخ و ثقافت کا ذکر کرتا ہے تو اندازہ ہوتا ہے کہ عمر بھر اسی شعبے کا پروفیسر رہا ہے اور ابن خلدون ہونہ ہو اس کا کوئی رشتہ ضرور ہے۔ یہ دس کے چوسات مقالے دو کتابوں کی شکل میں جو شک سا ہے مگر مختار مسعود کی تحریر کوزے میں دریا ہے ——— ابوالفضل صدیقی

آشوبِ صدا ——— اکبر حمیدی

صدیقی پبلیکیشنز، چوک اردو بازار، لاہور۔ ضخامت:۔ ۱۲۱ صفحات۔ سفید کاغذ۔ مزین سرورق قیمت ۱۲ روپے۔

"آشوب صدا" اکبر حمیدی کی ان غزلوں کا مجموعہ ہے جو انہوں نے ۱۹۷۱ء اور ۱۹۷۷ء کے درمیانی

عرصے میں کہیں کتاب کے آخر میں کچھ فردیات بھی شامل ہیں۔

اکبر حمیدی اس اعتبار سے ایک منفرد شاعر نظر آتے ہیں کہ وہ بنی نوع انسان سے غیر مشروط پیار کرتے ہیں۔ وہ رنگ، نسل، مذہب، علاقائیت طبقاتی تفریق غرض انسان انسان کے درمیان غیریت یا تعصب کی کسی بھی شکل کو روا نہیں رکھتے حتیٰ کہ انسانیت کے رشتے سے انہیں دشمن بھی بھلا لگتا ہے۔
وہ انسان کو ایک عالمگیر محبت کا درس دیتے ہیں:

وہ کہیں رنگوں، کہیں نسلوں کہیں طبقوں میں ہے + ایک ہی انسان دنیا بھر کے انسانوں میں ہے

ع ہجومِ شوق میں تخصیصِ رنگ و بو کیسی

اس عالمگیر محبت کے راستے میں جو رکاوٹیں اور مشکلات حائل ہیں، شاعر ان سے گھبراتا نہیں وہ اپنے نصب العین کے بارے میں پرامید ہے ؎

کیا ڈرائے گی بھلا ہم کو خزاں کی یورش
ہم کو معلوم ہے، ہم گل سے گلستاں ہوں گے

میں تو اس دور کا شاعر ہوں محمدؐ اکبر
جب نیا شہر بسے گا تو انساں ہوں گے

اس عالمگیر محبت کے نظریئے کے ساتھ ساتھ وہ خیر و شر کے معیار کو بھی اہمیت دیتے ہیں اور خود غرضی، ناانصافی، ظلم، جبر اور انسان کے منفی رویوں کے خلاف بھی آواز اٹھاتے نظر آتے ہیں۔ اس طرح ان کی شاعری میں جمال اور جلال کے دھارے ساتھ ساتھ بہتے ہوئے نظر آتے ہیں ؎

میں ہی رہ گیا کو بخششوں سایہ
میں ہی رستے سے ہٹایا جاؤں

خود اپنی جان بھی پیاری ہے شہر والوں کو
میں وہ شہید ہوں جس کا کوئی گواہ نہیں

کوئی کسی کی مدد کو بھی کس طرح آئے
ہر ایک شخص یہاں دست و پا بریدہ ہے

محبت کے اس سوتے سے ان کے دل میں حب وطن کا چشمہ بھی پھوٹتا ہے۔ پاکستان کی تیسویں سالگرہ کے موقع پر انہوں نے ایک غزل کہی ہے۔ اس کا مطلع ہے:

شاید ہو نخلِ خواب ثمر بار اس برس
اس نے کیا ہے تیسواں سنگار اس برس

اس مجموعے میں ایک موڈ کی غزلیں بھی کافی تعداد میں ہیں جن سے شاعر کے جمالیاتی تجربوں کے ایک داخلی آہنگ کا پتہ چلتا ہے۔ اکبر حمیدی کے یہاں غزل گوئی کی اچھی صلاحیت پائی جاتی ہے شاعر نے کہیں کہیں زبان و بیان کے سلسلے میں بے توجہی برتی ہے جس کی وجہ سے عجزِ کلام

کی کیفیت پیدا ہوگئی ہے۔ کچھ مثالیں درج ذیل ہیں :-

جو رُکھتے ہیں وہ پھر مانتے نہیں اکبر — دلوں میں بیٹھی ہوئی ہیں کدورتیں کیا کیا

(آمنتے نہیں" ہونا چاہئے)

شہر میں کیا ہو رہا ہے پوچھتا ہے کیا مجھے — میری حالت سے میرے زخموں سے اندازہ لگا

(یہاں " مجھ سے" ہونا چاہئے)

الزام تیرے پیار کے سب میرے سر لگے — میں جیسا پیڑ تھا مجھے ویسے ثمر لگے

(یہاں " مجھ پر" ہونا چاہئے)

نظریہ اس کا نہ اس کا ہی کوئی ایمان ہے — آج کا فنکار تو پورا سیاست دان ہے

(یہاں "ہی" کا استعمال درست نہیں)

ایک غزل میں قَلَقْ اور سَبَقْ کا قافیہ ہے۔ اس میں اُفُق اور عُمُق کے الفاظ بھی بطور قافیہ لائے گئے ہیں۔

ان باتوں سے قطع نظر اکبر حمیدی کے جمالیاتی تجربوں میں بہت سے خوش آیند امکانات پائے جاتے ہیں۔ وہ ایسے تجربوں کو تغزل کے سانچے میں ڈھالنے کی صلاحیت رکھتے ہیں جن کی طرف عام طور پر نظر نہیں جاتی :-

بارشِ سنگ میں ہم لوگ نہ نکلے باہر — دیکھتے دیکھتے منہ بند ہوئے غاروں کے،

آتا ہے مجھ کو موت کی مجبوریوں پہ رحم — بے چاری اپنے وقت کے چکر میں قید ہے

احساسِ کمتری نے نہ رکھا کہیں کا بھی — انسان نہ بن سکے تو خدا بن کے رہ گئے

امید ہے کہ اکبر حمیدی کے کلام کا دوسرا مجموعہ خوب سے خوب تر کی تلاش کا آئینہ دار ہوگا۔

————— عالم صدیقی

اقبال کا شعورِ مزاح ————— کامل القادری

میزان ادب کراچی۔ قیمت پندرہ روپے

اقبال شاعر، مفکر اور فلسفہ دان تھے: انہوں نے سنجیدہ طبقے کو مخاطب کیا اور علمی و ادبی زاویے سے نسبتاً دقیق مسائل کو سلجھانے کی کاوش کی۔ بانگ درا کے آخری حصے میں ان کا ظریفانہ کلام بھی

شامل ہے۔ ضرب کلیم، بال جبریل اور ارمغان حجاز وغیرہ کتابوں میں ان کے کٹیلے طنزیہ لہجے کے بہت سے گوشے بھی نمایاں ہوئے ہیں۔ اس سب کے باوجود جب ان کی مجموعی شخصیت کو محیط کیا جاتا ہے تو وہ جلیل القدر مفکر اور سنجیدہ نظر فلسفی تو نظر آتے ہیں لیکن مزاح نگار شاید دکھائی نہیں دیتے۔ مزاح کی جو شوخ کرن اقبال کے ہاں ابھرتی ہے بیشتر ادبا نے اسے اکبر الہ آبادی کے ظریفانہ مقبول انداز کا پرتو قرار دیا ہے اور بالعموم یہ بھی کہا جاتا ہے کہ اقبال نے دوسرا اکبر الہ آبادی بننے کی کوشش کی لیکن بہت جلد اس راہ کو چھوڑ گئے۔ اردو کے بالغ نظر ادیب کامل القادری کا موقف اول الذکر نظریئے سے یکسر مختلف ہے۔ ان کا خیال ہے کہ "اقبال طبعاً بذلہ سنج تھے اور ان کی شوخی طبع چھپائے نہیں چھپتی" انہوں نے اقبال کو جارج برنارڈ شا کے مماثل قرار دیا ہے اور لکھا ہے کہ "اقبال نے اصلاح احوال کے لئے ایسا طنزیہ لب و لہجہ اختیار کیا جو بیک وقت پُردنار بھی ہے اور شوخی طبع کا غماز بھی"۔ زیر نظر کتاب "اقبال کا شعورِ مزاح" میں اقبال کے متذکرہ مزاج کو ان کی شاعری، خطوط نگاری، لطیفہ گوئی، نجی اور مجلسی زندگی سے دریافت کرنے کی کاوش کی ہے۔ انہوں نے ایک باب اس بات کو ثابت کرنے کیلئے بھی باندھا ہے کہ اقبال کا رنگِ مزاح اکبر الہ آبادی کے اندازِ مزاح سے الگ نوعیت رکھتا ہے۔ کتاب میں چار ضمیمے بھی شامل ہیں ایک ضمیمے میں میر کی واسوخت اور اقبال کے شکوہ کا موازنہ کیا گیا ہے۔ ایک اور ضمیمے میں کامل القادری نے اقبال کے فکر و فن کے بارے میں بعض ذاتی الجھنوں کو پروفیسر احمد علی اور ڈاکٹر جمیل جالبی سے گفتگو کرکے سلجھانے کی کاوش کی ایک ضمیمہ ان کے انگریزی مضمون کے لئے پی گرامیٹک اسٹائل آف اقبال پر مشتمل ہے۔ یہ کتاب تحقیق و تنقید کے زمرے میں آتی ہے لیکن کامل القادری کے خوش وضع تخلیقی اسلوب نے اس کی لطافت کو دوچند کر دیا ہے اور قاری ان کے ساتھ سفر کرتے ہوئے مسرت کی کیفیت سے دوچار ہو جاتا ہے۔ یہ کتاب اقبال کے مزاج کے ایک نسبتاً کم متعارف گوشے کو روشنی عطا کرتی ہے مجھے توقع ہے کہ اقبال کے قارئین اسے دلچسپی سے پڑھیں گے۔ ——— انور سدید

سورج کی صلیب ——— صبا اکرام

دبستانِ جدید، شمالی ناظم آباد۔ کراچی۔ قیمت ۲۰ روپے

صبا اکرام جدیدیت کا شاعر ہے، یہ حیثیت اس ہوا نصیبی کا بدیہی نتیجہ ہے جس کے تحت اس نے

دو مسافرتوں کا المیہ دیکھا اور بچھڑ کر بھر نہ ملنے والے پھر تا رہا۔ جنگی تیدی بنا اور جلتے سانسوں کے گھنے دشت میں قہر کے خطروں کو آواز دیتا رہا۔ صبا اکرام نے اپنے نوجوان کندھوں پر بوڑھے اور عمر رسیدہ تجربوں کا بوجھ اٹھا رکھا ہے۔ اس کی شاعری انہیں تجربوں کا علامتی اظہار ہے۔ وہ نئے نئے تلازمات کے وسیلے سے اپنے تجربے کی بازیافت کرتا ہے اور یوں قاری کو اجڑنے کے اس عمل سے گزرنے کا موقع دیتا ہے جو کبھی بے ثمر رہتا ہے اور کبھی آرزؤں کی جھولی میں پکے ہوئے پھل ڈال دیتا ہے۔

"سورج کی صلیب" صبا اکرام کی شاعری کا اولین مجموعہ ہے۔ شمس الرحمان فاروقی نے لکھا ہے کہ "ان کے کلام میں بے زمینی کی پیدا کردہ مایوسی اور تلخی کا شائبہ تک نہیں"۔ وزیر آغا نے صبا اکرام کو پڑھ کر اس ناؤ کو چشم تصور میں دیکھا ہے جو بے پتوار ہے اور جہت اور سمت سے نا آشنا محض لہروں کے زیر و بم پر سفر کر رہی ہے۔ صبا اکرام چونکہ جدید شاعر ہے اور شعری پیکر کو علامتی انداز میں پیش کرتا ہے اس لئے اس کا ہر قاری اس آئینے میں نئی نئی صورتوں سے آشنا ہوتا ہے۔ مثال کے طور پر سورج اس کے ہاں مسلسل سفر کی علامت بھی ہے اور صلیب کا سمبل بھی۔ ہر صبح جب روزگار کا بلاوا آتا ہے تو وہ اپنی روح کی قربانی پیش کرتا ہے اور اس صلیب پر اپنے جسم و جان کو چڑھا دیتا ہے۔ پتنگ اور چڑیا کی علامت اسے اونچی پرواز کی طرف متوجہ کراتی ہے لیکن زمین سے اس کا رشتہ استوار رہتا ہے۔ پتنگ کی ڈور کٹتی نہیں اور چڑیا واپس آشیانے کی طرف آجاتی ہے۔ صبا اکرام نے پروں کو سمیٹتی شب میں خوابوں کو پھیلتے دیکھا ہے تو اس کے ہونٹ پر بکھری ہوئی کلیوں کی یادوں کا میٹھا ذائقہ بھی چپکا ہوا ہے۔ وہ کھوئے ہوئے لمحوں کی بازیافت بھی کرتا ہے۔ اور موجود کے ساتھ نبرد آزما بھی ہوتا ہے۔ اول الذکر صبا اکرام کا حاصل ہے اور اس سے صبا اکرام کے ہاں طمانیت پیدا ہوتی ہے۔ موخر الذکر ایک کرب انگیز صورت ہے۔ اس لئے صبا اکرام پر بعض اوقات خوف طاری کر دیتی ہے۔ صبا اکرام کی شاعری میں یہ دونوں صورتیں سلسلہ در سلسلہ موجود ہیں اور قاری ان دونوں ہمایوں کے درمیان سفر کرتے ہوئے صبا اکرام کے تجربے میں پوری طرح شریک ہو جاتا ہے۔

مجموعی طور پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ صبا اکرام جدید حسیت کو نئے اسلوب میں پیش کرنے کا سلیقہ رکھتا ہے اور وہ غزل اور نظم دونوں کو استعمال کرنے کا فن جانتا ہے۔ "سورج کی صلیب" اس کے فن کے تمام گوشوں پر محیط ہے۔

انور سدید

ارمغانِ مجنوں ——— مرتبہ صہبا لکھنوی۔ شبنم رومانی

مکتبہ افکار، رابسن روڈ، کراچی۔ قیمت چالیس روپے

ارمغانِ مجنوں وہ تحفہ ہے جسے پاکستان کے چند ادب دوستوں نے حسن عقیدت کے طور پر مرتب کیا اور مجنوں گورکھپوری کی طویل ادبی خدمات کے اعتراف کے طور پر ان کی خدمت میں پیش کر دیا۔ اس مجموعے کی تالیف و ترتیب میں یوں تو محمد علی صدیقی، شہزاد منظر، مسعود احمد برکاتی، مختار زمن اور قمر عالم وغیرہ کے علاوہ سحر انصاری، جاذب قریشی، ماجدہ مسرور، قمر عباس ندیم، قمر ہاشمی اور نصراللہ خاں کا خلوص اور قلم شامل نظر آتے ہیں، تاہم اس میں حقیقی رنگ معنوی اور صوری طور پر صہبا لکھنوی اور شبنم رومانی نے بھرا ہے۔ زیر نظر کتاب میں مجنوں گورکھپوری کی خود نوشت، نیلم اور ردالامام کے نام دو غیر مطبوعہ خطوط، بابا طاہر، مشتاق یوسفی، امیر خسرو، فراق، نیاز اور حافظ پر مجنوں کے نئے مضامین۔ جدیدیت اور ادب و فن پر مجنوں کے نظریات شامل ہیں۔ مجنوں کی شخصیت اور فن پر فراق، سحر انصاری، فتیح الباری اور جاذب قریشی کے مضامین عمدہ روشنی ڈالتے ہیں۔ ایک باب "جشنِ مجنوں" کی تقریب میں پڑھے گئے اہم مضامین پر مشتمل ہے اور ان سے مجنوں سے محبت کرنے والوں کے صادق تاثرات سامنے آتے ہیں۔

مجموعی طور پر یہ کتاب ایک ایسا آئینہ ہے جس سے مجنوں کا فن اور ان کی شخصیت کا پورا انعکاس ہوتا ہے۔ صہبا لکھنوی اور شبنم رومانی نے ان مضامین کو کتابی شکل دے کر مجنوں ہی کی نہیں ادب کی بھی اہم خدمت سر انجام دی ہے۔ یہ کتاب اردو کی چند خوبصورت کتابوں میں شمار کرنے کے لائق ہے۔ کتابت عمدہ، طباعت اعلیٰ اور معنی خیز سرورق اقبال مہدی کے قلم کا نمائندہ ——— انور سدید

تکلّم (شعری مجموعہ) ——— منظر ایوبی

ناشر شاداب اکادمی کراچی۔ صفحات ۱۹۲۔ قیمت پچیس روپے۔

غزل کی شاعری میں منظر ایوبی کے نام کی اہمیت کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ زیر نظر مجموعہ جو "تکلّم" کے نام سے شائع ہوا ہے ان کی اہمیت کو اور بھی جلا دیتا ہے۔ وہ نو کلاسیکی ترقی پسند روایت کے شاعر ہیں۔ حیات و کائنات اور گرد و پیش کے نظام پر تنقید نے ان کے یہاں غزل کی ان مروجہ علامتوں کو نئی معنویت سے ہمکنار کیا ہے جو کبھی عشقیہ شاعری کی جان ہوا کرتے تھے۔ ان کی شاعری کا جمالیاتی پس منظر دراصل تاثر لفظوں اور ترکیبوں اور آہنگ کے باطن سے تعمیر ہوتا ہے۔ ان کے تخلیقی سفر کا بیشتر حصہ گرد و پیش کی آگہی، عصری شعور کی عکاسی اور سماجی شعور کی تعبیر و تشریح سے عبارت ہے۔ انسان دوستی، دردمندی، امن و اخوت، عدل و مساوات، مسرت و سربلندی اور ترقی و امید ان کی غزل کا موضوع ہیں۔ منظر ایوبی

کے یہاں لفظوں کے استعمال اور طرزِ اظہار کے حوالے سے بعض ایسے شعر بھی نکل آتے ہیں جو نئے شعراء اور آجکل کی غزل کا انداز پیش کرتے ہیں۔ انہوں نے غزل کی روایتی زبان سے انحراف کرنے کی بھی کوشش کی ہے۔ چنانچہ ان کی غزلوں میں چینا کا بجلا۔ اوڑھی گھمس، چادریں تا نا اور ادھ کھلی کھڑکیاں جیسے الفاظ اور ایسی ہی تراکیب موجود ہیں بعض شعروں میں امیجری کی سمت بھی نظر آتی ہے۔ مثلاً :

ذہن میں یوں کوئی جال بُنتا رہا جیسے تالاب میں چاندنی کا سفر

منظر ایوبی کی شاعری اظہار فن کی زندہ حقیقت اور تغزل کا اشارہ اور ان کے خیال کی تکمیل کرتی ہے کہ

اظہار فن کی زندہ حقیقت ہوں دوستو دیکھو مجھے کہ خواب کا پیکر ہوں دوستو

ریاض صدیقی

بادِ سبک دست (غزلوں کا مجموعہ) —— جوہر سعیدی

بزم جوہر سعیدی۔ ۳ لے ۵۸۸ لانڈھی کراچی۔ قیمت ۳۰ روپے صفحات ۲۲۴

ہمارے درمیان ایسے کئی بزرگ معتبر شاعر موجود ہیں جنہوں نے کلاسیکی شعری روایت میں نئے زمانے کے پیرائیہ اظہار اور عصری موضوعات کو پیوند کرنے کی بڑی کامیاب کوشش کی ہے۔ جوہر سعیدی صاحب کا تعلق بھی بزرگوں کی اسی فہرست سے ہے۔ ان کی ذہنی پرورش ایسے ماحول میں ہوئی جو یقیناً اردو جدید کے گرد و پیش سے کم ہی مانوس تھا لیکن انہوں نے بدلتے ہوئے موسموں اور رتوں کے اثرات کو کھلے ذہن سے قبول کیا۔ زندگی کے کٹھن سفر میں وقت اور حالات کے چیلنج کو قبول کیا اور اپنی غزلوں میں اس معاشرتی شعور اور حق گوئی کو آنے کا موقع دیا جو حالی کی عطا ہے اور جو غزل کی نغمہ بار روح اور جمالیاتی فضا میں سرایت کر گیا تھا یہی وہ اثرات ہیں جو شاعر کو اس حقیقت سے آگاہ کرتے ہیں ؎

ٹھہراؤ نفی ہے زندگی کی طوفاں کوئی نیا اُٹھاؤ

جوہر سعیدی کی غزل میں جو یقیناً اس ہند اسلامی تہذیب کا اشارہ ہے جس کو مٹانے کے لئے چاروں طرف سے یلغار جاری ہے اور یہ جذباتی عمل بہرحال بہت وقتی ہے اس لئے کہ ہند اسلامی تہذیب ہی تو در حقیقت پاکستانی تہذیب اور نظریہ و احساس کا سرچشمہ ہے۔ انہوں نے اپنے کلام میں سرسید اور حالی کے افکار و نظریات کی روح کو بڑے سلیقے سے سمیٹا ہے :

ہے ان کے مقدر میں بھٹکنے کے سوا کیا جو لوگ سمجھتے نہیں فطرت کے اشارے

جوہر سعیدی کے بعض شعروں میں طرزِ اظہار اور لفظوں کے استعمال کی حد تک وہ نیا پن نظر آتا ہے جو ان دنوں بہت عام ہے:

کاٹ چکے ہو کھیت بہت رسوائی کے — فصل اگاؤ اب تو اچھی باتوں کی
جس کی چابی نظر نہ آتی ہو — آدمی اس گھڑی کی صورت ہے
کہہ رہی ہے یہ فضا اس شہر کی — سر بچانا ہے تو خود پتھر اٹھا

"بادِ سبک دست" اس دور کی غزل کا ایک قابلِ ذکر مجموعہ ہے جسے خوبصورت کتابت طباعت اور خوبصورت سرورق کے ساتھ شائع کیا گیا ہے ———— ریاض صدیقی

کھلی کتاب (شعری مجموعہ) ——— مسعود میکش

ناشر ادبی معیار پبلیکیشنز کراچی قیمت پندرہ روپے۔ صفحات ۱۱۲۔

پاکستان بننے کے بعد شاعری کی جو نئی دنیا بنی مسعود میکش سے وہ اچھی طرح مانوس تھی وہ بڑے شاعر نہ سہی لیکن اتنے گئے گذرے بھی نہ تھے کہ ان کی موت کے بعد شائع ہونے والے مجموعۂ شعر "کھلی کتاب" کا ذکر نہ کیا جاتا۔ وہ پرانی غزل کی روایت کے بہت اچھے اور ریختہ کہنے والوں میں تھے اور کسی زمانے میں ملتان سے لاہور تک ہونے والے بڑے بڑے مشاعروں کی جان محفل ہوا کرتے تھے۔ ان کی ادارت میں چند ادبی رسائل بھی شائع ہوئے تھے۔ ان کا شعری سفر برِ عظیم کی تقسیم سے پہلے ہی شروع ہو چکا تھا۔ شعر مراد آبادی کے شاگرد تھے اور مراد آباد کی اس سرزمین کا چشم و چراغ تھے جس نے جگر کے نام سے تاریخ میں اپنا حصہ پا لیا ہے۔ ان خوش قسمتوں میں میکش کا نام بھی لیا جا سکتا ہے جنہوں نے شروع دنوں میں جگر سے فیض حاصل کیا البتہ ان کی غزلوں کے اسلوب اور جذباتی رویوں پر جگر کے اثرات کم ہی محسوس ہوتے ہیں۔

کھلی کتاب کی غزلوں کو پڑھ کر واضح ہو جاتا ہے کہ مرحوم میکش زندگی پر ایقان رکھنے والوں میں تھے۔ حقیقت پسندی اور اجتماعی قدروں کا اعتبار ان کے نظریۂ شعر کی بنیاد بنے ہیں۔ ان کا مزاج غزل کا مزاج ہے۔ اظہار کی ہر تخلیقی صورت کسی نہ کسی حوالے سے ذات اور شخصیت کی تہیں کھولتی ہے۔ کھلی کتاب بھی ایک ایسے سچے پرخلوص کھرے اور دردمند انسان کو ہمارے سامنے لا کھڑا کرتی ہے جو ابھی سال بھر پہلے ہم سب کے غموں اور پریشانیوں کو بٹے خوصلے اور چاہ سے سہار کرتا تھا شاید ہی کوئی بڑا یا چھوٹا اہلِ قلم ایسا ہو جو مسعود میکش کی کتابوں والی دکان کے کمرے میں نہ بیٹھا ہو یقیناً اس کا ظاہر و باطن یکساں تھا اور اس نے سچ کہا ہے:

ایک ہے اپنا ظاہر و باطن دوستو ایک کھلی کتاب ہیں ہم

عمر کی آخری دہائی میں میکش نے جدید غزل کے اسلوب سے اپنا رشتہ بڑی کامیابی کے ساتھ جوڑا تھا مگر وقت اس عالم رنگ و بو میں اس کے بار کو سنبھال نہ سکا۔ اس کے سچے دوست خصوصاً ڈاکٹر فروغ اور حضرت وزیری پانی پتی اور شاگرد مخدوم منور نے مرحوم کے ادھر اُدھر پھیلے ہوئے کلام کو ایک جگہ جمع کر کے کتابی شکل میں شائع کر دیا اور یوں صحیح معنوں حق یاری ادا کر دیا ہے۔ (ریاض صدیقی)

میں نے یہ جانا (تنقیدی مضامین) —— جاذب قریشی

ناشر: تخلیق اکادمی، کراچی۔ قیمت بیس روپے۔ صفحات ۱۹۰۔

محمد حسین آزاد نے اردو تنقید میں عبارت آرائی اور انشا پردازی کو رواج دینے کا جو عمل کیا تھا اس پر چلنے والوں میں اب جاذب قریشی کا نام بھی شامل ہو گیا ہے کیونکہ ان کے یہاں تاثر اور انشا پردازی کے امتزاج سے عبارت، اسلوب پر کھولتا ہوا دکھائی دیتا ہے۔ ان کی نثر صورت اور سیرت کے اعتبار سے توجہ چاہتی ہے۔ اس میں سادگی و پرکاری کے ساتھ ایک شانِ دلبری بھی ہے۔ انہوں نے آج کے گرد و پیش میں رہتے ہوئے اچھی نثر لکھنے کی صلاحیت کا اظہار کیا ہے۔ ہمارے یہاں اچھے شعر پر داد دینے کا رواج تو عام ہے لیکن اچھی نثر پر داد دینے کی کوئی روایت نہیں ہے۔ یوں بھی پچھلے بیس سالوں میں جبکہ ہر طرف شاعری خود رو نباتات کی طرح در و دیوار سے اگ رہی ہے، اچھی نثر کے نمونے پیش کرنا قابل توجہ کام ہے۔ بڑے ادب اور بڑی زبان کے وقار اور بھرم کو قائم کرنے کا ذریعہ نثری سرمایہ ہوتا ہے نہ کہ شاعری۔ جاذب قریشی نے ایک اور اچھی کوشش یہ کی ہے کہ لفظوں کی جمع ہندی قواعد سے بنانے کا مظاہرہ کیا ہے۔ ان کے بیانیہ مضامین جو فکری اور فلسفیانہ مباحث کے لمس سے زیادہ مانوس نہیں ہیں اس کرب کا ردِ عمل بھی کہے جا سکتے ہیں جو ایک تجارتی، صنعتی اور جدید بین الاقوامی پیش منظر میں بنائی گئی دکھاوے کی حد بندیوں کا نتیجہ ہے۔ یہ حد بندیاں آج کل لکھنے والوں کے مراتب کا تعین کرنے میں "سبب اوّل" بنتی ہیں اور اسی لئے جی الانہ، پروین شاکر اور عالی جی کو بھی معروف ہونے کا اعزاز مل گیا ہے۔ جاذب قریشی نے بہرحال اتنا تو کیا کہ جی الانہ سے قطع نظر ان حد بندیوں کو توڑا ہے۔ مقبول نقش جیسے غزل گو جو کسی بھی حوالے سے محشر بدایونی سے کم نہیں ہیں اور دوسرے کئی غیر معروف ناموں کو موضوع بنایا ہے۔

"میں نے یہ جانا" جس حقیقت کی طرف ہماری رہنمائی کرتی ہے وہ معاصر لکھنے والوں کا انتخاب

اور پھر کھل کر ان کے بارے میں اظہارِ رائے کرتا ہے۔ اس کتاب میں اکثر معروف اور غیر معروف لکھنے والوں کی ادبی و فنی حیثیت کی مثبت سمتوں کو نمایاں کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ جاذب قریشی کا اندازِ بیان تشریحی ہے۔ اس نوع کی تنقید کی ایک مجبوری یہ ہے کہ نقاد کی آرا تعریف و تحسین کے جال میں پھنسی ہوئی نظر آتی ہیں لیکن مصلحتوں اور منصوبہ بندیوں کے اس دور میں جہاں علمی و فکری اور ادبی و ثقافتی سطح کو سیاسی اور انتظامی فیصلوں اور حکمتوں کو خونِ جگر دینے کے لئے استعمال کیا جا رہا ہے وہ برملا اپنے نقطۂ نظر کو ظاہر کرنے کا حوصلہ رکھتے ہیں جیسے "جسم و جاں کی اکائی" "انسانیت کا صورت گر" اور "قید فرہنگ کا شاعر" قابلِ توجہ مضامین ہیں جنہیں نے پڑھا نا" اردو نثر کے حوالے سے صاحبانِ نقد و نظر کی توجہ چاہتی ہے اور اسی حوالے سے ہم کتاب کے مصنف جاذب قریشی کو نثر کی قلمرو میں "خوش آمدید" کہتے ہیں۔

ریاض صدیقی

ادب اور حقیقت ——— انجم اعظمی

ناشر۔ کراچی اشاعت گھر قیمت ۲۵ روپے صفحات ۲۵۵

"ادب اور حقیقت" انجم اعظمی کے نثری مضامین کا مجموعہ ہے۔ ان مضامین کا مطالعہ ان کے یہاں تین سمتوں کی نشاندہی کرتا ہے۔ اولاً ہمارے زمانہ کے بعض نہایت اہم فکری رویوں سے بحث ثانیاً ماضی کی روایت اور تہذیبی محرکات کا عہدِ رواں کے تناظر میں مطالعہ اور ثالثاً مستقبل کے امکانات کو گرفت میں لانے کی کوشش۔ ان سمتوں کے اندر جو موضوع مشترک نظر آتا ہے وہ ہماری کائنات اور اس لامتناہی کائنات کو جہد و کشاکش اور مشاہدہ و فکر کے ذریعے تبدیل کرنے والا انسان ہے۔ اس معروضی مطالعے میں انسانی اقدار اور زمان و مکان کے رشتوں کی آہنگ کسی حد تک در آئی ہے تاہم اس زمانے کی جدید تر سائنسی فکر سے تخلیق پانے والے افکار سے ان کی عدم آشنائی کا پتا بھی دیتی ہے۔ وجدان ادب جمالیات اور ماضی کے جدید تر تصور کی جو تعبیرات و تشریحات پلینک، نیلز بوہر اور البرٹ آئن اسٹائن وغیرہ کے حوالے سے کی گئی ہیں، مصنف ان سے زیادہ آگاہ نہیں ہے۔ مختلف موضوعات سے گزرنے کے بعد احساس ہوتا ہے کہ وہ غیر منطقی تضادات میں گھرے ہوئے ہیں۔ جن مباحث میں انہوں نے بعض نتائج کو یکجا کرنے کی کوشش کی بھی ہے وہاں سند اور دلائل کا سہارا لینے کی ضرورت تھی تنقید کسی مسئلے یا قضیے میں شک اندازوں اور سنی سنائی باتوں پر بھروسہ کرنا گوارا نہیں کرتی ہے۔ لیکن انجم اعظمی "وقت خدا ہے" کے مقولے کا حوالہ

دیتے ہوئے اس کے ماخذ کی نشاندہی ہیں مشکوک نظر آتے ہیں اور تنقید میں علمی حوالوں کا مشکوک استعمال عیب ہے۔ قدیم کو مسترد کرنے اور جدید کو اپنانے میں تکلف جیسے مسئلہ پر تو محمد حسن عسکری مرحوم لکھ چکے ہیں۔ تخیل کی بحث میں ان مجموعی اصولوں ہی کا رنگ و آہنگ ہے جو ہیں اور نیگا۔ مایکلین اور وہیلی کے یہاں دکھائی دیتا ہے۔ ان مباحث کا اچھی طرح مطالعہ کرنے کے بعد نبنی سیون نے شعری وزن اور تخیل کا ایک جہانِ معنی مرتب کرنے کی کوشش کی ہے۔ ہمارے زمانے میں اسلوب اور لہجے پر بھی اظہار خیال ہوتا رہا ہے۔ الیسا ان (UL MAN) نے ان کی تفصیلات اپنی کتاب میں قلمبند کی ہیں۔ بلیوم فیلڈ نے بھی اس موضوع کا احاطہ کیا ہے۔ امریکہ میں اسی مسئلے پر ایک کانفرنس بھی ۱۹۵۸ء میں منعقد ہو چکی ہے۔ اس پس منظر میں جب ہم اس نقطۂ نظر کا مطالعہ کرتے ہیں کہ لہجہ محض شاعری میں ہوتا ہے نثر میں نہیں تو بات سمجھ میں نہیں آتی ہے اور یوں بھی انجم نے اپنے نقطۂ نظر کے لئے کوئی سند یا دلیل قلم بند نہیں کی ہے۔

"ادب و حقیقت" کے مضامین کا قابل ذکر پہلو خوبصورت اسلوب اور نرم رو داں لہجہ ہے۔ انجم اعظمی چونکہ اچھے شاعر بھی ہیں اسی لئے ان کا شعری مزاج تنقیدی بیانات میں رنگ و خوشبو کا اضافہ کرتا ہے۔ زیر تبصرہ کتاب کلاسیکی ادب کی اندر لو دریافت کے جذبے کی نشاندہی کرتی ہے جو یقیناً نہایت مفید اور قابل تعریف جذبہ ہے کلاسکس سے دلچسپی رکھنے والے صاحبانِ تحقیق نے پرانے فن پاروں کے بارے میں یوں تو خوب خوب لکھا ہے لیکن ان کے افکار اور انداز نے آج کی نسلوں کے ذہنوں میں کلاسیکی ادب کے لئے کوئی نرم گوشہ تخلیق نہیں کئے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ نئی نسلوں اور پرانوں کے درمیان اجنبیت کی دیوار کھڑی ہو گئی ہے۔ نئی نسل اپنا کلاسیکی سرمایہ چھوڑ کر مغربی فکر کی یلغار تلے دبتی چلی جا رہی ہے۔ انجم اعظمی نے ایک کلاسیکی فن پارے کا جائزہ لے کر تازہ امکانات تلاش کر کے فن پارے میں زندگی کی نئی لہر دوڑا دی ہے۔ ان کے خیالات کو پڑھ کر مثنوی زہرِ عشق کی جمالیاتی اور معنوی افادیت پر اعتبار آ جاتا ہے۔ کلاسکس کے سلسلے میں مطالعہ کا یہی اسلوب وقت کا تقاضا ہے۔

"ادب اور حقیقت" میں فن اور زبان کے رشتوں کو اصولوں کے جس نظام سے جلا ملی ہے اور حیات و کائنات کی تعبیر و تشریح کا جو نقطۂ نظر سامنے آیا ہے وہ محض مارکسی دبستان فکر کی اثر پذیری کا نتیجہ نہیں ہے بلکہ ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے مضمون نویس نے اپنی روایت اپنے تہذیبی ماضی اور جمالیاتی تناظر کو بعض مغربی نظریہ سازوں خصوصاً انگلستان میں رومانی تحریک کے زیر اثر لکھنے والوں سے ہم آہنگ

کرنے کی بھی کوشش کی ہے۔ ایسی صورت حال میں کسی ایک دبستان تنقید سے ان کی وابستگی تلاش کرنا مشکل ہو جاتا ہے۔ ——— ریاض صدیقی

"ماجرا" (شعری مجموعہ) ——— محسن بھوپالی

ناشر ایوان ادب۔ ۸ سی محمد علی ہاؤسنگ سوسائٹی کراچی قیمت ۲۵ روپے صفحات ۱۶۰

زیر نظر مجموعہ "ماجرا" اصلاً ۱۹۶۰ء سے ۱۹۸۰ء تک یعنی بیس سالوں میں کہی گئی غزلوں کا انتخاب ہے۔ آخر میں چند نظموں اور نظمانوں کو بھی شامل کر دیا گیا ہے جس کی چنداں ضرورت نہ تھی منتخب غزلوں سے تاثر کی جو اکائی بنتی ہے نظموں کی موجودگی اس پر بار محسوس ہوتی ہے محسن خبر و آگہی کے شاعر ہیں وہ ہمیں عہد بہ عہد خارجی مظاہر و واقعات کی بدنما شور اور لوگوں پر اس کے منفی اثرات سے آگاہ کرتے ہیں۔ خوابوں اور خلاؤں میں اُڑنے کے بجائے پیروں کو زمین پر جما کر انہوں نے گرد و پیش کا مطالعہ کیا ہے۔ ان کے یہاں پکارنے والا لہجہ اور اوپر کی طرف بڑھتی ہوئی لے ہے جس نے ان کے طرز ادا کو مردانہ اسلوب عطا کیا ہے۔ اس فیصل کی غزلوں میں خالص شعریت، غنائیت اور جمالیاتی تناظر کی کمی ناگزیر سی ہو جاتی ہے۔ انہوں نے اپنی شاعری کے لئے فکر و نظر کا جو پُر وقار عہد نامہ وضع کیا ہے یعنی فن کے ذریعے بھٹکی ہوئی انسانیت کو سہارا تاکہ معاشرہ کیا ہے اور اس کو کیا ہونا چاہیئے کے بارے میں سوچ سمجھ سکے۔

"ماجرا" کے اشعار دوسری تمام شعری مجموعوں کی طرح اس کی تکمیل کرتے ہیں۔ اس عزم اور انسان دوستی کا ذہنی اور علاقائی حب الوطنی کے تصور سے تصادم کوئی تعجب کی بات نہیں ہے اور لیں دیکھئے تو محسنؔ اپنے وطن کے زیادہ محسن دکھائی دیتے ہیں اور یہ کہنے کا حوصلہ رکھتے ہیں سے

کشادہ سائباں سب کے لئے ہو ——— رعایت سب اُٹھانا چاہتے ہیں۔

انہیں یہ اعزاز بھی حاصل ہے کہ ان کے شعر محاورۂ خاص و عام بنے ہیں۔ زیر تبصرہ مجموعے میں میں کچھ ایسے شعر بھی ہیں جو بیس سال کے سفر کی آخری حد پر عزائم والقان میں تذبذب کی نشاندہی کرتے ہیں اور اس طرز احساس کو جس حوصلے اور خلوص کے ساتھ محسنؔ نے اظہار کا راستہ دیا ہے، قابل داد ہے

کب تک نگاؤں سایۂ ادراک کی سبیل ——— اے آگہی کی دھوپ پگھلنے لگا ہوں میں

دعویٰ یہ تھا کہ میں ہوں بنا انقلاب کی ——— عالم یہ ہے کہ خود کو بدلنے لگا ہوں میں

ناشر نے خوبصورت کتابت اور آرائش حسن کے ساتھ عمدہ کاغذ پر نہایت اہتمام سے شائع کیا ہے۔

——— ریاض صدیقی

کتب موصولہ

اذکار و اذکار: ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی، صفحات ۲۷۰، قیمت ۳۰/-، مقتدرہ قومی زبان، کراچی۔

اردو غزل کا خارجی روپ بہروپ: خواجہ منظور حسین، صفحات ۳۰۴، قیمت ۴۴/-، مکتبہ کاروان، لاہور

بکھرے (افسانے): انتظار حسین، صفحات ۱۷۳، قیمت ۲۵/-، مطبوعات لاہور۔

ذکر اس پری وش کا (انشائیے): ڈاکٹر انور سدید، صفحات ۱۱۲، قیمت ۱۵/-، مکتبہ اردو زبان، سرگودھا

ہدف (غزلیات): صمد انصاری، صفحات ۲۰۸ قیمت ۳۰/-، التحریر، لاہور۔

حرفِ دل رس (غزلیات): شان الحق حقی، صفحات ۱۵۷، قیمت ۴۰/- اردو اکیڈمی سندھ کراچی۔

بے ارادہ (افسانے): جوگندر پال، صفحات ۲۲۹، قیمت ۲۵/-، زم زم بک ٹرسٹ، شاہدرہ دہلی۔

سورج مکھی (نظمیں): ذوالفقار احمد، صفحات ۸۰، قیمت ۱۵/-، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور۔

غزال (منتخب غزلیں): جمیل یوسف، صفحات ۲۵۶، قیمت ۴۰/-، نیرنگ خیال پبلی کیشنز، راولپنڈی

بادشاہ کا خون (ناول): ڈاکٹر آغا افتخار حسین، صفحات ۲۸۵ قیمت ۲۵/-، دانشکدہ، بکس نمبر ۱۵۲، اسلام آباد۔

پیرس کی ایک رات (ناول): ڈاکٹر آغا افتخار حسین، صفحات ۳۱۸ قیمت ۲۵/-، دانشکدہ، بکس نمبر ۱۵۲، اسلام آباد۔

فکر و فن (اصول و فنِ شاعری): انجم فوقی، صفحات ۱۳۱ قیمت ۱۰/- سر سید اکیڈمی اردو بازار، کراچی۔

گہری فکریں (فکر و فلسفہ): مقبول طارق، صفحات ۵۵۴، قیمت ۳۰/- طارق اکیڈمی سکھر۔

موسم سنگ (نظمیں غزلیں): مضطر مجاز، صفحات ۱۳۶، قیمت ۱۵/-، شگوفہ پبلی کیشنز، حیدرآباد دکن۔

فکر بر (غزلیات): علیم صبا نویدی، صفحات ۱۱۲ قیمت ۱۸/-، انجمن مصنفین اردو تملناڈو، مدراس۔

احساسِ ناتمامی (شاعری): پنہاں، صفحات ۱۱۸ قیمت ۲۰/-، وجدان اکیڈمی۔ کراچی۔

اُجلا دیار (شاعری): ضمیر اظہر، صفحات ۹۶، قیمت ۱۵/-، مکتبہ نو نمبر ۲۹ کشمیر روڈ۔ راولپنڈی۔

زینہ زینہ راکھ (شاعری): غیاث متین، صفحات ۱۲۰، قیمت ۱۰/-، حیدرآباد لٹریری فورم حیدرآباد دکن۔

نئی رُتوں کا شہر (شاعری): رؤف خلش، صفحات ۱۲۸، قیمت ۱۰/-، حیدرآباد لٹریری فورم حیدرآباد دکن۔

صدف تمام ریت ریت (شاعری): علی الدین نوید، صفحات ۱۲۰، قیمت ۱۲/-، حیدرآباد لٹریری فورم، حیدرآباد دکن۔

انتخاب (شاعری): سکندر علی وجد، صفحات ۹۷، قیمت ۱۰/-، انجمن ترقی اردو (ہند) اردو گھر، نئی دہلی۔

اختلاف (شاعری): صغیر ملال، صفحات ۲۰۶ قیمت ۲۵/-، یزدان پبلیشرز، کراچی۔

اداریہ ص ۱۶ کا بقیہ

ترجمے کئے۔ وہاں بہت سی انگریزی، فرانسیسی اور جرمن نظموں کے اردو میں بھی ترجمے کئے۔ جدید جرمن شاعر رائنر ماریا رلکے کے دسوں نوحوں کے منظوم ترجمے ایسی خوبی سے کئے کہ رلکے کی شاعری کی روح اردو زبان میں سما گئی۔ ان کے یہ سب ترجمے نیا دور ہی میں شائع ہوئے۔ انگریزی میں سر سید احمد خان پر ان کی کتاب منفرد حیثیت کی حامل ہے۔ ان کے علاوہ "شاعری اور تخیل" وہ تصنیف ہے جو اردو تنقید میں نہ صرف ایک گراں بہا اضافہ ہے بلکہ مطالعۂ شاعری کی ایک نئی راہ بھی کھولتی ہے۔ ان کی ایک اور کتاب "مغربی شعریات" بھی ایک بنیادی کتاب کا درجہ رکھتی ہے۔ مرحوم نیا دور کے مستقل لکھنے والے تھے۔ ہماری ہی فرمائش پر انہوں نے "زبان اور شاعری" کے موضوع پر ایک طویل مقالہ لکھا تھا جس کی پہلی قسط "نیا دور" میں شائع ہو چکی ہے اور دوسری قسط انشاءاللہ اگلے شمارے میں شائع ہوگی۔ مرحوم کی آخری کاوش ڈاکٹر جمیل جالبی کی فکر انگیز کتاب "پاکستانی کلچر" کا انگریزی ترجمہ تھا جسے انہوں نے وفات سے چند دن پہلے مکمل کیا تھا۔ مرحوم محنتی، کم گو اور شریف الطبع انسان تھے۔ ہمیں امید ہے کہ ان کے لائق بیٹے مرحوم کی کتابوں کی اشاعت کا جلد اہتمام کریں گے۔ ہم دعا کرتے ہیں کہ خدا ہادی حسین صاحب کی مغفرت فرمائے اور انہیں فردوس بریں میں درجات بلند عطا فرمائے۔ آمین۔

نیا دور کا یہ شمارہ پریس میں تھا کہ خبر آئی اردو کے عظیم شاعر حضرت جوش ملیح آبادی بھی ۲۲ فروری ۱۹۸۲ء کو ہم سے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے رخصت ہو گئے۔ شبیر احمد خان جوش ملیح آبادی نے بھرپور زندگی بسر کی اور اپنی شاعری سے کئی نسلوں کی آبیاری کی۔ ان کا پہلا مجموعۂ کلام "روحِ ادب" کے نام سے ۱۹۲۱ء میں شائع ہوا اور اس کے بعد کم و بیش سولہ مجموعۂ کلام اور شائع ہوئے۔ ان کے کلام کا خاصہ بڑا حصہ ابھی تک غیر مطبوعہ ہے۔ وہ ایک ایسے پُرگو اور قادر الکلام شاعر تھے جن کی انگلیاں نبضِ حیات پر تھیں اسی لئے ان کی شاعری روحِ عصر کا بھرپور اظہار ہے۔ جوش صاحب زندگی کے شاعر تھے۔ جب تک زندہ رہے اپنی شاعری سے زندگی کو حیاتِ نو دیتے رہے۔ حکومتِ ہند نے مرحوم کو ملک کا سب سے بڑا ادبی اعزاز "پدم بھوشن" دیا تھا۔ ۱۹۵۶ء میں جوش صاحب پاکستان آ گئے اور اپنی زندگی کے باقی ۲۶ سال کراچی و اسلام آباد میں بسر کئے۔ ان کی ذات کی طرح ان کی شاعری بھی جرأتِ اظہار کی حامل ہے۔ وہ اس صدی کے ایک عظیم شاعر تھے جو اپنی زندگی ہی میں [illegible]

غروب ہو چکا ہے اور اب جب کہ وہ اپنی زبانی گفتگو سے معاشرے کو ناراض بھی نہیں کرسکیں گے۔ ہمیں یقین ہے کہ ان کی شاعری کا سورج پھر طلوع ہوگا اور پھر ہم عظیم جوشؔ کو تعصبات اور رنجشوں سے دور ہٹ کر صحیح تناظر میں دیکھ سکیں گے۔ جوشؔ پہلا عظیم شاعر ہے جو سرزمین اسلام آباد میں مدفون ہو کر ہمیشہ ہمیشہ کے لیے شہرِ اسلام آباد کے وقار کو بلند کر گیا۔ خدا مرحوم کی مغفرت فرمائے اور فردوس بریں میں مقامات بلند عطا فرمائے۔ آمین۔

ابھی حضرت جوشؔ کی وفات کو دس دن بھی نہیں ہوئے تھے کہ حضرت **فراقؔ گورکھپوری** بھی ۳ مارچ ۱۹۸۲ء کو دہلی میں وفات پا گئے۔ فراقؔ صاحب ایک عظیم شاعر اور عظیم نقاد تھے جوشؔ کی طرح فراقؔ نے بھی اپنی زندگی ہی میں کلاسیک کا درجہ حاصل کر لیا تھا۔ انھوں نے اپنی ذات کو کائنات پہ پھیلا کر اور کائنات کو ذات میں اُتار کر اردو غزل کو نئی وسعتوں سے ہم کنار کیا۔ انسان ان کی فکر کا مرکز و محور تھا اور احساس جمال ان کی شاعری کا شعور تھا۔ بحیثیت نقاد ان کی تحریریں اردو تنقید میں اہم و منفرد اضافہ ہیں۔ ان کی تنقید نے نہ صرف اردو تنقید کا رُخ بدل دیا بلکہ نئی نسلوں پر بھی گہرے اثرات مرتب کئے۔ فراقؔ اس دور کی روح کی آواز تھے۔ اپنی ذات میں انجمن اور مجسم ذہانت اور فطانت تھے۔ تعصب سے پاک، آزاد خیال، مفکر اور روشن ضمیر بے باک انسان تھے۔ جب ہندوستان سے اردو کو مٹانے کی کوششیں ہو رہی تھیں فراقؔ صاحب نے اس زبان کو سہارا دیا اور بار بار کہا "اُردو کو مٹانا قتلِ عام سے بھی زیادہ سنگین جرم ہے۔ حکومت کے کئی با اقتدار وزیروں اور عہدہ داروں نے اردو کے قاتلوں کو بڑھاوا دیا ہے۔ میں پھر بھی محسوس کرتا ہوں کہ اردو مٹائی نہیں جاسکے گی۔ اس وقت مٹائی تو اردو جا رہی ہے لیکن مٹ رہی ہے ہندی اور اس صدی کے ختم ہوتے ہوتے وہ ہندی سارے ہندوستان سے مٹ جائے گی جس کی بنیاد اب سے سو برس پہلے رکھی گئی تھی۔ یہ جناتی ہندی نہ عوام کے گلے سے نیچے اُتر سکی ہے اور نہ خواص کے۔ اردو کے دشمن اچھی طرح جانتے ہیں کہ اردو ہندوستان کی سب سے بڑی زبان ہے اور سب سے زیادہ خوبصورت اور لطیف بھی۔ اردو دشمنوں کو حقیقتاً اپنے گنوار پن پر غصہ آتا ہے ......"

اس عظیم انسان، عظیم شاعر، عظیم نقاد اور محسنِ اردو کی وفات سے جو خلا پیدا ہوا ہے وہ کبھی پُر نہ ہو سکے گا۔ ایسی ہستیاں صدیوں میں کبھی کبھار پیدا ہوتی ہیں۔

نیا دور جلد ان چاروں مرحومین کے بارے میں تفصیلی مطالعے شائع کرے گا۔

کوئی انیمل ایسا نہیں
جیسا
روبیالیک
انیمل ہے
صحیح معنوں میں سفید انیمل پینٹ
جو پیلا نہیں پڑتا
روبیالیک سپر گلوس سنتھیٹک انیمل لکڑی اور لوہے کی
سطحوں کے لئے اعلیٰ پینٹ ہے، خصوصاً پیلا نہ پڑنے والا ڈیزلنگ
وہائٹ جو صحیح معنوں میں سفید ہے اور سفید ہی رہتا ہے۔
اور اپنی چمک دمک قائم رکھتا ہے۔ یہ بہترین انیمل پینٹ ہے۔
BERGER
ROBBIALAC
SUPER GLOSS
SYNTHETIC ENAMEL
برجر پینٹس ہر اعتبار سے بہترین

bubble
up
®
KISS OF LEMON
KISS OF LIME
MBL
Mehran Bottlers Ltd.
PAKISTAN MBL-81/4

ایک پنتھ۔ تین کاج
بیگان®
• فوری خاتمہ • طاقتور فلشنگ ایکشن • دیرپا اثرات
Baygon
ہر کامیابی اعلیٰ معیار پر منحصر ہے
بئیر پاکستان لمیٹڈ
BAYER
CPL-2/82
Atelier BM

ہم نے دیکھا تم نے دیکھا
دیکھ چکا جگ سارا
سب سے اچھا بیٹری سیل
تھری اسٹار ہمارا
3-STARS
3-STARS
پاکستان بیٹری
مینوفیکچرنگ کمپنی لمیٹڈ۔ ایس۔ آئی۔ ٹی۔ ای۔ کراچی

ثنا اللہ پرنٹر پبلشر نے مشہور آفسٹ پریس چندریگر روڈ کراچی سے چھپوا کر دفتر پیر الٰہی بخش کالونی کراچی ۵ سے شائع کیا

NAYA DAUR

A Widely Circulated Literary Magazine

Published by, The Pakistan Cultural Society

P. I. B. Colony, Karachi-5.